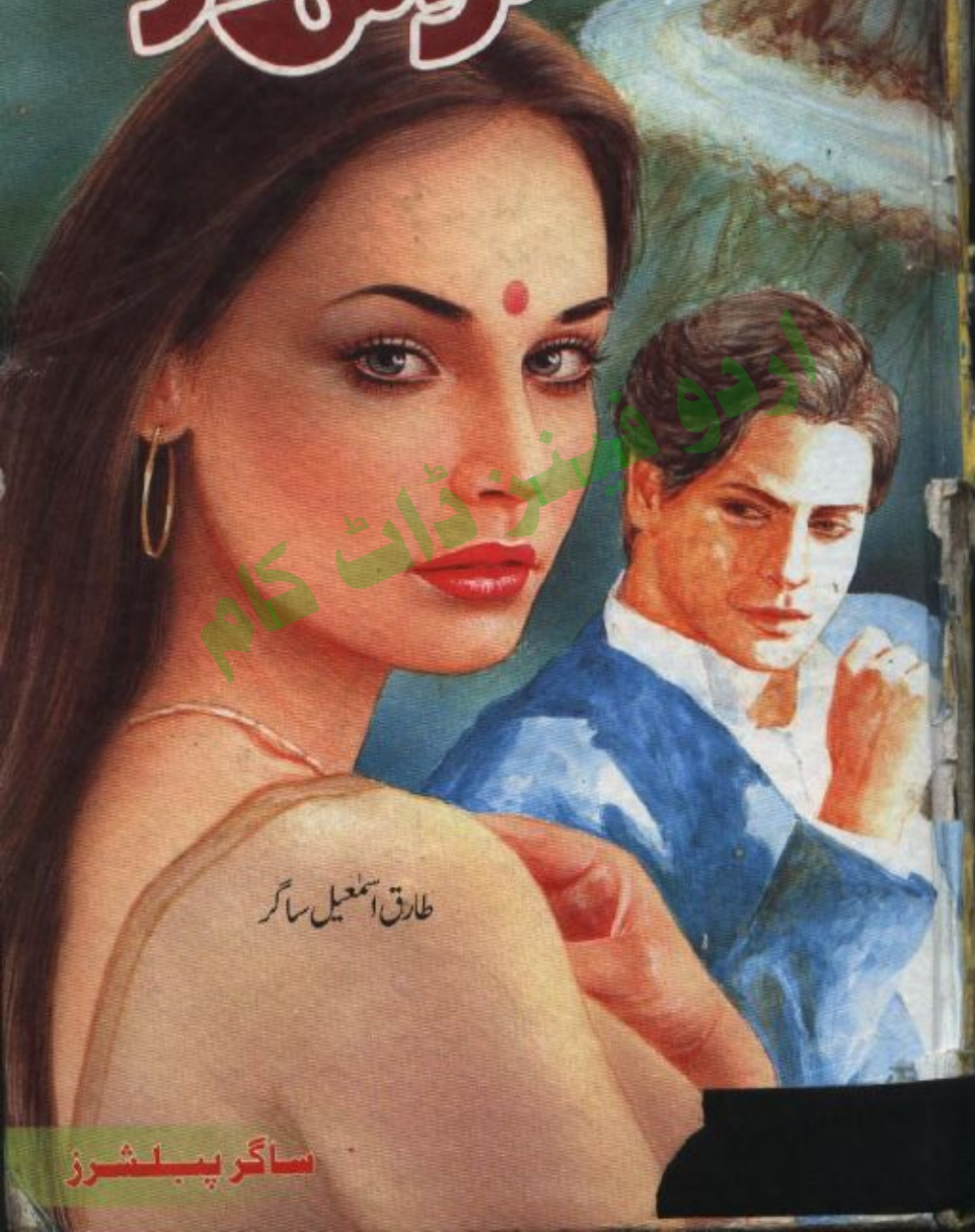


کراس فائر



طارق اسماعیل ساگر

ساگر پبلشرز

جیب جھٹکے سے رکی تو اس کی آنکھ بھی کھل گئی۔

چالیس گھنٹوں کے مسلسل سفر نے اسے تھکا ڈالا تھا اور اب تو اس نے باقاعدہ اونگھنا شروع کر دیا تھا جب کہ اس کے دونوں ساتھی گزشتہ دو گھنٹوں سے لمبی تان کر سو رہے تھے۔ طاہر کے لیے مسلسل حالت بیداری میں رہنا تو اب ممکن نہیں رہا تھا کیونکہ جیب کا ڈرائیور اور ان کا نگہبان شاید بہرے تھے یا پھر انہیں باقاعدہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے علاوہ اور کسی سے کوئی بات نہیں کریں گے۔

دو تین مرتبہ طاہر نے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر موجود اس نوجوان سے جس نے اپنا نام چکرورتی بتایا تھا بات کرنے کی کوشش کی۔

لیکن اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ چکرورتی اسے چکر دے رہا ہے۔

وہ پادری خواستہ ہی اس کے سوالات کے جوابات ہوں ہاں میں دے رہا تھا اور اسے بظاہر یہی تاثر دے رہا تھا کہ اگر وہ خاموش رہے تو دونوں کی صحت کے لیے اچھا ہے۔ طاہر نے اس بات کا اندازہ تو بہت پہلے ہی اس سے ابتدائی ملاقات پر لگا لیا تھا کہ اس نے اپنا نام غلط بتایا ہے کیونکہ وہ بنگالی نہیں لگتا تھا جب کہ چکرورتی عموماً بنگال سے تعلق رکھتے تھے۔

”ممکن ہے اس کا باپ بنگالی اور ماں پنجابی ہو۔“

بالآخر اس نے خود ہی سمجھ بھلا کر اپنے آپ سے کہا اور اس مسئلے پر سوچنا ہی بند کر دیا۔

اچانک بریک لگنے سے اس کے دونوں ساتھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور اب وہ وضاحت

طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”کچھ آرام کر لیں۔ آپ لوگ تھک گئے ہوں گے۔“

چکرورتی نے ان کی طرف گردن گھما کر بڑی شان بے نیازی سے کہا۔

”جھیک پو مہاراج۔“

سلیم نے کہا۔

ظاہر سمجھ گیا کہ اب وہ اپنے چارگت ایریا میں پہنچ چکا ہے کیونکہ راستے میں ایک جگہ اس نے سڑک کے کنارے لگے ایک سنگ میل پر ڈیرہ دونوں میں کلومیٹر پڑھ لیا تھا۔ وہ جانتا تھا اب ان کا باقی سارا سفر رات کے اندھیرے میں ہوگا کیونکہ دشمن نے انہیں بطور ایجنٹ تو قبول کر لیا تھا۔

لیکن..... بطور دہشت گرد وہ انہیں کبھی نہیں اپنا سکتے تھے۔

وہ کسی بھی مسلمان پر خواہ وہ بھارتی ہی کیوں نہ ہو اعتبار نہیں کر سکتے تھے۔ یہ ان کی تربیت تھی۔ انہیں سکھایا گیا تھا کہ مسلمان پر جب اعتبار کرو گے، دھوکا کھاؤ گے۔

اور..... وہ نسل در نسل اسی متوے کو مانتے چلے آ رہے تھے۔

جیپ تھوڑے کٹاؤ تھی۔

یہ روکی جیپ تھی جسے شاید اس مقصد کے لیے تیار کیا گیا تھا کہ وہ اپنے ایجنٹوں کو متعلقہ مقام سے وصول کر کے انہیں نارگت ایریا تک پہنچائے کیونکہ اس کے شیشوں کا رنگ بہت گہرا تھا، جن کے آ رہا بہت کم دکھائی دیتا تھا۔

وہ تو بھلا ہوا اس کے ساتھیوں کا جنہوں نے گزشتہ چالیس گھنٹے میں آٹھ دس مرتبہ جیپ کو کبھی کھانا کھانے، کبھی چائے پینے اور کبھی پیٹھاب کرنے کے بہانے کھڑی کروا کر ظاہر کو موقوفہ فراہم کیا تھا کہ وہ کبھی ہوا میں سانس لینے کے علاوہ بختر فائر ماحول کا بھی جائزہ لے سکے۔

آخری مرتبہ جب ڈرائیور نے خود پیٹھاب کرنے کے لیے جیپ کھڑی کی تو ظاہر نے وہاں سڑک کنارے نصب سنگ میل پر ڈیرہ دونوں کا نام پڑھا تھا جس سے اندازہ ہوا۔ بصورت دیگر تو انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟

○ ○ ○

انہی دنوں میں انہوں نے بڑا ٹول پروف سٹم بنایا تھا۔

تینوں بڈریورین بھارت آئے تھے۔

دہلی میں وہ پہلے سے بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچے جہاں ایک مسلمان بزرگ نے ان کا استقبال کیا اور انہیں ایک آرام دہ کمرے میں پہنچا کر ان کے لیے چائے، کھانے کا بندوبست کرنے لگا۔ اس نے ان تینوں سے کوئی سوال نہیں کیا تھا صرف ان کی شناخت ہی کافی تھی۔

اس کی طرف سے کوئی مزید سوال نہ کیے جانے کا مطلب یہ بھی تھا کہ وہ بھی اس سے کچھ دریافت نہ کریں۔

ابھی وہ بمشکل کھانا کھانے کے بعد کمرے میں سیدی کر رہے تھے جب کیپٹن چکرورتی وہاں نازل ہو گیا۔ اس نے اپنا تعارف اسی نام سے کروایا تھا۔

شاید سلیم اسے پہلے سے جانتا تھا کیونکہ وہ ان میں سب سے پرانا تھا۔ ظاہر کا دوسرا ساتھی مشتاق بھی اس کی طرح نوکر قری رکھائی دے رہا تھا یا پھر زیادہ پرانا نہیں تھا۔

”تم وہ سٹر ظاہر.....“

چکرورتی نے ان دونوں کو مصافحہ کرنے کے بعد قریباً نظر انداز کر دیا تھا اور اب براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

”یہی سر۔“

اس کے بجائے سلیم نے جواب دیا۔

چکرورتی کا مرکز کا گلاب سلیم بن گیا تھا۔

”ہمارا نیا ساتھی ہے مہاراج۔ بڑا شیر دل جوان ہے۔“

”ہوں ہوں.....“

کیپٹن چکرورتی نے سلیم کی اس بات پر صرف ایک لمبی ”ہوں“ کے ساتھ ریما کرکس دیئے۔ ”شیر جوان ہے۔ سر۔ تین قتل میں درکار ہے۔ اشتہاری ہے سر۔ سارا شہر اسے جانتا ہے۔“ اس نے پھر کہا۔

جواب میں پھر کیپٹن چکرورتی نے ”ہوں“ کہا۔

ظاہر خود ابھی تک خاموش تھا۔

وہ جانتا تھا ابھی کیپٹن چکرورتی اس کی کسی بات پر یقین نہیں کرے گا جب تک کہ اسے

عملی تجربہ نہ ہو جائے۔

”ویل کم ٹوائیڈیا۔“

چکرورتی نے اس کی طرف دیکھ کر ہلکا خرمنافتہ نسی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر چپکائی۔

”میرے خیال سے ہمیں چلنا ہوگا۔“

اس کی انگلی بات نے تینوں کو بولکا دیا کیونکہ وہ ابھی آرام کرنے کے موڈ میں تھے۔

”آل رائیٹ انجوائے یور سیلف (Enjoy Yourself)۔“

شاہد اس نے ان تینوں کا ہنسی بھانپ لیا تھا۔

”ٹھیک یوسر۔ ہم واقعی بہت تھک گئے ہیں۔ امرتسر سے یہاں تک کا سفر بڑا تھکا

دینے والا تھا۔“

اس مرتبہ طاہر نے خود ہی جواب دیا۔

وہ چاہتا تھا چکرورتی اس پر کھل جائے۔

لیکن.....

ایس ایس بی (بیمشعل سرویس بیورو) کے کیپٹن نے اتنی جتنی گولیاں نہیں گھسی تھیں۔

”ٹھیک ہے تم لوگ شام تک آرام کرو۔ رات کو اپنے دوست کو مونج میلہ بھی کروا

دینا۔ میں نے باباجی سے کہہ دیا ہے۔“

اس نے پھر سلیم کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

”باباجی“ اس بزرگ کا نام تھا جس کے مکان پر انہوں نے قیام کیا تھا۔ یہ مکان دہلی

کے ایک مسلم محلے میں تھا اور یہاں باباجی اکیسے ہی رہتے تھے۔ اب تک انہیں باباجی کے علاوہ کوئی

اور یہاں دکھائی نہیں پڑا تھا۔

بکی ایڈریس انہیں دیا گیا تھا۔

بکی نام بتایا گیا تھا۔

پہلے پہل تو طاہر قدرے حیران بھی ہوا کہ صرف ”باباجی“ کے نام سے وہ کیسے یہاں

مطلوبہ بندہ تک پہنچیں گے پھر خود ہی مطمئن بھی ہو گیا۔

اور..... یہاں پہنچنے کے بعد تو اسے یقین ہو چلا تھا کہ واقعی اس کا واسطہ بڑے

خطرناک لوگوں سے پڑا ہے۔

اب تک وہ اس تنظیم کے دو کارندوں سے مل چکا تھا جو اسے مخاطب تھے کہ ان سے گفتگو

کے لیے بھی لفظ سوچ سمجھ کر خرچ کر رہے تھے۔

اس بات کی تو اسے غرضی کہ بھارت کی یہ دہشت گرد سرکاری ایجنسی ہمیشہ ”وقتی سیف

ہاؤس“ (Safe House) بناتی ہے۔ ان کے ”را“ (RAW) کی طرح بھارت کے کسی شہر

میں مستقل سیف ہاؤس نہیں ہے۔ یہ لوگ اسے مخاطب تھے کہ اپنے ایجنٹوں کو موصول کرنے کے لیے

کوئی ٹھکانہ بناتے اور اگلے ہی روز وہاں سے رخصت ہو جاتے۔

دہلی کے اس قدیم مسلم محلے میں انہوں نے طاہر اور اس کی دونوں ساتھیوں کے

استقبال کے لیے بھی یہ عارضی ٹھکانہ حاصل کیا تھا۔

طاہر ہے مسلم علاقے میں وہ کسی مسلمان کی شناخت کے ساتھ ہی رہتے۔ اسے یقین

ہو چلا تھا کہ یہ ”باباجی“ بھی کوئی بچھی ہوئی چیز ہے اور ہرگز مسلمان نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس کے

طوراً طوراً سب مسلمانوں والے تھے۔

لیکن.....

طاہر نے جلد ہی یہ بھی جان لیا کہ ”باباجی“ ان سے بات کرنے سے احتراز ہی برت

رہے تھے۔ وہ ان کے کسی بھی سوال کا جواب عموماً ہاں ناں میں دیتا تھا۔

کسی ممکنہ شک سے بچنے کے لیے جس کا موقعہ انہیں نہ مل جائے اس نے پھر خاموشی

ہی میں مصکرت جاتی۔

شام ڈھلے تک وہ لمبی تان کر سوتے رہے۔

بیدار ہونے پر انہیں ایک مرتبہ پھر چکرورتی کی شکل دکھائی پڑی جس نے ان کے لیے

ایک فورسٹار ہوٹل میں ڈنکا بند بوسٹ کر دکھا تھا۔

کبھر سے کے ساتھ انہوں نے ڈنکیا اور اس ادھ بکے جسم والی لڑکی پر داد و تحسین کے

ڈنکرے جی بھر کے برائے ہوئے جس نے انہوں کے اس ہال میں موجود باقی کا گوشت کو قریباً نظر انداز کر

کے صرف ان کا طواف کرنا شروع کر دیا تھا۔

اکثر وہ تپتے ہوئے طاہر پر جھک جاتی اور اس کے اتنا نزدیک آ جاتی کہ طاہر کو اپنے

جسم پر اس کی سانس انگاروں کی طرح چھینے کا احساس ہوتا۔

یہ بات وہ جانتا تھا کہ یہ سب کچھ کوئی نہیں ہو رہا تھا۔

کیپٹن پکرورتی نے دراصل ایس ایس بی کے چنگل میں پھنسنے والے اس نئے شیرے

کو اپنے رواجی انداز میں ولیم کہا تھا۔

عموماً وہ اس حال سے نئے بچھیلوں کو شکار کرتے تھے۔

اس کے دونوں ساتھی بھی یقیناً اسی طرح ان کے دام تزیروں میں گرفتار ہوئے تھے۔

اور.....

اب وہ بھی اس دلدل میں اترتے جا رہا تھا۔

اس نے کیپٹن پکرورتی کو پہلے ہی ڈنر میں اس بات کا احساس دلا دیا تھا کہ شراب

شباب اس کی بہت بڑی کمزوری ہے۔

اتنی بڑی کمزوری کہ جس کی بنا پر وہ اگر چاہیں تو ظاہر کئے بغیر اس ملک میں کوئی بھی آفت اُسکے

تیار۔

رات دیر گئے وہ ہوٹل سے باہر نکلے۔

نیزدان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی کیونکہ وہ دن میں چھ سات گھنٹے مسلسل سوتے رہے

تھے۔

”کیا خیال ہے اپنے سفر کا آغاز کریں؟ رات اچھی گزر جائے گی۔“

کیپٹن پکرورتی نے باہر آتے ہوئے کہا۔

”ایس سر۔ جیسے آپ کی مرضی۔“

ظاہر نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ تم لوگ دس منٹ میں تیار ہو جاؤ۔ میں آتا ہوں۔“

اس نے تینوں کو اس ٹھکانے پر ڈراپ کیا تھا جہاں ”باباجی“ ان کے منتظر تھے۔ ابھی

تک وہ ان کے انتظار میں جاگ رہے تھے۔

تینوں کو باری باری اس نے درباریوں کی طرح جبک کر سلام کیا اور خاموشی سے اپنے

کمرے کی طرف چل دیا۔

ظاہر کو یہ باباجی کسی الف لیلی داستان کا پراسرار کردار دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کی
نشست و برخاست، چال ڈھال سب تاریخی کتابوں میں لکھے گئے کرداروں سے ملتی جلتی تھی جو
قدیم حکایات میں اب کمذرات کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ اپنے آقاؤں کی خصوصی خدمات انجام
دیا کرتے تھے۔

○ ○ ○

ٹھیک دس منٹ بعد میدوت (موت کا فرشتہ) کی طرح کیپٹن پکرورتی ان کے سامنے
موجود تھا۔

اس سرحدہ ایک بڑی جیب لے کر آیا تھا۔

تینوں نے اپنے اپنے بیک اٹھائے اور خاموشی کے ساتھ جیب نما کار میں بیٹھ گئے

جس کی کشادہ اور آرام دہ سیٹوں پر بیٹھنے کے بعد وہ اس کے غیر معمولی ہونے کے قائل ہو رہے

تھے۔ بظاہر دکھائی دینے والی اس جیب کو شاید بطور خاص طویل سفر کے لیے آراستہ کیا گیا تھا۔

اگلی سیٹ پر پکرورتی ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔

تینوں نے اس کے پیچھے جگہ سنبھال لی۔ تینوں ہی تین الگ الگ سیٹوں پر بیٹھے تھے۔

ظاہر اور سلیم آپس میں قدرے بے تکلف تھے جب کہ ان کا تیسرا ساتھی جس کی

ملاقات ان سے بالکل آخری لمحات میں روانگی کے وقت ہوئی تھی زیادہ وقت خاموش رہ کر ہی

گزارتا تھا۔ اس نے اپنا نام مشتاق بتایا تھا۔

لیکن.....

اس کے چہرے پر ایک ہی نظر ڈالنے سے اس کی بے رحمی کا اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ اس کا

تعلق ملک کے کسی دوسرے شہر سے تھا جس سے متعلق نہ تو اس نے انہیں بتایا تھا اور نہ ہی دونوں

نے جاننے میں دلچسپی ظاہر کی تھی۔

یہاں کسی سے متعلق کوئی بھی جستجو یا بخش رکھنے کا سیدھا مطلب اپنی موت کو دعوت دینا

تھا۔

ان کے ایسے کسی بھی عمل کا مطلب ان کا ذہل کر اس ہوتا لیا جاتا تھا اور یہاں کسی پر

معمولی شبکی کم از کم سزا موت تھی۔

دہلی سے غازی آباد اور میرٹھ پہنچ کر کینٹن پکرورتی نے انہیں ایک سڑک کنارے بنے ہوئے ہوٹل سے چائے پلائی۔ تینوں اب تک اونگھتے آرہے تھے۔

لیکن.....

چائے کا الٹا اثر ہوا۔

کم از کم طاہر تو کبھی محسوس کر رہا تھا۔

اس کی دانت میں اس کے دونوں ساتھیوں کو چوسک ہوتا چاہیے تھا جب کہ دونوں تھوڑی دیر بعد لمبی تان کر سو گئے۔ انہوں نے دو الگ الگ سیٹیں سنبھال لی تھیں جن پر سست سست کر خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔

طاہر کی یہ کمزوری تھی کہ اسے دوران سفر خند نہیں آتی تھی۔ اس کے نزدیک یہ کمزوری تھی جب کہ اس کے دوسرے ساتھی اس پر رشک کیا کرتے تھے۔

میرٹھ بجنور دار مظفر گڑھ گزرتے ہوئے دو شام ڈھلنے پر پوچھ بچھ گئے۔ اگلا پڑا وہاں پڑا۔

شہر کے باہر ہی ٹھکڑیلوے کے ایک شاندار ڈاک بنگلے میں وہ مقیم تھے۔ اس ڈاک بنگلے میں حیرت انگیز طور پر ان کے علاوہ اور کوئی قیام پذیر نہیں تھا۔

طاہر کے لیے بھارت یا تو کوئی نئی بات نہیں تھی۔

اس نے بھارت کے مختلف شہروں میں موجود سرکاری ڈاک بنگلوں پر قیام کیا تھا لیکن یہاں کوئی کمزور حاصل کرنا خصوصاً اس طرح کے شاندار ریست ہاؤس کی جگہ حاصل کرنا کاردار ہوتا تھا کیونکہ عموماً ایسے بنگلے مختلف سرکاری افسران کی عشرت گاہیں بنے ہوئے تھے جہاں وہ رنگ رلیاں مانتے رہتے تھے یا پھر ان پر انہی افسران کے جیتے قابض رہتے تھے۔

دو بند شہر کی مذہبی حیثیت ساری دنیا میں جانی مانی ہوئی تھی۔ یہاں کے عظیم الشان مدرسے میں تو دنیا بھر سے لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔

لیکن.....

یہ ڈاک بنگلہ خالی تھا۔

صاف ظاہر ہے کہ اسے آج کی رات بطور خاص خالی کروایا گیا ہوگا اور محض ایک رات

کے لیے ایس ایس ٹی نے اس بنگلے کو اپنے سیف ہاؤس میں تبدیل کر لیا تھا۔

کینٹن پکرورتی نے کمال ہوشیاری سے ایک لمبے کے لیے بھی انہیں اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ دہلی سے یہاں تک کوئی ایک جگہ بھی ان کے لیے مخصوص تھی۔

وہ اس ڈاک بنگلے میں بظاہر بھارت کے عام ناگزیر (شہریوں) کی طرح قیام پذیر تھے۔ رات انہوں نے یہاں گزاری۔

صبح دیر کے تک سب لمبی تان کر سوتے رہے۔ البتہ طاہر جو عادت کے مطابق علی الصبح بیدار ہو گیا تھا ابھی تک اس نے جان بوجھ کر گرت نہیں لی تھی اور دوسرے کمرے سے اٹھنے والی معمولی آوازوں سے اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ کینٹن پکرورتی بیدار ہو چکا ہے۔

اب اسے کمرے سے باہر نکلنے قدموں کی چاپ بھی سنائی دے رہی تھی۔

طاہر دم سادھے لینا رہا۔ پھر ڈبے پاؤں اپنے بستر سے اٹھا اور اب وہ لمبی کی طرح بچوں پر چلتا کھڑکی کے ساتھ لٹکے پرے کے نزدیک آ گیا تھا۔

بڑے تجسس سے اس نے پردہ تھوڑا سا سرکا یا اور شیشے میں سے باہر موجود لان میں کینٹن پکرورتی کو ورزش کرتے دیکھنے لگا۔

طاہر خود ہارشل آؤٹس کا ماہر تھا۔

تین مختلف سائٹز میں وہ کمرانے کے اعلیٰ ترین اعزاز حاصل کر چکا تھا۔ وہ اس فن کی باریکیوں سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ اس کے بے پناہ جسمانی اور فنی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے اسے اس جہنم میں ہادل خواستہ جھونکا گیا تھا۔

کینٹن پکرورتی کی جسمانی پھرتی اور لپک چمپک پر وہ دل ہی دل میں اسے داد دے بغیر نہ رہ سکا۔

اس کا دل بے اختیار چاہا کہ وہ بھی باہر جا کر اپنا جسم سیدھا کرے۔

لیکن.....

وہ رک گیا۔

○ ○ ○

تھوڑی دیر بعد لان کے دروازے پر دستک ہوئی۔ طاہر نے خود اٹھ کر دروازہ کھولا تھا۔

”چند منٹ بعد ناشتہ تیار ہوگا۔ کٹ اپ.....“

اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی کینٹین پکرورتی نے فوجی افسروں کی طرح اسے حکم سنایا

اور.....

اس کی کوئی بات سننے بغیر جس طرح آندھی کی طرح آیا تھا، طوفان کی طرح واپس پلٹ گیا۔ طاہر نے ایک لمحہ توقف کیے بغیر سلیم کے جسم پر پڑا کپڑا کر ایک طرف پھینکا تو وہ بڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔

طاہر نے کینٹین پکرورتی کا حکم اس کو منتقل کیا۔

اور.....

خود غسل خانے میں جا گھسا۔

مشاق کے حساس کانوں تک جیسے ہی یہ آواز پہنچی وہ بھی کھلی کی سی پھرتی سے اٹھا اور دوسرے غسل خانے میں جا گھسا جب کہ سلیم نے دوسرے کمرے سے منسلک غسل خانے کا رخ کیا۔

اگلے چند منٹ بعد وہ تینوں ناشتے کی میز پر موجود تھے۔

○ ○ ○

میز کے دوسرے کونے پر کینٹین پکرورتی ہالی ڈو کی قلموں میں پیش کئے جانے والے گناپو کے کسی کردار کی طرح ان کی طرف گھور رہا تھا۔

بیرے نے ان کے سامنے انواع و اقسام کے کھانے چن دیے اور تینوں نے ناشتے کے ساتھ مکمل انصاف کیا۔

”دس منٹ بعد ہم روانہ ہو جائیں گے۔“

ناشتے کے خاتمے پر کینٹین پکرورتی نے اگلا حکم جاری کر دیا۔

اور.....

ٹھیک دس منٹ بعد ایک مرتبہ پھر اس آرام دہ جیب میں وہ عازم سفر تھے۔ اس مرتبہ طاہر نے بطور خاص جو باتیں نوٹ کی تھیں، ایک توجیب کی نمبر پلیٹ تبدیل ہو گئی تھی اور دوسرے اس کا ڈرائیور۔

پہلا ڈرائیور بدیع بند میں ہی رہ گیا تھا۔

اس کے باقی دونوں ساتھیوں نے شاید ان باتوں کا نوٹس نہیں لیا تھا یا پھر انہوں نے اس کا اظہار مناسب نہیں جانتا تھا۔

تینوں دم سادھے لیٹے رہے۔

خصوصی ہدایت کے تحت یہاں سلیم اور طاہر بھی خاصے ریز رو دکھائی دے رہے تھے اور ابھی تک انہوں نے مشتاق پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی تھی کہ وہ اس سے زیادہ بے تکلف ہیں۔

اب وہ عازم ”بنواری“ تھے۔

ابھی تک گو کہ انہیں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ انہیں کہاں لے جایا جا رہا ہے۔

لین.....

طاہر جانتا تھا وہ بنواری جا رہے ہیں۔

ڈیڑھ دوں کے نزدیک ایک کھجے جنگل میں واقع ”بنواری“ نام کے اس کپ کو ایس ایس بی بریگیڈ زیر ملہیترائی کمانڈ میں چلا رہی تھی۔

اس کپ سے تین ماوی خت تربیت پا کر فارغ ہونے والے دہشت گرد بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیوں کا بہترین اثاثہ بن جایا کرتے تھے۔

جدید ترین طریق ہائے تخریب کاری سے آگاہ یہ دہشت گرد انسانی شکل میں درندوں کا روپ دھار لیتے تھے۔

انہیں ایک ہی بات بتائی اور سمجھائی جاتی تھی کہ اپنے راستے میں آنے والی ہر شے کو روندتے ہوئے نکل جاؤ۔

بے رحمی ان کی سرشت بنادی جاتی تھی۔

سبکی وجہ تھی کہ اپنے ہی ہم مذہبوں، ہم وطنوں کی جان لیتے ہوئے انہیں رحم نہیں آتا تھا۔ وہ بچوں، بوڑھوں، عورتوں، جوانوں کو بے رحمی سے مار مار کر ہلاک کرتے تھے۔

قتل و عارت گری ان کی عادت بن چکی تھی۔

خون ہر سا کراہنگ لگا کر دھماکے سے پرنچنے اڑا کر وہ خود کو ہر کون محسوس کرنے لگتے

تھے۔ انہیں ہرگز جی کارروائی پر ان کی توقع سے بڑھ کر انعام و اکرام سے نوازا جاتا تھا۔ یہ انعام و اکرام صرف دولت کی صورت میں نہیں بلکہ شراب و شاپ کی صورت میں انہیں دیا جاتا تھا۔ ان وحشیوں نے اپنے ہی ملکوں کو بادشاہی کا گہوارہ بنا رکھا تھا۔

اور.....

یہ سب کچھ انہیں ایس ایس بی پڑھاتی تھی۔

ان کی محرومیوں کو ایک پلاٹ ٹکڑے..... ان کی مصیبت کو دردنگی میں تبدیل کر کے..... ان کو رُز و زن اور نشے کی لذت میں مبتلا کر کے.....

بھارتی اٹلی جنس کے سورتے انہیں ان ہی کے ملکوں میں چلنے پھرتے قائم ہم بنا کر پھینک دیا کرتے تھے جنہیں اقتدار کی ہوا سی تھی۔

محض ان کمزور ملکوں کو اپنے اشاروں پر ٹاپنے کے لیے مجبور کرنے کو..... محض ان جھوٹے اور تار سار ممالک کے عوام کی بے بسی کا تماشا دیکھ کر اپنی حس حیوانیت کو تسکین دینے کے لیے..... چاکلیہ کے چپلے چائے یہ گھٹاؤ نے کھیل رچا رہے تھے۔

○ ○ ○

دیوبند سے ان کے سفر کا آغاز ہوا۔ جیپ رڑکی اور سہارنپور کی سڑکوں پر دھول اڑاتی بالاخر شام ڈھلے ڈیرہ دون پہنچ گئی تھی۔

اس دوران راستے میں وہ تین چار مرتبہ رکے تھے جہاں انہوں نے کھانا کھایا اور چائے پی تھی۔

کچین پکرورتی بھی ان کی طرح سگریٹ نوش نہیں تھا البتہ مشتاق سگریٹ پی رہا تھا۔ لیکن ایک مرتبہ جب پکرورتی نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا تو اس نے جیپ کے اندر دوبارہ سگریٹ سلگنے کی جرأت نہیں کی تھی۔

دوران سفر سڑک کے دونوں کنارے انسان کا اڑدھا بہہ رہا تھا۔

طاہر سے بھارت کا یہ اہم ترین صوبہ۔ پی۔ ایچ جی نہیں تھا وہ ڈیرہ دون تو کبھی نہیں گیا تھا البتہ ایک مشن کے سلسلے میں اس نے مسوری میں ضرور قیام کیا تھا۔

سڑک کے گرد بے کھیتوں کھلیاؤں اور دیہاتوں کے تنگ دھڑنگ بچے اور بدقوق

چروں والے کسانوں پر اسے بہت رحم آیا تھا۔

اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اتنی غربت اور بے بسی کے ساتھ یہ لوگ کس طرح جی رہے ہیں۔ زندگی کی گاڑی کیسے ٹھیکٹ رہے ہیں۔

جہاں کہیں ان کی جیپ رکتی، عورتیں مرد اس امید پر اس کے قریب سے گزرنے کی کوشش کرتے کہ شاید انہیں کچھ بھیک مل جائے۔

راستے میں مختلف پڑاؤ کرتے ہلا خروہ ڈیرہ دون پہنچ گئے تھے جہاں انہیں اب رات ڈھلنے کا انتظار کرنا تھا۔

شام کا گلابا اندھیرا کچھ کم سمت سے سفر کرتا اس ریٹ ہاؤس کے گرد نیم دائرے کی صورت میں کھڑے شاہ بلوط کے درختوں پر بسیرا کر رہا تھا۔ یہ بھی کوئی سرکاری ریٹ ہاؤس تھا جس کے باہر کوئی پور ڈبھی ایسا نہیں لگا تھا جسے پڑھ کر وہ اندازہ کر سکتے کہ اس کا تعلق کس گھلے ہے۔

”میرے خیال سے شام کا کھانا کھانے کے بعد یہاں سے چلتے ہیں۔“

پکرورتی نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

”راہیٹ سر۔“

مشتاق نے بھی اب گفتگو میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔

”سامان گاڑی میں رہے دو۔ ڈرائیو فریش ہو جائیں۔“

اگلا حکم ملا۔

تینوں اس کے ساتھ ہی باہر نکل آئے اور اب وہ سب پکرورتی کی کمان میں ریٹ ہاؤس کی طرف جا رہے تھے جس کے دروازے پر ایک شخص پہلے ہی سے ان کا منتظر تھا۔

کھانا کھاتے انہیں رات ہو گئی تھی۔

”چلو بھئی..... اب چلتا جاویں۔ زیادہ دیر ہی نہ ہو جائے۔“

پکرورتی نے معمول کے مطابق ان کی طرف دیکھے بغیر اگلا حکم سنا دیا۔

”اوکے“

سلیم نے کہا۔

اور.....

تینوں ایک مرتبہ پھر عازم سفر تھے۔

اگلے آدھ گھنٹہ کے بعد وہ ایک پہاڑی راستے پر گھوم رہے تھے جہاں دور دور تک کسی

ذی لہس کا نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

صرف گاڑی کی ہیڈ لائٹس سے ہی سامنے کا منظر قدرے واضح ہوتا تھا۔ اور تا حدنگاہ

سڑک کے دونوں اطراف گھنے درختوں اور جھاڑیوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سڑک پر

بھی وہ ایک مخصوص فاصلے تک ہی دیکھ سکتے تھے۔

o o o

ڈرائیور جیب کو بڑی ہوشیاری سے گھما رہا تھا۔ اچانک ہی وہ ایک گیٹ کے سامنے

رک گئے۔ یہ گیٹ اس طرح اچانک سامنے آیا تھا جیسے کسی نے چادو سے اسے ان کے سامنے

سڑک پر گاڑ دیا ہو۔ گیٹ کے باہر ایک بیرک نما کمرے میں مدھم سی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

اس اندھیرے جنگل میں یہاں شاید دن کے اوقات میں بھی ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دیتا ہو۔ انہوں

نے رات کے اس پہر معمولی روشنی کا بھی تکلف نہیں کیا تھا۔

بیرک کے دروازے کے باہر البتہ ایک زرو بلب لگ رہا تھا جس کی روشنی میں سوائے

بیرک کے اس دروازے کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ رات کے اس پہر گھنے درختوں سے

لپٹے کیڑے مکوڑوں کے لڑنے کی آوازیں بھی خاموش تھیں۔

رات کا محرقہ تھاپا پھر ماحول کی پراسراریت جس نے تینوں پر چند لمحوں کے لیے پیسے

سکتے ہی طاری کر دیا تھا۔

جیب اس طرح کھڑی تھی۔ کہ انہیں سامنے سوائے بیرک کے اور کچھ دکھائی نہیں دے

سکتا تھا۔

”تم ابھی بیٹو“

چکرورتی نے ایک فقرہ کہہ کر ماحول کے سکوت کو توڑا اور ان کو سکتے کی کیفیت سے باہر

دوسرا باب

نکالا۔

تینوں نے محرزہ معمول کی طرح اثبات میں گردن ہلا کر اس کے فیصلے پر صاف دیا۔
چکرورتی جیپ سے نیچے اتر گیا۔

ڈرائیور اپنی سیٹ پر ہی چوکس بیٹھا رہا۔

حیرت کی بات تو یہ تھی کہ جیپ رکنے پر بھی کسی نے ہیرک سے باہر آنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

کپٹن چکرورتی ان کے سامنے سے گھوم کر ہیرک کے دروازے تک پہنچا تو مگر یہ دروازے میں حرکت ہوئی اور وہ کسی جادوئی عمل سے کھل گیا۔

دروازے کھولنے والے کی شکل ابھی بھی انہیں دکھائی نہیں دی تھی۔ چکرورتی اندر چلا گیا اور دروازہ اسی طرح بند ہو گیا۔

شاید یہ دروازے کسی میکانزم سے کنٹرول ہو رہے ہوں۔

ابھی تک انہیں کوئی پھرے دار بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔

لیکن.....

وہ سب محسوس کر سکتے تھے کہ ان کی معمولی سی حرکت پر بھی نظر رکھی جا رہی ہے۔

انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے کسی خفیہ کمرے سے ان کی مکمل مانیٹرنگ کی جا رہی ہے۔

ماحول کے اسی اسرار کو توڑنے کے لیے ہی شاید مشتاق نے سگریٹ سلاٹیا تھا اور لائٹس سے بلند ہوتے ہوئے شعلے نے چند سیکنڈ کے لئے جیپ کے اندر کے ماحول کو ضرور واضح کر دیا تھا۔

ظاہر نے دیکھا اس کے دونوں ساتھی بہت سنجیدہ تھے۔

”میں تو پا رہا تھا کہ کیا ہوں۔“

”اور میں بھی..... تمہارا کیا حال ہے؟“

سلیم نے جان بوجھ کر مشتاق کو بھی اسی گفتگو میں شامل کرنے کے لیے اس کی طرف

دیکھا تھا۔

”ہمیں بھی نیند آ رہی ہے۔“

مشتاق نے بظاہر جمائی بھی لی تھی۔

ڈرائیور نے ان کی طرف دیکھنے کا حلف بھی نہیں کیا تھا۔

اچانک انہیں پہلے کی طرح دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی اور تینوں چوکنے ہو گئے۔

کھڑکی کی طرف بیٹھے ظاہر نے جان بوجھ کر ششے کو گرا لیا تھا۔ یہی عمل سلیم نے بھی دہرایا۔

دوسرے ہی لمحے انہیں بلب کی زرد روشنی میں کپٹن چکرورتی دکھائی دیا جو ان کی طرف آ رہا تھا۔

دروازہ اس کے تعاقب میں بھر بند ہو گیا تھا۔

”چلو.....“

چکرورتی نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر ان کی طرف دیکھے بغیر ڈرائیور سے کہا۔

انجین سٹارٹ ہونے کی آواز نے انہیں ماحول میں زندگی سراپت ہو جانے کا احساس

دلا دیا۔

اور.....

جیپ ریٹکٹی ہوئی لوہے کے اس آہنی دروازے کی طرف بڑھی جو انہیں جیپ کی ہیڈ

لائٹس کی روشنی میں دکھائی دے رہا تھا۔

جیسے ہی جیپ وہاں پہنچی دروازہ اپنی جگہ سے سرک گیا۔

شاید یہ دروازہ بھی الیکٹریک کنٹرول تھا کیونکہ ان کے اندر داخل ہوتے ہی دوبارہ اپنی

اصلی حالت پر واپس آ گیا۔

اب وہ ایک سڑک پر چل رہے تھے جس کے دونوں طرف میدان اور میدان کے کونے

میں اندھیرے میں ڈھیلی عمارت زرد بلبوں کی پیاد روشنی میں جمائی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

ایسی ہی ایک عمارت کے سامنے جیپ رک گئی۔

”سامان اٹھا لو..... اور نیچے آ جاؤ۔“

کپٹن چکرورتی نے کہا۔

تینوں اپنے اپنے سامان سمیت اس کے تعاقب میں چل رہے تھے جب اچانک ہی

ان کے چہرہ طبع روشن ہو گئے۔

سامنے شب خوابی کے مختصر لباس میں ایک لڑکی ان کے لیے دیوہ دول فرش راہ کئے

تینوں خامسے تھکے ہوئے تھے۔ جو کپڑے انہوں نے پہن رکھے تھے ان کپڑوں سمیت عیوہ اپنے اپنے بستر پر گر پڑے۔

اور

صبح تک گہری نیند سوتے رہے۔

ظاہر البتہ معمول کے مطابق صبح فجر کی نماز سے پہلے ہی جاگ گیا تھا۔ اسے نہانے کیوں اس وقت وہ سب کچھ یاد آنے لگا تھا۔

○ ○ ○

”اب یہ تاغزیر ہو چکا ہے۔ ناقابل برداشت“

اس روز جب وہ کمرل صاحب کے ساتھ ایک سرحدی ریٹ ہاؤس میں بیٹھا تھا تو انہوں نے وہاں پر موصول ہونے والی اطلاع کے بعد قہرے انخوس اور غصے کے لہجے میں بڑی آہستگی سے کہا۔

ظاہر خاموش رہا کیونکہ اس سے کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ وہ اپنا شبنم کھل کر کے آج ہی واپس آیا تھا اور رات ایک سرحدی پوسٹ پر بسر کرنے کے بعد صبح سویرے یہاں پہنچا دیا گیا تھا جہاں کرنل صاحب جب سابق اس کے استہلال کے لیے موجود تھے۔

دو تین منٹ تک وہ خاموشی سے کمرے میں بیٹھتے ہوئے مگر بے فکری کرتے رہے۔
ظاہر ان کی اس عادت سے اب تک واقف ہو چکا تھا کہ جب بھی کرل صاحب نے
کسی فیصلے پر پہنچنا ہوتا وہ اسی طرح اندھ کمر گھومتے کھسکتے رہتے تھے۔
جس کے بعد کسی فیصلے پر پہنچ کر پر سکون ہو کر بیٹھ جاتے۔

ظاہر نے محسوس کیا تھا، عام حالات میں کرنل صاحب سگریٹ نوشی بہت کم کیا کرتے تھے لیکن ایسی صورت میں مسلسل سگریٹ سلائے رکھتے۔

انہوں نے اس مرتبہ طاہر سے کچھ نہیں کہا تھا۔

اب وہ بالکل نارمل تھے اور اس سے معمول کی باتیں کر رہے تھے۔ اس کے مٹن سے متعلق تفصیلات طلب کر رہے تھے۔

”میرے خیال سے اب تم ایک ماہ مکمل آرام کرو کیونکہ اس مرتبہ کام زیادہ اہم اور

کمری تھی۔

”وہیں کم.....“

اس نے جان لیوا مسکراہٹ ان کی طرف اچھالی۔

”او کے گڈ پائی۔“

اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی کیپٹن چکرورتی نے کہا اور واپس گھوم گیا۔

تینوں کے اعصاب پر بجلیاں مگراتی اس لڑکی نے ان کی رہنمائی ایک کمرے تک کی جو آج ان کی خواگاہ بننے والا تھا جہاں تین بستر سلیپے سے سجے ہوئے تھے۔

”میرا نام کامنی ہے۔ کامنی اگر وال۔ میں یہاں آپ لوگوں کی خدمت کے لیے رکھی گئی ہوں۔ آپ کے کمرے میں یہ پیش بین دہانے سے فوراً حاضر ہو جاؤں گی۔“

اس نے حیرت زدہ ہوئے پنجپنوں پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر ان کی قیمت کا اندازہ لگاتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔ سامنے لگے ایک بن بن کی طرف اشارہ بھی کر دیا تھا۔ بات کرنے کا اندازہ خاصہ بے تکلفانہ تھا۔

”میرا نام ظاہر ہے۔ یہ سلیم اور یہ مشتاق“

ظاہر نے مناسب جانا کہ اپنا تعارف بھی کروا ہی دے۔

”شکریہ۔ لیکن یہاں ہم ایک دوسرے کو اپنا نام نہیں بتاتے جب تک کہ اس کی اجازت نہ ہو۔ ابھی آپ نئے ہیں۔ کل آپ کو یہاں کے رولز اینڈ ریگولیشنز کا علم ہو جائے گا۔“

اس نے عجیب سی بات کہہ کر طاہر کو گڑبڑا کر رکھ دیا تھا۔

حاکم کے حجرے کا رنگ ایک لمحے کے لئے بدلا پھر وہ تار مل ہو گیا۔

شاید اس وقت تک کوکامنی نے محسوس کر لیا تھا۔

”میری بات کا ہر امت ماننا پلیز“ کیونکہ مجھے آپ کو خوش رکھنے کے لیے ہی یہاں پر رکھا گیا

اس نے بے تکلفی سے آگے بڑھ کر طاہر کا کندھا چھتیا یا۔
انہیں کرے کے استعمال اور صبح کے ناشتے کے متعلق آگاہی دینے کے بعد وہ کینروں

قدرے مشکل بھی ہوگا۔

ہلا خراہوں نے کہہ دیا۔

طاہر سمجھ نہ سکا کیونکہ اصولاً اسے چند روز بعد واپس چلے جانا تھا۔ ابھی اس کا مشن نامکمل تھا اور اس کا ایک ہی حصہ مکمل ہوا تھا۔

لیکن.....

وہ کوئی سوال پوچھنے کا حجاز نہیں تھا۔

اس پرنس کا پہلا اور حتمی اصول یہی تھا کہ یہاں احکامات پر عمل کیا جائے اور اس حد تک ہی تفصیلات طلب کی جائیں جس حد تک ضروری ہوں یا پھر متعلقہ پاس جس حد تک بتانا ضروری سمجھے۔

کرمل صاحب نے اس سے چند روز بعد ملاقات کرنے کے لئے کہا تھا۔

اور.....

یہ چند روز اگلے دس روز پر پھیل گئے۔ گیارہویں روز اسے کرمل صاحب کی طرف سے ملاقات کا پیغام ملا تو وہ قدرے مطمئن ہوا۔ ابھی تک اس کا تجسس قائم تھا۔

○ ○ ○

کرمل صاحب سے اس کی اگلی ملاقات بڑی ہنگامہ خیز تھی۔

ان کے ساتھ دو اور سینئر افسران تھے جنہوں نے اسے ایس ایس بی سے متعلق بریفنگ دی اور تمام تفصیلات سے آگاہ کیا۔

”پیشکش سرور بیورو بھارتی اٹلی جنس ایجنسیوں میں اپنی نوعیت اور ہیئت کے اعتبار سے سب سے زیادہ خطرناک اور تباہ کن ایجنسی ہے جس کا قیام صرف اور صرف پاکستان میں چاہی پھیلائے کے لئے عمل میں لایا گیا ہے۔ پاکستانی سرحد سے کچھ ہی فاصلے پر یہ لوگ موجود رہتے ہیں۔ اور ہر لمحہ چاہی کے کسی نہ کسی منصوبے پر عمل پیرا ہے۔ یہ گہرا اور پھیلنے والے جوانوں کو اپنے دامن زدہ میں پھنساتے اور پھر انہیں تباہ کاری کی تربیت دے کر ہمارے ہاں بربادی پھیلانے کے لئے لالچ کر دیتے ہیں۔ ایک سینئر افسر دیوار پر لگے ایک نقشے پر مختلف جگہ چھری رکھ کر نشانہ ہی کرتے ہوئے بتا رہا تھا۔ اس نے اس نقشے پر ایس ایس بی کے مختلف تربیتی کیمپس ان کے طریق کار ان

کی قوت اور ان کے طریقہ واردات سے متعلق تفصیلات بتائیں۔

”یہ لوگ بھارتی اٹلی ایجنسیوں کی کریم ہوتے ہیں۔ اپنے اپنے شعبے میں ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ عموماً ان کا انتخاب بھارتی ایس ایس بی ”پیشکش سرور بیورو“ کمانڈر میں سے کیا جاتا ہے اور یہ تجزیہ کاری کے نہ صرف ماہر ہوتے ہیں بلکہ اپنے فن میں اختراع کرتے رہتے ہیں۔ لیکن وجہ ہے کہ وہ ہر دفعہ نئے ہتھکنڈوں اور ہتھیاروں کے ساتھ حملہ آور ہوتے ہیں۔ ہم ابھی ان کی سابقہ طریقہ واردات کا توڑ تلاش کر رہے ہوتے ہیں۔ اور وہ کوئی نئی تباہ کاری کی تکنیک اپناتے ہیں۔“

اس نے چند لمحوں کے لئے رک کر مسگریٹ سلاہیا پھر سامنے دیوار پر لگے نقشے پر اپنی چھری کی نوک ایک جگہ رکھ کر ظاہر سے مخاطب ہوا۔

”یہ ہے ڈیرہ دون..... بھارتی فوجی افسران کی تربیت کا مشہور زمانہ سینٹر ہر سٹ کالج بھی یہاں موجود ہے۔ یہ راستہ جو قدرے پہاڑی اور جنگلات سے ڈھکا ہے۔ بٹواری کی طرف جاتا ہے۔ ڈیرہ دون سے مسوری کی طرف جانے والی سڑک پر یہ کیمپ آتا ہے۔ اس سے کچھ فاصلے پر ”پیکرا تانکپ“ موجود ہے۔ بٹواری کیمپ ڈیرہ دون کے شمال میں ہے۔ بٹواری اور پیکرا تانکے درمیان میں مشکل دس بارہ کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ بٹواری کیمپ حال ہی میں بنایا گیا ہے جسے ایک بریگیڈیئر ملہوڑا چلا رہا ہے جس کی مدد کے لیے بھارتی کمانڈر کی دو کنبیاں موجود ہیں۔ بریگیڈیئر ملہوڑا کو ”را“ کا خصوصی تعاون حاصل ہے۔ بھارتی فوج کے بہترین افسر کٹر جوائے فن پر عبور رکھتے ہیں اس کی ٹیم میں شامل ہیں۔ یہاں خالصتاً تباہ کاری کی تربیت دی جاتی ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہاں دہشت گردی کا ایک آرٹ کی طرح پڑھایا اور سکھایا جاتا ہے۔ یہاں دہش ایجنٹ لائے جاتے ہیں جو اپنی دہشت کی انتہا کو چھو رہے ہوں جن میں انسانیت نام کی کوئی چیز باقی نہ رہی ہوگی۔ تم اسے ”روشن اکھاڑہ“ بھی کہہ سکتے ہو۔ یہاں کے افسر کٹر جان بوجھ کر ایسے مواقع پیدا کرتے ہیں کہ دو ایجنٹوں کو جو وہاں زیر تربیت ہوں آپس میں دھشاندہ جنگ پر آمادہ کریں۔ ان میں سے ایک عموماً اپنی کوئی نہ کوئی بڑی تروا لیتا ہے۔“

اس نے براہ راست ظاہر کی آنکھوں میں ہانکا ”پھر کرمل صاحب کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"یہاں ایک دوسرے کا خون بہانے کی مکمل آزادی ہے۔ اصل میں یہ سب طور طریقے انہیں انسان سے درندہ بنانے کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں۔ بریگیڈیئر ملہوڑا کی کوشش ہوتی ہے کہ یہاں سے نکلنے والا کوئی بھی ایجنٹ مکمل درندہ بن جائے۔ جو لوگ ہمارے ملک میں سکولوں کے بچوں کو بم دھماکوں سے اڑا رہے ہیں انہیں ہمارا گناہ ہوں میں سمجھتا ہوں اور بے گناہ انسانوں کا بے دریغ خون بہا رہے ہیں۔ معصوم بچوں کو اغوا کرنے کے بعد بے رحمانہ انداز سے ان کے جسم کے ہر انگ کاٹ کر انہیں مار رہے ہیں وہ سب اسی بریگیڈیئر ملہوڑا کے تربیت یافتہ ہیں۔ سب ایس ایس بی اور بیوٹاری کیمپ سے تربیت یافتہ ہیں۔"

اس نے اس کیمپ سے متعلق ایسے ایسے روح فرسا واقعات اسے سنائے تھے کہ اب ظاہر کو گھنہ ہی آنے لگی تھی۔
اپنی بات مکمل کر کے وہ اطمینان سے اس کے پہلو میں موجود کرسی پر بیٹھ گیا۔

○ ○ ○

ایک ہی کمرل صاحب کھڑے ہو گئے۔
"تمہیں تمہارے ایک ساتھی سلیم کے ساتھ اس کیمپ میں لانا چاہیے جا رہا ہے۔ تمہارا یہ ساتھی جو تھوڑی دیر بعد تمہیں ملنے والا ہے تمہاری طرح اپنے فن میں طاق اور بہادر ہے۔ ظاہر ہے اس کیمپ کو برباد کر کے رکھ دو۔ اسے جس نہیں کر دو۔ یہی ایک طریقہ ہے دشمن کو شکست جواب دینے کا۔ اسے بتانے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ ہم اپنی قومی سلامتی اور سالمیت کے دشمنوں کا آخری حد تک تعاقب کرتے ہیں۔ اس وقت تک جب تک کہ ہماری بربادی کا خواب دیکھنے والوں کو ہم برباد نہ کر کے رکھ دیں۔"

انہوں نے اپنی بات کہہ کر جواب طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں تیار ہوں سر۔"

ظاہر نے ایک لمحو توقف کے بغیر بڑے مضبوط اور پر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔ کمرل صاحب نے تحسین آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔
"مجھے تم سے یہی امید تھی بیٹا۔ میں جانتا ہوں یہ تمہیں جہنم میں جمونے والی بات ہے۔ لیکن کسی نہ کسی کو اس آگ کا ایندھن بننا ہی ہے۔ تب ہی یہ آگ ٹھنڈی ہوگی۔ تب ہی یہ آگ بجھ

پائے گی۔"

انہوں نے الگ ہوتے ہوئے کہا۔

ایک مرتبہ پھر وہی سینئر آفیسر اس کے ذہن میں پیدا ہونے والے مختلف خدشات اور سوالات کے جوابات دے رہا تھا۔
ای، اٹاشا میں کمیشن صاحب نے کمرے میں داخل ہو کر شاید کسی نئے مہمان کی آمد کی اطلاع دی تھی۔

کمرل صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔

اور.....

دوسرے ہی لمحے سلیم کمرل صاحب کی کمیشن صاحب کی معیت میں اندر داخل ہوا۔

ظاہر نے پہلی ہی نظر میں اسے پہچان لیا تھا۔

"یہ تو عابد ہے۔"

قریباً ایک سال پہلے دونوں بھارتی میں ایک مشن کے دوران ایک دوسرے ملے

تھے تب اس کا نام عابد تھا۔

لیکن.....

اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔

تب اس کا نام بھی میاں تھا۔

یہاں نام تو ہر دوسرے روز بدل جاتے تھے۔ کبھی انہیں اپنا اصلی نام بھی اس پتھر میں بھول جایا کرتا تھا۔

بہر حال اب انہیں ایک دوسرے کو ظاہر اور سلیم کے نام سے ہی شناخت کرنا تھا۔

سلیم نے بڑی گرجوٹی سے اس سے معاف کیا اور دونوں ہی ایک دوسرے کی طرف

دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

"امید ہے تم دونوں ماضی کی طرح مستقبل میں بھی بہترین دوست ثابت ہو گے۔"

کمرل صاحب نے ان کی مسکراہٹوں میں حصہ ڈالا۔

"کیوں نہیں سر"

دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ کمرے میں اس وقت تینوں موجود تھے۔ باقی لوگ باہر چلے گئے تھے۔ کرنل صاحب اور ان دونوں کے سامنے چائے کی پیالیاں دھری تھیں اور سلیم سے اتار ہاتھ کر وہ طاہر کو کس (Cover) کے ساتھ ایس ایس بی کے اس گڑھ تک لے جانے میں کامیاب ہوگا۔

○ ○ ○

طاہر جانتا تھا جس طرح بھارتی انٹیلی جنس نے اپنے ڈبل ایجنٹوں کا جال یہاں بچھا رکھا ہے اس طرح یہ لوگ بھی دشمن کی چالوں سے باخبر رہنے کے لیے اپنے ایجنٹوں کو بھارتی انٹیلی جنس میں داخل کر دیتے تھے۔

سلیم نے دو سال کی محنت شائد کے بعد دشمن کا اتنا اعتماد حاصل کر لیا تھا کہ اب اسے اپنے ملک سے دھکوت بھرتی کر کے بھارتی کمپوں تک پہنچانے کی اجازت مل گئی تھی۔ اس نے ایس ایس بی تک "را" کی ذریعہ رسائی حاصل کی تھی اور ایک ملک دشمن لسانی تنظیم کی رکنیت حاصل کرنے کے بعد اس کے سرگرم ممبر کی حیثیت سے اپنے آپ کو متعارف کروایا تھا۔

یہ بڑی جان جو کھول کا کام تھا۔

اس کمیل میں دشمن کو معمولی سا شک گزرنے کا مطلب سوائے موت کے اور کچھ نہ تھا۔

طاہر اس کے سنجھی کا ادراک رکھتا تھا۔

گو کہ ان کا کام ہی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگی بسر کرنا تھا۔ اور وہ ہر لمحہ تلواریں دھار رہی چلا کرتے تھے۔

لیکن.....

یہاں کم از کم انہیں دشمن کے باخبر ہونے کی صورت میں ہٹا گئے کے یکساں مواقع تو حاصل تھے جب کہ "ڈبل ایجنٹ" کے کھیل میں ایسا نہیں تھا۔

وہاں تو وہ ہر لمحہ دشمن کی گرفت میں ہوتے تھے۔

معمولی شک گزرنے پر انہیں بے نام موت مل سکتی تھی۔

تخریب کاری کے ان ترقیاتی مراکز میں جانے والے کسی بھی گروپ کے مکمل نوجوان خوش قسمتی سے ہی لوٹا کرتے تھے۔

عموماً ان میں ایک آدھ کو ضرور مار دیا جاتا تھا۔

اس طرح وہ لوگ دو ہر ہرے مقاصد حاصل کرتے تھے۔ بسا اوقات وہ کسی جنگ کے بعد محض زرخیز ایجنٹوں پر دباؤ بڑھانے کے لیے ان کے ایک ساتھی کو ان کی نظروں کے سامنے اڑتیں دے دے کر اس لیے ہلاک کر دیا کرتے تھے کہ وہ غدار یا غداری کی صورت میں اپنے انجام سے ڈرتے رہیں اور آنکھیں بند کر کے اپنے آقاؤں کے احکامات کی تعمیل کرتے رہیں۔

جب کہ دوسری طرف مرنے والے کے ساتھی اس لیے مطمئن رہتے تھے کہ ان کے حلقوں میں اب کوئی خفیہ باقی نہیں رہا۔

وہ خود اپنے کسی بھی ساتھی پر معمولی سا شک گزرنے پر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا کرتے تھے تاکہ باقی سب لوگ محفوظ رہیں۔

چوہے اور ملی کے اس کھیل کو بھارتی انٹیلی جنس بڑی کامیابی سے کھیل رہی تھی۔ سلیم نے ان لوگوں کا اعتماد حاصل کر لیا تھا کیونکہ ان کے احکامات پر وہ اب تک دو "کامیاب دھماکے" کر چکا تھا۔

یہ الگ بات ہے کہ یہ دھماکے خود ساختہ تھے۔

لیکن.....

کمال یہ تھا کہ بھارتی انٹیلی جنس نے نزدیک وہ اس کی کامیاب ترین کارروائیاں تھیں جن کے نتائج بھی ان کی مرضی کے مطابق ہی برآمد ہوئے تھے۔

اس نے طاہر کا نانا بہانہ تعارف ایک مفروضہ شہدائی سٹوڈنٹ لیڈر کی حیثیت سے کروایا تھا۔ اپنے آقاؤں کو بتایا تھا کہ اس نے طاہر کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔

اور.....

اب وہ اس کے حکم پر کنوینس میں چھلانگ لگانے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔

اس نے طاہر کو نانا بہانہ تعارف انتقام کی آگ میں جھپٹے ایک باغی کی حیثیت سے کروایا تھا جو اپنے ملک کی اینٹیشن لین کو تباہ کرنے پر تلا ہوا تھا اور اپنے انتقام کے چکر میں سب کچھ جلا کر راکھ کر دینے کا عزم رکھتا تھا۔

کرنل بھائیہ کو اس نے طاہر کا تعارف اتنا بڑھا چڑھا کر کروایا تھا کہ اس نے فوراً ہی

طاہر کی بھرتی کے لیے اسے اوکے سٹپل دے دیا تھا۔

اور.....

سلیم نے اس ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے کرگل بھائیہ کی توقع سے زیادہ ایڈوائس کی ڈیمانڈ کر دی تھی جس سے کرگل کا یقین مزید پختہ ہو گیا تھا۔

”جیوں کی پروا مت کرنا۔ ہمیں ادھر پنجاب میں تین چار کام کے لوٹے چاہیں۔ میرا مطلب سمجھتے ہوتا تم۔“

کرگل نے اس کے سامنے اپنے پستول کا جیمبر لوڈ کرتے ہوئے کہا۔

سلیم اس وارننگ کا مطلب بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔

اس نے دل ہی دل میں ایک بڑی سی کالی کرگل کو دی اور خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ ”سرا! میں بڑھتا آؤں ہوں۔ ابھی تک میرے بچے رہنے کا راز بھی یہی ہے۔ میں نے آج تک کوئی ایجنٹ بھرتی نہیں کیا۔ اب بھی بہت سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال کر اس ٹیم میں ہاتھ ڈالا ہے۔ سرا! آپ کو میرا دے رہا ہوں۔ آج تک ایسا سو راکسی ماں نے نہیں جتنا۔ سامنے نے ایک ہی مقابلے میں تین پولیس والے مار دیے تھے۔ بس اس کی ایک ہی کزوری ہے پیر، اسے پیر چاہیے، غور اور شراب سے تو یوں بھانکتا ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔“

اس نے کرگل بھائیہ کو اپنی چرب زبانی سے بلا خواہی طرح ششے میں اتار لیا تھا۔ اس فن میں وہ ماہر تھا۔

کرگل بھائیہ کا اشتیاق اس نے اتنا بڑھایا کہ اب وہ سلیم سے تقاضا کر رہا تھا کہ وہ جتنی جلد ممکن ہو اسے بھارت لے آئے۔

کرگل بھائیہ کو پنجاب میں ایسے تین چار لڑکوں کی اشد ضرورت تھی۔ اگر وہ دو تین کامیاب دھماکے ادھر کروا دیتا تو اس کے گندھوں پر بریگیڈئیر کے شمار کئے سے کوئی نہیں روک، سکتا تھا۔

اگر ملہوڑا جیسے گدھے کو ان لوگوں نے بریگیڈئیر بنا دیا ہے تو اسے کیوں نہیں..... وہ بہر حال ملہوڑا سے زیادہ اچھی کارکردگی کا ریکارڈ رکھتا تھا۔ تم بالائے تم کہ اب اسے اس کپ

میں بھی ملہوڑا کے ڈپٹی کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہا تھیں۔

”آل رایت ملہوڑا..... دیکھ لو گاہیں بھی“

اس نے دل ہی دل میں کہا۔

”اور ہاں This is between me and you (یہ صرف میرے اور تمہارے درمیان ہے۔)“

اچانک ہی وہ سلیم سے سرگوشی میں مخاطب ہوا۔

”سرا! آپ بالکل مطمئن رہیں۔ میں بریگیڈئیر صاحب کو اس کی ہوا تک نہیں لگنے دوں گا۔“ اس نے کرگل بھائیہ کا عندیہ بھانپ لیا تھا۔

”ویل..... ایسی کوئی بات نہیں ہے، لیکن میں انہیں ”سر پرائز“ دینا چاہتا ہوں۔“ کرگل نے سمجھنی مونچھوں کے پیچھے سے दांतوں کی فٹاس کی۔

وہ کم از کم یہ تو ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ اس دو گئے کے سلسلے کو بھارتی فوج کے دو افسران کی معاصرانہ چشمک کا احساس بھی ہونے پائے۔

”As you wish“ (جیسی آپ کی خواہش چاہتا ہے۔)

سلیم نے چٹائی کے انداز میں دانت نکال دیے۔

کرگل نے اسے اس مرتبہ بطور خاصا بڑا ٹریٹ دیا تھا اور روٹھی پر اس کی ڈیمانڈ کر وہ کھلی رقم اسے نقدی کی صورت میں حمادی تھی۔ حالانکہ یہاں اصول یہی تھا کہ آدمی رقم ایڈوائس اور آدمی رقم کام ہونے کے بعد دی جاتی تھی لیکن.....

کرگل بھائیہ نے اس سے بے پناہ امیدیں وابستہ کر لی تھیں اور اب تمام اصول و ضوابط جنہم میں جموں جموں کو خوش کرنے پر تلا ہوا تھا۔ یوں بھی ان کے پاس لٹانے کے لیے خاصی رقم موجود تھی۔

○ ○ ○

ویزہ کے لیے طاہر کا نام پہلے ہی سے بھارتی قوانین میں پھنچ چکا تھا۔

لیکن.....

ان کا ویزہ معمول کے مطابق ہی لگا تھا۔ عام لوگوں کی طرح انہیں بھی قطار میں لگ کر

دیکھنے کھانے پڑے تھے۔ دونوں طرف سے یہ ضروری سمجھا گیا تھا۔

جس روز وہ بنگلہ اکراٹھا پر سلیم واپس لوٹے، اگلے ہی روز سلیم کو ”را“ کی طرف سے پیغام مل گیا کہ مشتاق ٹائی فوجان ان کی ملاقات کو آ رہا ہے جس سے طاہر کو ملنا ضروری ہے کیونکہ اسی نے سفر کا بندوبست کرتا تھا۔

اس طرح مشتاق ان سے آن ملا۔

مشتاق کی ملاقات سے علیحدگی تک اس کی مکمل عمرانی کی جاری تھی اور دشمن ایک دہشت گرد کی شناخت ہونے کے باوجود وہ لوگ اسے گرفتار نہیں کر سکتے تھے مگر اس کھیل کے اصول دنیا کے تمام کھیلوں سے نرے تھے۔

یہاں بادشاہ کو مات دینے کے لیے دو تین ہرے مرادینا معمول کی بات سمجھی جاتی تھی۔

سلیم کے ذریعے اب تک دشمن کے چھ اہم ایجنٹ اس ملک میں ایک پیوز ہو چکے تھے۔ ان سب پر پاکستان انٹیلی جنس نے کڑی نظر رکھی ہوئی تھی۔ ان کے خلاف ضرورت کے مطابق مناسب کارروائی بھی کی گئی تھی۔

لیکن.....

کسی ایک مرحلے پر بھی ”را“ کو اس بات کا احساس نہیں ہونے پایا تھا کہ ان کی مضمون میں کوئی ذیل ایجنٹ گھس آیا ہے۔

کوئی ایسا گھر کا بھیدی جو وقت آنے پر ان کی انکشاف خانے کی طاقت رکھتا ہے۔ مشتاق نے اپنی دانست میں طاہر سے متعلق مکمل تحقیق کی تھی۔ وہ شاید یہاں کا مقامی سپائی ماسٹر تھا۔

مشتاق اپنی دانست میں اچانک ہی ان سے ٹکرایا تھا۔

لیکن.....

وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ لوگ اس کی تو قحط سے بڑھ کر سارٹ تھے۔ ”را“ نے اپنے مقامی سپائی ماسٹر اور ایجنٹوں کو پاکستان انٹیلی جنس کی نظروں سے بچانے کا بظاہر بہت فول پروف نظام بناتا رکھا تھا۔

مشتاق نے سلیم سے ملاقات کا کوئی وقت یا مقام طے نہیں کیا تھا۔ صرف اس سے اگلے

دو دن کی مصروفیات اور اس کے نمکذات مقامات جہاں ملاقات ممکن تھی دریافت کئے تھے۔

اور.....

سلیم جو اس سارے کھیل کے داؤ بیچ سیکھنے کے بعد میدان میں اترتا تھا، اس کا مطلب اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔

اس نے ٹیلی فون پر اپنے تین چار ایسے نمکذات کھانے بتائے تھے جہاں مشتاق اور اس کی ملاقات کی صورت میں دونوں کی مکمل گہرائی آسانی سے کی جاسکے۔

اور.....

یہی ہوا۔

مشتاق کو تو اس بات کی خبر نہ ہو سکی کہ وہ جس فون نمبر پر سلیم سے بات کر رہا تھا وہ نمبر بھی ”بمب“ تھا۔

سلیم نے اسے پانچ منٹ تک اپنے ساتھ گفتگو میں الجھائے رکھا تھا اور اس دوران اس جگہ کی نشاندہی ہو چکی تھی جہاں سے مشتاق اسے فون کر رہا تھا۔

یہ شہر کی ماڈرن کالونی کا ایک بنگلہ تھا جو ایک ریٹائرڈ افسر کا مسکن تھا۔ اس طرح دشمن کا ایک اہم نمکذات پاکستان انٹیلی جنس کی نظروں میں آچکا تھا۔

○ ○ ○

اس روز بھی مشتاق اپنی دانست میں سلیم سے اچانک ہی ٹکرایا تھا لیکن اسے علم نہ ہو سکا کہ اس کے یہاں پہنچنے تک کی مکمل فلم بھی بن چکی تھی اور دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ سلیم کے کوٹ کی جیب میں چھپے ہوئے سے ٹیپ ریکارڈ ہو چکا تھا۔

مشتاق کی ہدایت پر اس نے طاہر کو فون کر کے اسے کینے پر طلب کر لیا تھا جسے سلیم نے اپنے ایک دوست کی ملکیت بتاتے ہوئے کہا تھا کہ وہ دن کا بیشر حصہ بیٹیں گزارتا ہے۔ مشتاق کو علم نہ ہو سکا کہ وہ انٹیلی جنس کا ایک ”سیف ہاؤس“ تھا جسے وہ لوگ ”بلور“ آ۔ وی“ (دو ایجنٹوں کی ملاقات کی جگہ) استعمال کیا کرتے تھے۔

طاہر فون ملنے کے بعد مناسب وقفے سے وہاں پہنچ گیا اور اس نے اپنے انداز و اطوار سے مشتاق کو ضرورت سے زیادہ ہی متاثر کر دیا تھا۔

نہیں کیا تھا۔

البتہ مشتاق نے ریلوے سٹیشن سے دہلی کے ایک ٹیلی فون نمبر پر رابطہ کر کے کچھ معلومات اپنے سفر سے متعلق حاصل کی تھیں اور اپنے مکان کا پتہ آد سے بھی مطلع کر دیا تھا۔

○ ○ ○

”یار ابھی سو جاؤ۔ کیوں اپنی نیند کے ساتھ ہماری نیند بھی خراب کر رہے ہو۔“
علی الصبح اسے چار پائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھوے کچھ کر سلیم نے اپنے بستر سے گردن کھما کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر آنکھیں موند لیں۔
ابھی اس نے بمشکل کروٹ ہی بدلی تھی کہ دروازے پر بڑی شریطانہ دستک سنائی دی۔
ظاہر ہے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

اور.....

دوسرے ہی لمحے قریب اس ہو کر رہ گیا۔
یوں جیسے اس پر کسی نے اچانک حجر پھونک دیا ہو۔
دروازے کے سامنے کاٹھی اگر وال کھڑی تھی۔

لیکن.....

اس کے جسم پر کپڑے نہ ہونے کے برابر تھے۔
شارٹس اور پٹی میں شاید وہ ورزش کرتی اس طرف آئی تھی اور یہاں سے بھر سونگ
کے لیے جانے والی تھی۔

”آئی ایم سوری امی! آپ کو بتانا بھول گئی کہ آج سے آپ یہاں کے ڈپلن کا حصہ
بن چکے ہیں۔ ابھی چند منٹ میں بیڈ ٹی آئے گی جس کے چند رہ منٹ بعد آپ کو وہ سامنے والی
ڈول گر اوڈ میں جانا ہے۔“

اس نے ہاتھ کی انگلی کی سامنے نظر آنے والی ایک گر اوڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

کہا۔

”شکریہ۔“

ظاہر ہے تھوک نکل کر کہا۔

مشتاق نے اس سے متعلق وہی رپورٹ کرل بھائیہ کو دی تھی جو اس سے پہلے سلیم دے
چکا تھا۔

اور.....

کرل بھائیہ نے خوشی سے پھولے نہ مارتے ہوئے ظاہر کو بڑے احترام اور عزت سے
بھارت پہنچانے کی ہدایت کی تھی۔

مشتاق کو یہ علم نہیں تھا کہ پاکستان انٹیلی جنس سے متعلق ”ہائر“ (وٹمن سے متعلق
معلومات حاصل ہو جانا) کڑی ہے اور مستقبل میں اسے بطور کنفیوژن (وٹمن کی مغلوں میں غلط
اطلاعات پہنچا کر انتشار پیدا کرنے والے ایجنٹ) کے کردار کے لیے بھی منتخب کیا جا چکا ہے۔
یہ کام پاکستان انٹیلی جنس نے مشتاق کو جواب ان کا ”سیکیٹ“ ”بن چکا تھا“ لا علم رکھ کر
انجام دیا تھا۔

تیسرے روز مشتاق کی طرف سے انہیں تیاری اور روانگی کا مکمل مل گیا۔ ٹکٹ انہوں
نے اکٹھے ہی خریدے۔

اور.....

مزید دو روز گزرنے کے بعد وہ تینوں ٹرین کے ذریعے دوسرے سینکڑوں مسافروں
کے ساتھ بھارت کی طرف مازم سفر تھے۔

سٹیشن سے ٹرین میں بیٹھنے تک کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے تمام
معاملات معمول کے مطابق طے کئے تھے۔ قلی سے سسٹم تک ہر جگہ اس طرح رشوت دی تھی۔ جس
طرح ٹرین کے باقی مسافر دیتے رہے تھے۔
یہاں سے دہلی کا سفر تھا دینے والا تھا۔
لیکن.....

وہ اس سے یوں محفوظ رہے کہ امرتسر جہاں سے انہیں دوسری ٹرین پکڑنی تھی پر ان کے
استقبال کی تیاری ہو چکی تھی اور دوسرے مسافروں کے برعکس وہ فرسٹ کلاس سے سفر کر رہے
تھے۔ ان کا ہم سفر کوئی مقامی شخص نہیں تھا۔ بس امرتسر کے ریلوے سٹیشن پر ایک سردار صاحب
مشتاق کے ہاتھ میں تین ٹکٹ تھا کہ جمل دیئے تھے۔ انہوں نے زبان سے کچھ کہنے کا تکلف بھی

اس کے لیے کاٹنی اگر وال کا اس طرح اچانک سامنے آنا ہو کھلادینے کے لیے کافی تھا“ لیکن..... اسے خود کو شریف زادہ نہیں بلکہ لپا لنگھا اور بد معاش ثابت کرنا تھا۔

ایسا بد معاش جس نے بظاہر شرافت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا اور جس کے لیے اس طرح شریفیوں کے ساتھ ایسے ماحول میں ملاقات کرنا کوئی اچھے بے بات نہیں تھی۔ اس نے اپنی دانست میں خود کو چند سینکڑوں کے بعد غافل کر لیا تھا۔

لیکن..... کاٹنی کے اچانک سامنے آنے پر اس کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کے لیے جیسے اچانک بدل گیا تھا۔ وہ کیفیت ”را“ کی مستعد اینکٹ ہینڈلر (ایجنٹوں کو بھرتی کرنے اور تربیت دے کر ان سے کام لینے والی) کاٹنی اگر وال کی مقابلی نگاہوں سے چھپ نہیں سکتی تھی۔ ایس ایس لی کے اس مرکز میں موجود ہر انسٹرکٹر خصوصی علوم میں مہارت رکھتا تھا۔ اپنے اپنے کام میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اینکٹ کی نفسیاتی صورت حال سے بڑے چوکے اور باخبر رہتے تھے۔

ان کی ایک ایک لمحے کی حرکات و سکنات کو ”مائٹرز“ کرنا ان کے فرائض میں شامل تھا۔ یہاں کا ہر انسٹرکٹر اپنے زیر تربیت اینکٹ سے متعلق اپنی روزانہ کی رپورٹ لکھا کرتا تھا جس میں بطور خاص یہ بتایا جاتا تھا کہ متعلقہ اینکٹ کا آج کا رویہ کیا رہا۔ اس سے متعلق اینکٹ کے ذہن میں پیدا ہونے والا معمولی سا شک بھی اس اینکٹ کی موت کا پیا مہربن مل سکتا تھا۔

ان انسٹرکٹروں کو اس بات کا بھی علم تھا کہ بسا اوقات زیر تربیت اینکٹوں کے ہمیں میں ان کے اپنے افسران بھی شامل ہوتے تھے اس طرح ان پر ”کاؤنٹر چیک“ دکھ کر ان کی کارکردگی بھی مائٹرز کی جاتی تھی۔ اس کے لیے وہ بہت محتاط اور چوکے رہتے تھے۔

کاٹنی اگر وال نے البتہ پہلی ملاقات میں ظاہر کے چہرے پر اچانک آنے والی گھبراہٹ کی لہر کو نہ جانے کیوں نظر انداز کر دیا تھا۔

اس نے جان بوجھ کر اس کا ذکر اپنی روزانہ کی رپورٹ میں نہیں کیا تھا حالانکہ اس نے ان تینوں اینکٹوں کو ریویو کیا تھا اور اب ان کے گورنر کے اختتام تک ان کی بیرونی اور گرائی کے مکمل فرائض اس نے انجام دینے تھے۔

نہانے کیوں اسے پہلی ہی ملاقات کے بعد ظاہر باقی دونوں سے الگ تھلگ اور کچھ عجیب سا دکھائی دیا تھا۔

لیکن.....

اسے خود حیرت ہو رہی تھی ”اس نے ابھی تک اس سے متعلق اپنے ذہن میں آنے والے ان خیالات کو اپنے ریمارکس کے ساتھ اپنی ڈیلی رپورٹ میں کیوں درج نہیں کیا۔“

”ہے اس میں ضرور کوئی خاص بات۔“

کاٹنی اگر وال نے زیر لب کہا اور مسکراتی ہوئی واپس چلی گئی۔

مجھ آدھا گھٹنہ تیر کی کی عادی تھی۔

اس کی فٹ نس کا بیکرا راز تھا۔

وہ ”ہواری کیپ“ سے گزشتہ ڈیڑھ سال سے وابستہ تھی۔ اس دوران درجنوں دہشت

گروہوں کو اس نے اپنے ہاتھوں سے درندے بنا کر واپس ان کے ممالک کی سرحدوں پر دھکیلا تھا۔

ضرورت پڑنے پر ان زیر تربیت اینکٹوں کی ہر جائز و ناجائز خواہش پورا کرنا اس کے فرائض منصبی میں شامل تھا۔ بسا اوقات اسے اپنا آپ انہیں پیش کرنا پڑتا تھا ”لیکن کاٹنی حیرت انگیز طور پر

دوسروں سے مختلف تھی۔ یہ اس کی دیوثی تھی۔ اس کی مذہبی اور سیاسی تعلیمات یہی تھیں۔ دوسری

لڑکیاں اس بات پر فخر کرتی تھیں کہ ان کے ساتھ ایک رات بسر کرنے والے دہشت گردوں نے

یہاں سے واپس جانے پر مکملہ ذبح فرام کئے تھے۔ یہ ان کا اڑ تھا۔ اس طرح ان کے ہم منصبوں

میں اس کی تو قیہر بڑھتی تھی اور ”انجینی“ کی فاکوں میں اس کے ٹھہر بڑھتے جاتے تھے۔

ایس ایس لی کے اس تباہ کاری مرکز پر یوں تو براہ راست اٹلی جنس کا کنٹرول تھا لیکن

یہاں مختلف اینکٹوں کے اعلیٰ دماغوں کو ڈیوٹیشن پر بھیجا جاتا تھا اور بیشتر انسٹرکٹرز ”را“ کے فرائض

کردہ تھے جن میں کاٹنی اگر وال بھی شامل تھی۔

○ ○ ○

مجھ کا آغا کاٹنی اگر وال کے کہنے کے مطابق پڑے سے ہوا تھا۔ انہیں جسم کو چوکس

رکھنے کی ورزشیں کروائی جا رہی تھیں۔ یہ نیا کچھ تھا جس میں ان جیسے میں اور نوجوان موجود تھے جن

میں سے زیادہ کا تعلق سری لنکا سے تھا۔ ظاہر نے وہیں اعزازہ کر لیا تھا کہ یہ وہ تامل ہیں جنہیں

بھارتی اٹلی جنس تربیت دے کر ان کے ملک میں دھکیل دیتی ہے۔

اسے حیرت ہو رہی تھی کہ بظاہر بھارتی حکومت نے تامل ناگیرز سے صلہ دہی اختیار کیا ہوئی ہے اور ان کے خلاف سری لنکا گورنمنٹ کی مدد کر رہے ہیں لیکن اندر خانے کچھ اور معاملات چل رہے تھے۔ پھر اسے خود ہی اپنے سوالات کے جوابات بھی ملتے چلے گئے اور اسے سمجھ آگئی کہ ان کا واسطہ دنیا کی منافق ترین قوم سے ہے جس کا ایک ہی اصول ہے کہ اس کا کوئی اصول نہیں۔

ابھی تک کرل بھائیہ نے اس سے براہ راست ملاقات نہیں کی تھی، لیکن وہ کامنی اگر وال کے ساتھ پریڈ گراؤنڈ کے کونے میں بنی ایک بلڈنگ کی بالکنی میں آنکھوں پر دور بین جمائے ظاہر کو فکس کئے بیٹھا تھا۔ اس کی جہاد یہ نظروں نے جلد ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ سلیم نے اس سے متعلق جو کچھ بتایا تھا وہ اس سے کچھ زیادہ ہی ثابت ہو رہا تھا۔ کرل بھائیہ کی ہدایت پر آج انسٹرکٹر نے جان بوجھ کر کچھ سخت قسم کی ورزش منتخب کی تھیں اور حیرت انگیز طور پر پندرہ میں منٹ بعد جب ایک ایک کر کے سنے آنے والے لڑکے تھک کر ایک طرف بیٹھ چکے تھے ظاہر اپنی جگہ موجود تھا۔

انسٹرکٹر اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”تم کرائے کھیتے ہو؟“

اس نے اچانک ہی سوال کر دیا۔

”نہیں سر! میں قری ڈان ہوں۔“

ظاہر نے جس کا جسم پسینے سے شرابور تھا جواب دیا۔

”ہوں اں۔“

انسٹرکٹر نے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور واپس مڑ گیا۔ لیکن.....

اچانک ہی وہ چلا اور اس نے اپنی دانستہ شکل میں ظاہر کو بے خبر پا کر اس پر زبردست ہاتھ

کھمبایا لیکن..... اس کی توقعات کے برعکس اس کا ہاتھ صرف ہوا میں گھوم کر رہ گیا اور.....

اس سے پہلے کہ انسٹرکٹر سنبھل کر دوسرا حملہ کرنے کا ارادہ ظاہر نے اپنی جگہ سے حسرت لگائی اور بمشکل تین

سینکڑ میں انسٹرکٹر زمین چاٹ رہا تھا۔ یہ صرف مدافعتی ایکشن تھا۔

ابھی اس نے حملہ نہیں کیا تھا۔ انسٹرکٹر تھلا کر غصے سے کھولتا ہوا اٹھا اور اس نے ہوا میں

بچھل کر اپنی دونوں ٹانگیں ظاہر کے سینے پر مارنے کی کوشش کی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس مرتبہ پھر اسے کامی کامیاد دیکھنا پڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ اگلا قدم اٹھائے اچانک ہی اسے اپنی پشت پر تالیوں کی آواز سنائی دی۔

”ویل ڈن۔“

ایک بھاری بھر کم آواز نے کہا۔ ظاہر بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی پشت پر کامنی اگر وال اور کرل بھائیہ کھڑے تھے۔

”ویل ڈن بوائے۔ ویل ڈن۔“ کرل بھائیہ نے اس کی پشت چھتی پائی۔ انسٹرکٹر اس کی شکل پر نظر پڑے ہی صوب ہو گیا تھا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“

اس نے بے تکلفی سے ظاہر کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی تعریف کرتا اسے اپنے دفتر تک لے

آیا۔ کامنی اگر وال ان کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ ظاہر نے اسے بہت کر دیا تھا۔ وہ ضرورت

سے زیادہ ہی متاثر نظر آ رہی تھی۔

”تعریف رکھیں۔“ کرل بھائیہ نے اپنے کمرے میں پہنچ کر سامنے آرام دہ کرسی کی

طرف اشارہ کیا۔

”شکر“ کہہ کر وہ بیٹھ گیا۔

”بھئی واہ کمال کے آدمی ہو۔ واقعی جیسے سلیم نے کہا ویسا ہی پایا۔“

کرل بھائیہ نے اپنی تھکی مچھلیوں کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے کہا۔

”تھینک یوسر۔“ ظاہر نے انکساری کا مظاہرہ کیا۔ ”میں کامنی اگر وال سے قول پکے ہو

کے تم؟“

اس نے اپنے ساتھ مودب کھڑی کامنی کی طرف اشارہ کیا۔ ظاہر نے اثبات میں گردن

ہلا دی۔

”مگڑ۔ مجھے تمہیں نو جوانوں ہی کی ضرورت ہے۔ مسٹر ظاہر! اگر تم چاہو تو اپنی حکومت

کو تانوں پنے چھو سکتے ہو۔ اپنی ایک ایک محرومی کا انتظام لے سکتے ہو۔“

اس نے رٹا رٹا یا سٹس ظاہر کے سامنے ہر دیا۔

”سرا میں! انہیں ساتھ کروا دوں گا۔ برباد کر دوں گا۔ میں ایک ایک سے بدلہ لوں گا۔“

سلیم اس پر سے اپنی نظریں نہیں ہٹایا تھا۔ مشتاق کی بات البتہ اور تھی۔۔۔۔۔

وہ اپنا خمیر اور ایمان رہن رکھ کر اس دیش میں چکی کھانے کو آیا تھا۔ ان کے معاملات مختلف تھے۔ ”آدھے گھنٹے بعد آپ دوبارہ پریڈ گراؤنڈ پہنچیں گے جہاں سے آپ کا انسٹرکٹر آپ کو اپنے ساتھ اگلی تربیت کے لیے لے جائے گا۔“ کاشمی نے ان کو بتایا۔ ”آل راءیت میڈم۔“ طاہر نے جواب دیا۔ ”میں اب چلتی ہوں۔ آپ سے پھر ملاقات ہوگی۔“ کاشمی نے طاہر کی طرف دیکھ کر عجیب سا اشارہ کیا جسے وہ دونوں نوٹ نہیں کر سکے اور وہ مسکراتی ہوئی باہر چلی گئی۔

”واہ استاد۔ بڑا مسرکہ مارا ہے۔“

اس کے باہر جاتے ہی سلیم نے کہا۔

”اے ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

طاہر نے اعساری سے کہا۔

”بات تو ہے۔ یہ معمولی چھوڑی نہیں۔ کسی قسمت والے کو ہی لطف کرواتا ہے۔ میں تو ساری کو ایک رات حاصل کرنے کے لیے سارے ملک کو آگ لگا دوں۔“

مشتاق نے کہا۔

اور۔۔۔۔۔

طاہر کا خون کھول اٹھا۔ اس کے چہرے کی بدلتی کیفیت کو اگلے ہی لمحے سلیم نے نوٹ کر لیا۔ وہ کچھ گڑبڑ اکیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مشتاق جو کاشمی کے جانے کے بعد سے مسلسل اپنے ملک کے خلاف لاف گزاف بک رہا ہے وہ ضرور کوئی چال ہے۔ بسا اوقات ان لوگوں پر ”چیک“ لگادیا جاتا تھا اور مین ممکن تھا کہ مشتاق کو ان پر نظر رکھنے کے لیے ہی ان کے درمیان چھوڑا گیا ہو۔

اس نے جان بوجھ کر بہانے سے اپنی پشت اس طرح مشتاق کی طرف کی تھی کہ وہ طاہر اور اس کے درمیان حائل ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے طاہر کو آنکھوں ہی آنکھوں میں وارننگ دے کر نارمل رہنے کی تلقین کی۔ شاید طاہر نے بھی فوراً ہی غلطی کا احساس کر لیا تھا کیونکہ دوسرے ہی لمحے وہ نارمل ہو چکا تھا۔

اب وہ سلیم کی توقعات کے برعکس بڑی گرم جوشی سے مشتاق کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔ اس نے اپنی دانت میں مشتاق کو مطمئن کرنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی تھی اور دونوں کو امید تھی

کہ وہ کامیاب رہے ہیں۔ ”اچھا یار اب ہاتھ روم ہو آؤ۔ وقت کم ہے۔ سنا ہے وقت کی تختی سے پابندی کی جاتی ہے۔“ سلیم نے طاہر کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اوہ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔ یار زندگی میں کبھی اس سارے وقت کو ہم نے اہمیت نہیں دی۔“

اس نے غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ مشتاق دوسرے ہاتھ روم کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے یہاں سے بیٹے پر طاہر نے لمبا سانس لے کر خوشگوار مل گیا۔ اور۔۔۔۔۔

اسے یقین ہو چلا تھا کہ یہ مصیبت ان کے گلے کا ہار بنی نہیں بن گئی۔ مشتاق واقعی ان کا پرانا تنک خور لگا تھا اور شاید اس کا استعمال ہی یہی تھا کہ اسے ”بنواری کپ“ میں آنے والے نئے بیٹروں کے درمیان چھوڑ کر ان کی مکمل چیکنگ کی جائے۔

بھارتی کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لیتا چاہتے تھے۔ خصوصاً اس کپ میں جہاں دہشت گردی کی تعلیم بڑے اعلیٰ اور جدید ترین پیانے پر دی جاتی تھی۔ آدھا گھنٹہ گزرتے ہی ان کے کمرے کے ایک کونے میں لگی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ بات کا اشارہ تھا کہ وہ فوراً پریڈ گراؤنڈ میں پہنچیں۔ پریڈ گراؤنڈ میں تینوں اکٹھے ہی پہنچے تھے۔ کیپٹن پوسال ان کا منتظر تھا جس کے ساتھ کاشمی آکر وال بھی کھڑی تھی۔ یہ کیپٹن پوسال وہی انسٹرکٹر تھا جس نے صبح طاہر کے ہاتھوں تک اٹھائی تھی۔

طاہر کی شکل پر نظر پڑتے ہی اس کا خون کھولنے لگا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا ابھی اس کے جسم میں ڈیوٹی ٹرینٹ کرے اور اسے دھماکے سے اڑا کر اپنا غصہ شفا کر لے لیکن۔۔۔۔۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں کا ڈسپلن ہی ایسا تھا۔ خصوصاً ایس ایس بی کے اس کپ میں آنے والے دہشت گرد بھارتی ایجنٹوں کے نزدیک وی آئی پی دہشت گردوں کا درجہ رکھتے تھے۔

○ ○ ○

پوسال کا شمار اپنی ٹائلیں کے بد معاش اور کرپٹ افسروں میں ہوتا تھا لیکن وہ حیرت انگیز ملا جلتوں کا مالک بھی تھا۔ اس نے ”روسی سیٹناؤ“ کے ساتھ تربیت حاصل کی تھی اور ان کا شمار بھارتی فوج کے جانے مانے کمانڈرز میں ہوتا تھا۔ اس نے روسی کمانڈرز کے ساتھ دنیا کے بدترین دہشت گردوں کی تربیت حاصل کی تھی اور اس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ اپنی حس درندگی کو تسکین

دینے کے لیے جانوروں کا خون پی جاتا تھا۔

اس کی ان خصوصیات کی وجہ سے اسے ایک کپ میں بھیجا گیا تھا۔ وہ یہاں آنے والے گمراہوں کو جانوروں کو آستین کے ساتھ بنا کر ان کے گھروں کو واپس بھیجتا تھا۔ بھارتی انٹیلی جنس ایجنٹوں میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ ایک مرتبہ ”بنواری کپ“ میں کیشن پوسال کے ساتھ پندرہ روزہ کورس کرنے کے بعد کسی بھی ایجنٹ میں انسانیت یا مذہب نام کی چیز باقی نہیں رہ جاتی تھی۔

جانوروں کی طرح انسانوں کی چیز چھاڑ اس کا شوق تھا۔ اس پر تین مرتبہ گینگ ریپ ثابت ہو چکا تھا لیکن ماسلوم ورجات کی بنا پر اس کے خلاف کورٹ مارشل نہیں لگایا گیا تھا۔ وہ بلا کا شراب نوش اور گورنوں کے حوالے سے خاصا مذہب نام تھا۔ لیکن..... عجیب بات تھی کہ ان حرکات پر کبھی تنبیہ کی سے نوش نہیں لیا گیا تھا۔

اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کا علم اور کسی کو ہو نہ ہو خود کیشن پوسال کو ضرور تھا۔ اسے آری کے اصولوں کے خلاف ورزی کرتے ہوئے متعدد مرتبہ ہمسایہ ممالک میں قتل و غارت گری کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ ہمسایہ ممالک کی مستند شخصیات کو اپنے آقاؤں کے حکم پر موت کے گھاٹ اتار چکا تھا اور یہ سلسلہ بنوڑ جاری تھا۔ بریگیڈیئر ملہوڑہ کے اس سے متعلق شینڈنگ آرڈر موجود تھے کہ اس کی تمام غیر اخلاقی حرکتوں کو آتشک برداشت کیا جائے۔ کامنی اگر وال اور پوسال کی دوستی چند روز پہلے ہی قائم ہوئی تھی جب دونوں کی ڈیوٹی اتفاق سے نئے جج کو تربیت دینے پر لگی تھی۔ ملاقات کے پانچویں روز ہی اس نے کامنی کی طرف معمول کا ہاتھ بڑھایا۔ جسے بری طرح جھٹک دیا گیا۔ یہ اس کے لیے شدید دھچکا تھا۔ یہاں ایسا ناممکن تھا۔ کو کوئی انٹرکمز لڑکی اسے انکار کرے۔

وہ تھلا کر رہ گیا۔

کامنی جانتی تھی کہ جلد یا بدیر اسے پوسال کی ہوس کے سامنے ہتھیار ڈالنے ہی ہوں گے۔ یوں بھی اس کی ڈیوٹی اور کامنی؟ ”را“ نے اسے اپنی اداؤں سے ایجنٹوں کا دل بھانے اور وقت آنے پر انہیں اپنی جسمانی ہوس کے جال میں پھانسنے ہی کے لیے تو یہاں بھیجا تھا۔

اسے یہی تربیت تو دی گئی تھی۔ پوسال اس کا ہم مذہب تھا جب کہ اس جیسوں کو بطور چارہ کسی بھی رنگ و نسل کے آدمی کے سامنے بھیک دیا جاتا تھا۔ اس کی ترقی کے لیے ضروری تھا

کہ وہ اسی امن میں کمال حاصل کرے۔ جتنا وہ خود کو بہتر ثابت کرتی اتنا ہی اپنے انفران اعلیٰ کے نزدیک وہ قبول ٹھہرتی۔ ایسا اس کے ساتھ پہلی مرتبہ نہیں ہوا تھا۔ کبھی تو اسے خود پر شک ہونے لگا تھا کہیں اس کی کا پاؤں نہیں پلٹ رہی۔

اسے تو اب ان کے نام اور ٹھکانے بھی یاد نہیں رہی تھیں جن لوگوں کے ساتھ اس نے گزشتہ پانچ برسوں میں تعلقات پیدا کئے تھے۔ لیکن..... نجانے کیوں اسے پوسال پسند نہیں آیا۔ پوسال کے چار حنا انداز نے اس کے اندر اپنے کام کے خلاف پہلی مرتبہ بغاوت پیدا کی۔ اسے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے آپ پر اپنے پٹے پر غصہ آیا۔ اس سے تو بہتر تھا وہ کوئی دیشیا ہوتی۔ وہ جانتی تھی کہ اب تک اس کے نوکری کا جواز اس کے بے پناہ ذہانت اور خدمات تھیں جو وہ انہیں کے لئے انجام دے رہی تھی۔ وہ اکثر اپنے ساتھیوں کے متعلق سوچتی کہ کسی بازار میں جسم فروشی کرتے ہوئے وہ اپنی موجودہ تنخواہ سے کہیں زیادہ مچھے کما سکتی تھیں۔ کام تو ذرا سے فرق کے ساتھ یہاں بھی وہی تھا۔ ان میں اور پیشہ ور ریزی میں فرق ہی کیا تھا؟ صرف یہی کہ وہ سرکاری مراعات یا نذرین تھیں جنہیں ہر مرتبہ اپنا جسم پیش کرنے پر ایک نئے اعزاز کے ساتھ نوازا جاتا تھا۔۔۔۔۔۔ یہ ملکی خدمت کا کون سا انداز تھا؟ یہ کسی نوکری تھی جو اس سے لی جا رہی تھی؟ کون سی دیشیہ تھی جو وہ کرنے جا رہی تھی؟ اس نے اب تک متعدد مرتبہ سوچا اور کڑھنے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکی اور کچھ کہ اس کے اختیار میں تھا بھی نہیں۔

پہلے ہی روز جب طاہر نے جج کے ساتھ یہاں تو اس کا ہاتھ ڈکا تھا۔ اس کی چھٹی حس نے اسے مشکوک بنا دیا تھا۔ طاہر سے متعلق اس کے دل میں شک نے تب بھی جگہ پکڑ لی تھی جب اس نے کامنی اگر وال سے پہلی ملاقات پر اس کے سر پر کھل جائزہ لینے کا ٹکفیف بھی نہیں کیا تھا۔ ایسا ناممکن تھا۔ جو شخص اپنے وطن کا نگار ہو جس نے اپنا ضمیر گروی رکھ دیا ہو وہ کبھی با کردار نہیں ہو سکتا۔

وہاں تو وہ لوگ آتے جتنے جج کا بس نہیں چلتا تھا کہ نظروں ہی نظروں میں اسے کھا جائیں۔ اسے بطور خاص یہ تربیت دی گئی تھی کہ کھڑے کیلے اور چست لباس کے ساتھ ان کے درمیان گھومنا کرے۔ وقت آنے پر اسے باری باری ان کو خوش کر کے اپنا مطیع بنانا ہوتا تھا کہ کبھی ہوس کے جال میں پھنس کر وہ پھر کسی اس کے چنگل سے نکل ہی نہ پائیں۔ اسے اپنے زیرِ کان گروپ

کے ہر خریب کار کے متعلق روزانہ رپورٹ فائل کرنا ہوتی تھی۔

اس کو معمولی سی نفسیاتی تبدیلی سے متعلق بھی اپنے ماسٹر کو آگاہی دینی ہوتی تھی۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ ظاہر کو اپنی رپورٹ میں مشکوک یا ”غیر معمولی“ لکھتی لیکن..... اس نے ”ناٹل“ ہی لکھا۔ کیوں؟ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اس کیوں کا جواب اسے ابھی تک نہیں مل سکا تھا۔ پہلے ہی روز جب دوران تربیت ظاہر نے کیپٹن پوسوال کی درگت بتائی تو کسی نا دیدہ طاقت نے کاٹھی اگر وال کے کانوں میں چیختے ہوئے کہا تھا کہ ضرور وال میں کچھ کالا ہے۔ یہ نوجوان اپنے آپ کو جو کچھ ظاہر کرتے وہ ہے نہیں۔ اس نے جان بوجھ کر یہاں ”انٹگری ٹین“ کا روپ دھارا ہوا تھا جب کہ وہ کچھ اور تھا۔ وہ ضرور یہاں کسی اور مشن پر آیا تھا۔ کیا کاٹھی اگر وال اپنے ٹک کا اظہار کرل بھائی کے سامنے کروے؟ لیکن.....

اس بات کا بھی کیا ثبوت تھا کہ کرل بھائی اس کی بات پر یقین کر لے گا۔ اس روز وہ کتنا سٹار دکھائی دے رہا تھا ظاہر سے! کاٹھی اگر وال نے آج تک کوئی ایسا ایجنٹ نہیں دیکھا جو کرل بھائی کے ساتھ پہلے ہی روز تاشہ کرنے کا اعزاز حاصل کر پایا ہو۔ یہاں تو کنگا ہی اتنی بہ رہی تھی۔

اس نے فی الوقت خاموشی اختیار کر کے انتظار کرنے کو ہی غنیمت جانا تھا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ وہ اس کے متعلق غلط اندازہ قائم کر رہی ہو اور اس طرح کوئی نئی مصیبت گھٹے پڑ جائے۔ کاٹھی نے اس کے زیادہ نزدیک رہ کر اس کی حرکات و سکنات کو قریب سے دیکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پوسوال نے انہیں کھلے دل سے خوش آمدید کہا تھا۔ ان تینوں کے علاوہ اس گروپ میں سات نوجوان تھے جن میں سے کسی کا تعلق بھی ان کے ملک سے نہیں تھا۔

”ہواری کپ“ تک پہنچنے والے خریب کاروں کے متعلق یہ رائے پہلے ہی قائم کر لی جاتی تھی کہ ان میں سے ہر خریب کار نے اس سے پہلے ضرور بھارتی ایشلی جنس کے کسی کپ میں دہشت گردی کی ابتدائی تربیت حاصل کر رکھی ہوگی۔ انہیں یہاں دراصل ایڈوانس کوئرس کے لیے بھیجا جاتا تھا۔

سب ایک قطار میں ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر اپنے ہاتھ پیچھے باندھے کھڑے تھے۔ پوسوال ایک ایک کے پاس جا کر اس کے سامنے چند کیڈنڈ نمبر کر اس کی آنکھوں میں جھانکتا اور پھر مطمئن ہو کر سر ہلاتا آگے بڑھ جاتا۔ ظاہر کے سامنے اس نے کچھ زیادہ ہی وقت گزارا تھا۔ ”ویل ڈن“ اس نے ظاہر کے بازوؤں کی پھلیوں کو چھتیاتے ہوئے زہریلی مسکراہٹ سے کہا۔ پوسوال سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی کاٹھی اگر وال نے بطور خاص پوسوال کی اس حرکت کو نوٹ کیا تھا۔

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ جانتی تھی کہ پوسوال کیسا کیڈنڈ پرور اور درندہ صفت ہے۔ اس بات کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا کہ اس نے ظاہر کو معاف کر دیا ہو اور اس حرکت کے بعد تو اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ ظاہر کو کسی معاف نہیں کرے گا۔

اس کپ میں پوسوال کے ہاتھوں دوران تربیت کسی ایجنٹ کا مارے جانا کوئی ایسا واقعہ نہیں تھا جس کا کوئی نوٹس لیتا۔ نوجوانوں کو اس نے ڈیرہ دون کے پہاڑی علاقوں میں کھنے اور خطرناک جنگلوں میں تربیت دینی تھی اور ایسے خطرناک راستوں کی بحول بھلیوں میں کسی بھی ایجنٹ کی موت کے لیے کوئی بھی بہانہ تراشا جاسکتا تھا۔

کاٹھی اگر وال ایسے واقعات کی یقینی شاہد تھی جب سری انکا کے ایک ٹائل نوجوان خریب کار کی کسی بات سے ناراض ہو کر پوسوال نے اس کے ہاتھوں میں ایسا بم تھا دیا جو قوت سے دو منٹ پہلے ہی اس کے ہاتھوں میں پھٹا اور اس کے جسم کے پرچے اڑ گئے۔ اس پر ایک

معمولی سی رپورٹ قابل کی گئی کہ جو ان کے غلطی سے ٹائٹنگ سمجھ نہیں سکتی تھی۔

وہ انسانوں کو مارنے کے درجنوں معصومانہ طریقے جانتا تھا۔ اپنے زیر تربیت جوانوں کو وہ بھی بتایا کرتا تھا کہ وہ اپنے ٹائٹنگ کو کس طرح لاعلم رکھ کر آسانی سے کوئی خطرہ مول لیے بغیر موت کے گھاٹ اتار سکتے ہیں۔ وہ زہر خورانی کا ماہر تھا۔ روایتوں نے اسے ہر کاظم کھایا تھا وہ انسانی جسم میں زہر منتقل کرنے کے ایسے ایسے طریقے جانتا تھا جن کا عام حالات میں شاید کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

کاشمی سہم کر رہی تھی۔ وہ نہ جانے کیوں نہیں چاہتی تھی کہ طاہر اس طرح بے موت مارا جائے۔ کاشمی اگر وال کی معاونت سے پوسال نے انہیں ابتدائی سبق دیا اور ان کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد کلاس کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔

کاشمی کو اس وقت اپنی تربیت کے مطابق ان نوجوانوں کے ساتھ ان کے کردار تک جانا تھا اور بڑے نامحسوس انداز میں اس صورت حال سے متعلق ان کے خیالات جاننے کے بعد اپنی آج کی رپورٹ لکھتی تھی۔ لیکن..... حیرت انگیز طور پر اچانک ہی پوسال اسے اپنی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ ”کم آن ڈارلنگ“ اس نے بڑی بے تکلفی سے کاشمی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی طرف کھینچا۔

کاشمی کے لیے یہ کوئی غیر معیوب حرکت تھی، لیکن پوسال نے بڑے غلط وقت کا انتخاب کیا تھا۔ اور پھر..... ان نوجوانوں کے سامنے پہلی مرتبہ اسے اپنی ذلت کا احساس ہوا۔

”مسٹر پوسال پلیز! ابھی نہیں۔ مجھے اپنی ”آبزرویشن رپورٹ“ دینی ہے۔ آپ جانتے ہیں۔“ اس نے کسمسا پر پوسال سے الگ ہوتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا کیونکہ ابھی ان کے لورنوجوانوں کے درمیان فاصلہ زیادہ نہیں بڑھا تھا۔

”وٹ.....؟“ پوسال نے اچانک اسے جھٹکا دے کر اپنی طرف کھینچا اور اس کو بے بس کر دینے کی حد تک قایم کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ کاشمی کو اس کی آنکھوں میں خون اتار دکھائی دے رہا تھا۔

”مسٹر پوسال! سر! مجھے.....“

اس نے دوبارہ گہرا کر پٹی بات دہرائی چاہی۔

”میں جانتا ہوں۔ تجھے کیا کرتا ہے۔ اپنے پیار سے ملتا ہوگا۔ سالی! ہمارے ہوتے ہوئے ان مسلوں سے۔“

اس نے جانے کس کس کو کالیاں پکٹی شروع کر دیں۔ کاشمی کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے کانوں میں پھلکا ہوا سیسہ انڈیل دیا ہو۔ وہ جانتی تھی کہ پوسال کی بد باطنی نے طاہر کو خفیہ دشمن بنایا کراس کے سامنے کھڑا کر دیا ہے کیونکہ اس نے کاشمی اگر وال کا رویہ اس کے شخص کچھ بہتر دیکھ کر یہ رائے قائم کی تھی اور اب دنیا کی کوئی طاقت اس کی رائے نہیں بدل سکتی تھی۔

”آل رائٹ۔ مجھے اپنی ڈیوٹی کرنی ہے۔“

کاشمی نے ڈرتے ڈرتے اسے اسے اس کی جلی کیفیات کے تحت خود کو اس سے الگ کرنا چاہا۔ لیکن ان لحاظات میں جب ان کے درمیان کشش جاری تھی پوسال کی جہانم دیدہ اور مکار لگا ہوں نے کرل بھائی کو کمرے سے برآمد ہوتے دیکھ لیا تھا۔ ان حالات میں اس نے کاشمی اگر وال کو چھوڑ دینا ہی مناسب جانا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کرل بھائی کاشمی اگر وال کے لیے نرم گوشہ رکھتا ہے اور اس کا شمار بریگیڈئیر ملہوترا کے مخالف گروپ میں ہوتا ہے۔ پوسال بریگیڈئیر ملہوترا کا خاص آدمی سمجھا جاتا تھا۔

○ ○ ○

اس نے خون کے گھونٹ لی کر کاشمی کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا تھا، لیکن..... اس طرح ہاتھ آئے شکار کا اس کے پنجے کے نکل جانا اس کی آتش انتقام کو بھڑکانے کے لیے کافی تھا۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔ اس کے اندر موجود زہر تلخ پیرا ہو چکا تھا۔ جانوروں کا خون پینے والا کیپٹن پوسال اس وقت ڈر کیولا بن چکا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ جتنی جلدی ممکن ہو وہ کاشمی اگر وال کے خون سے اپنی ہوس کی پیاس بجھائے۔ اس کے لیے..... کچھ مشکل نہیں تھا۔ اسے تو ایسے شکار کا زیادہ مہرا آتا تھا۔

”ڈونٹ وری پے بی۔ (بے پی گز زکرو۔)“ اس نے پتھکارتے ہوئے کہا۔

اور.....

تیزی سے مڑ کر اپنے آفس کی طرف چل دیا۔

خوف اور غصے سے سبھی کاشمی اگر وال نوجوانوں کے تعاقب میں چل دی۔

زندگی میں طویل عرصے کے بعد اس کی آنکھوں میں نمی اترتی تھی۔ آج تک ایسا ہوا نہیں تھا۔ شاید بچپن یا دورانِ تعلیم وہ کبھی ایسی جذبائی کیفیت کی شکار رہی ہو۔ آج اسے پہلی بار شدت سے اپنے بے بسی کا احساس ہوا تھا۔ اسے یاد آ گیا جب وہ خوشی سے پھولے نہ مٹاتے ہوئے اپنے والدین کو ”را“ میں اپنی سلیکشن کی خبر دے رہی تھی تو پولیس انسپکٹر سورج اگروال کچھ بے چین سا دکھائی دینے لگا تھا۔

سورج اگروال اس کا باپ تھا لیکن..... دونوں کے درمیان باپ بیٹی سے زیادہ دوستی کا رشتہ تھا۔ جب اس نے اپنے باپ کو پہلی مرتبہ بتایا کہ وہ ”را“ کے لیے درخواست دینے جا رہی ہے تو سورج اگروال نے اس کے اس فیصلے پر خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ”بتاتی! آپ تو خود پولیس افسر ہیں پھر بھی.....“ اس نے حیرانی سے دریافت کیا تھا۔

”بیٹی میں پولیس افسر ہوں اسی لیے تمہارے اس فیصلے سے کچھ زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ تم پولیس میں کیوں اپلائی نہیں کرتی؟“ انہوں نے قدرے تشویش سے کہا۔

”بتاتی! آپ جانتے ہیں مجھے ایڈووکیٹس لائف گزارنے کا شوق ہے۔ میں ایک اٹلنی جنس آفیسر بن کر زیادہ خوشی محسوس کروں گی۔“ اس نے اپنے باپ کو بظاہر یہ بات کہہ کر مطمئن تو کر دیا تھا لیکن..... سورج اگروال کبھی مطمئن نہیں ہوا۔

اس نے بادل نواسی اپنی بیٹی کے فیصلے پر صاف دیا تھا۔

نوکری پر جانے کے پہلے ہی راز اس سے رازداری کا جو حلف لیا گیا تھا اس نے قانونی طور پر کاغذی کو پابند کر دیا تھا کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ اس مسئلے پر زیادہ بات نہ کرے۔ اس کے باپ کو کبھی اس بات کا علم تھا۔ جب کبھی اس کی کاغذی سے ملاقات ہوتی ”ایک فقرہ معمول کے مطابق ضرور کہہ کرتا:

”کیسی جا رہی ہے تمہاری سیکرٹ سروس؟“

”ایک دم شاندار بتاتی۔“ کاغذی کی طرف سے رازنا یا جواب ملتا۔ کاغذی اگروال نے ایک دوسرے سوچا کہ اگر وہ اپنے گھر والوں کو یہ بتائے کہ وہ اٹلنی جنس آفیسر کی حیثیت سے سوائے ایک دیشیا کے اور کوئی کام نہیں کر رہی تو شاید شرم سے اس کے ذہن دار والدین مر رہی نہ جائیں۔

اس نے کبھی انہیں اپنے کام کی نوعیت سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ البتہ مختلف شہروں میں

اپنے جادے کی خبر ضرور دے دیا کرتی تھی لیکن..... وہ بھی افسران کی اجازت سے۔

آج اسے زندگی میں پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس نے باپ کی بات نہ مان کر سخت غلطی کی ہے۔ ایسی غلطی جس کا فیازہ اب اسے مرتے دم تک بھگتنا ہو گا کیونکہ ایک مرتبہ ”را“ میں آنے والوں کے لیے وہ ایسی کا کوئی دروازہ کھلا نہیں رہتا۔

اور..... وہ اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ”را“ کی نظروں میں رہتے ہیں۔

ظاہر کے کمرے کے دروازے پر پہنچنے تک وہ قدرے ڈرل ہو چکی تھی۔

لیکن..... نہ جانے کیوں ظاہر کو وہ ڈرل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ کاغذی کے لیے اپنے دل میں کچھ ہمدردی کے جذبات محسوس کر رہا تھا۔ دوسرے تجزیہ کاروں کے برعکس اس نے کن اکبوں سے پولس کی بدتمیزی کا جائزہ لیا تھا اور اسے بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ سب کچھ اس کا کیا دھرا ہے۔

○ ○ ○

یہاں کی روایات کے مطابق یہاں کوئی بھی زیرِ تربیت تجزیہ کار کسی بھی واقعہ حادثہ کا ردوائی پر نہ تو تبصرہ کر سکتا تھا نہ ہی تجسس ظاہر کر سکتا تھا اور نہ ہی کسی بھی طرح اس میں دخل اندازی کر سکتا تھا۔ تجزیہ کاروں کی وفاداری کا اندازہ لگانے کے لیے اچانک ہی ان کی مفلوں میں سے کسی ایک تجزیہ کار کو انشورنگ کمپنیز کا کتا اور ان سب کے سامنے وحشیانہ انداز میں بغیر کوئی وجہ بتائے تشدد شروع کر دیتا۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ اس تشدد کی تاب نہ لا کر خودمختار مشق بننے والے کی موت واقع ہو جاتی۔

لیکن.....

کیا مجال جو اس کے کسی ساتھ کے کان پر جوں بھی رہتی تھی۔ وہاں موجود انشورنگ کمپنیوں بہانوں سے ان کی جذباتی، جسمانی اور نفسیاتی حرکات کا جائزہ لیتے رہتے۔ کسی بھی ایجنٹ کو اگر ایٹارل پاسے تو اس کو ایک بورڈ کے سامنے پیش کیا جاتا جو اس کا طویل انٹرویو لینے کے بعد اس کی قسمت کا فیصلہ کیا کرتا تھا۔

اچانک ہی ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح ظاہر کے ذہن پر پڑا۔ کیوں نہ کاغذی سے اظہار ہمدردی کر کے وہ اس کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کرے کیونکہ اپنے منصوبے

کے اگلے حصے میں انہیں کاٹنی اگر وال کی ہمدردی بہت کام دے سکتی تھی۔

کاٹنی جواب بظاہر بالکل ناراض تھی، اس نے ضرورت سے زیادہ مسکراتے ہوئے شاید اس لیے باتیں کر رہی تھی کہ کسی کو اس پر شک نہ گزرنے لگیں..... اس کے دلی جذبات کو ظاہر اچھی طرح سمجھتا تھا۔ ”آج شام کے بعد آپ کی ”ریکی“ کلاس ہوگی۔ تم تینوں میرے ساتھ ”ریکی“ کرو گے۔“ اس نے ظاہر اور اس کے دونوں ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”او۔ کے میڈم۔“ ظاہر کی سلیم نے جواب دیا جو شاید ظاہر کے منصوبے کو کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا۔ مشتاق جو بظاہر صورت حال سے لاتعلقی نظر آ رہا تھا۔

”شام تک آپ لوگ ریلیکس (آرام) کریں۔“

یہ کہہ کر کاٹنی نے کمرے میں رہنے والی دی کا ریوٹ کنٹرول تھام لیا اور تین چار انشٹین بدلنے کے بعد ایک ایسا انشٹین لگا دیا جہاں ان کے تن بدن میں آگ لگانے والی قسم چل رہی تھی۔

”انجوائے یور سیلف۔“

اس نے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا اور مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔

باہر نکلنے ہی دو دو بار وہ اسی کیفیت کا شکار دکھائی دینے لگی، جس سے کچھ دیر پہلے تک گزر رہی تھی۔ پھر سوال اپنی تمام حرام کاریوں سمیت اس کے دل و دماغ میں جیسے کسی بدروح کی طرح سما چکا تھا۔

بار بار اس کا تصور ذہن سے جھٹکنے کے باوجود پھر سوال کے آسب سے نجات حاصل نہ کر سکی تھی۔ اس کے ذہن میں آٹھ مایاں چل رہی تھیں۔ کسی نہ کسی طرح وہ اپنے کمرے تک پہنچی اور اسے اندر سے تالا لگا کر بستر پر ڈھیر ہو گئی۔ سچ اس نے کمرے ہی میں منگوایا تھا اور تھوڑا بہت زہر مار کر بستر پر لیٹ گئی۔

کروٹیں بدلنے سے تھوڑی سی اونگھ آ گئی۔ کاٹنی کی آنکھوں کی تھکنی بجنے کی آواز پر کھلی تھی۔ اس نے ہڑبڑا کر فون اٹھایا۔

”کیٹ اپ لیڈی۔“ دوسری طرف کرنل بھالہ موجود تھا۔

”اوہ سو ری۔ سر۔“

اس نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ یہ تو چائے کا وقفہ تھا۔ اسے ان لڑکوں کے ساتھ بیٹھ کر چائے پینی تھی۔

”ایکسیکری می سر۔ ابھی جاتی ہوں۔“ اس نے فون پر کہا اور فون رکھ کر ہاتھ روک دم کارخ کیا۔

بیشکل پانچ منٹ بعد وہ ظاہر کے کمرے کے سامنے موجود تھی، جس کے باہر ایک ویٹر ٹرائی میں چائے کے برتن لگائے کھڑا تھا۔ کم آن“ اس نے کمرے کے دروازے پر لگا ٹیل بٹن دبا کر اندرونیوں کو خبردار کیا اور ویٹر سیت کمرے میں داخل ہو گئی۔

”ویل کم میڈم۔“ ظاہر نے اس کی شکل پر نظر پڑنے ہی دانت نکال دیے۔

”کیسے ہو بھی آپ لوگ..... تھک تو نہیں گئے؟ ابھی ”ریکی“ پر جانا ہے۔ یہ پندرہ کلوی میٹر پہاڑی راستہ ہے۔ اچھی طرح اپنے معدے بھر لیتا۔“

اسی نے ویٹر کو اشارہ کیا جس نے چائے اور سٹیکس کمرے کے ایک کونے میں دھرے نیز پر رکھ دیئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ چاروں چائے پی رہے تھے۔ اس دوران یہاں کے معمول کے مطابق کاٹنی اگر وال نے ان سے کچے بعد دیگرے سوالات کرنے شروع کر دیئے تھے۔

وہ بڑے نامحسوس انداز میں ان کی اندرونی کیفیات نوٹ کر رہی تھی۔ اس وقت وہ مکمل پروفیشنل تھی۔

چائے سے فراغت کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”او۔ کے گائیز۔ دس منٹ بعد ہم چل رہے ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔

اس کی دوسری ساتھی ریکسا ساتھ والے کمرے کے نو جوانوں کے ساتھ مصروف تھی۔ وہ بھی باہر آگئی اور دونوں برآمدے کے ایک کونے میں کھڑی ہو کر باتیں کرنے لگیں۔ دونوں کا تعلق چونکہ ایک ہی ایجنسی سے تھا اور اکثر و بیشتر انہیں ایسے ہی فرائض انجام دینے پڑتے تھے اس لیے ان میں گاڑمی چھنی تھی۔

ریکسا نے آج پہلی مرتبہ اپنی سبیلی اور عزیز از جان دوست کاٹنی کو پریشان دیکھا تھا۔ لیکن کیا محال جو اس نے ریکسا کے کسی بھی ایسے سوال کو جواب دیا جو بعد میں اس کے لیے پشیمانی کا

باعث بنے۔

دیکھا سمجھتی تھی کہ کاشی کبھی اسے حقیقت حال سے باخبر نہیں کرے گی۔ یہ ان کی تربیت تھی۔ انہیں ایک دوسرے سے کبھی اپنے دل کا حال چھپانا تھا۔ بصورت دیگر دونوں میں سے جو بھی پہلے دوسری کے خلاف رپورٹ فائل کرتی وہ سچ جاتی اور دوسری کی کم ہمتی آ جاتی۔

بہر حال دیکھا کو یہ سمجھ تو آ گئی تھی کہ دل میں کچھ کالا سرور ہے۔ دس منٹ ہو گئے تھے اور اب وہ دوبارہ دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ طاہر مشتاق اور سلیم تیار تھے۔ تینوں اس کے تعاقب میں چلتے باہر آ گئے۔

گیٹ تک کا سفر انہوں نے پیدل طے کیا تھا اور گیٹ کے باہر پارکنگ ایریا میں موجود بچوں میں سے ایک پر اب وہ سوار ہو رہے تھے۔ اس جیب کو کاشی اگر وال چلا رہی تھی۔

پندرہ منٹ کی طوقانی ڈرائیونگ کے بعد وہ مسوری کی طرف جانے والی ایک شاہراہ سے منجھ اتر رہے تھے۔ یہاں رک کر کاشی نے جیب کے ڈیش بورڈ سے ایک نقشہ نکالا اور اسے باہر نکل کر جیب کے پونٹ پر پھینکا دیا۔ اس نے تینوں کو اس نقشے کی مدد سے جنگل کے اندر موجود جھبیاں سے آگاہ کیا اور بتایا کہ انہیں یہ دس کلومیٹر کا فاصلہ اندر موجود ”واج ٹاورز“ سے سچ کر طے کرنا ہے اور کس مقام پر اکٹھے ہونا ہے۔

دھم رخصت اس نے تینوں کو ایک ایک وائی ٹاکی دیا تھا۔

”اس کی ریٹ دس کلومیٹر تک ہے اور فریکوئنسی سیٹ ہے۔ لیکن اسے تم میں سے کوئی استعمال نہیں کرے گا۔ اسے صرف اس وقت استعمال کرنا ہے جب آپ میں سے کسی کو ”سے ڈے“ پیغام دینا ہو۔ اسے باہر نکلنے کا راستہ نڈل رہا ہو۔ یہ سرخ نشان دہانے پر تہہاری ڈائریکشن میں سیٹ پر آ جائے گی۔ ہڈنگ لگے۔ سٹارٹ۔“ اس نے اچانک ہی مشتاق اور سلیم کو الگ الگ سمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا۔

طاہر نے چاہا کہ تیسری سمت بڑھے لیکن..... اچانک زمین نے اس کے قدم تھام لیے۔ ”تم غلط ہو۔“ اس نے آخر میں روانگی سے چند لمبے پہلے طاہر سے کہا اور وہ رک گیا۔ ”لیں ہم۔“ اس کے لیے تو موبائی کی کے ہمارے جھپکا ٹونا تھا۔

”تم میرے ساتھ آؤ۔ لیکن صرف آج۔ کیونکہ تم پہلی مرتبہ کسی کمپ میں آئے ہو۔ وہ

دونوں تربیت یافتہ ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی اور اس نے طاہر کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں تقریباً پانچ منٹ تک خاموشی سے چلتے رہے۔ نہانے کیوں شدید خواہش کے باوجود کاشی اسے ابھی تک کرینے کے لیے کوئی ڈھنگ کے الفاظ نہیں دھونڈ پا رہی تھی۔

”تم کمال کے کھلاڑی ہو مارشل آرٹس کے۔“

اس نے تمہید باغیٹے کے لیے یہی فقرہ کہنا چاہا لیکن..... طاہر نے اس کی بات کاٹ

دی۔

”میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ میں نے یہ سب کچھ لگن اور جذبہ انتقام سے سیکھا

ہے۔“

”لیکن کیوں؟ تمہیں کس سے انتقام لینا ہے؟“

کاشی نے اچانک ہی رک کر اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ یہ کچھ تھا طاہر کے لیے کہ اس کی آنکھوں کے راستے دل میں اتر جانے کا۔ اسے اب اپنی بہترین اداکارانہ صلاحیتوں کا امتحان دینا تھا۔

”میڈم مجھے اپنی عمر میں ان انتقام سارے زمانے سے لینا ہے۔“

اس نے بڑے سمیر لہجے میں کہا۔

”لیکن اس کا یہ طریقہ کیا تمہارے نزدیک صحیح ہے؟“

اچانک ہی کاشی نے پوچھ لیا۔

”ہاں۔“ طاہر نے اعتماد سے جواب دیا۔

کاشی اچانک ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ کسی الجھن کا شکار دکھائی دے رہی تھی۔ اس لمبے

طاہر نے اس پر نفسیاتی حملہ کر دیا۔

”میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ آپ کو میری وجہ سے بہت زحمت ہوئی۔“

اس نے اچانک کاشی اگر وال کے بہت نزدیک ہو کر یہ بات کہہ دی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

کاشی کچھ گھبراہٹ ہوئی۔

”دیکھئے میڈم! میں کوئی بہت اچھا انسان نہیں ہوں! لیکن شاید آپ کو یقین نہ آئے میں اضطرورت کے تحت بھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اور آپ کے سامنے تو بول ہی نہیں سکتا۔ میں نے آج تک زندگی کا ایک ہی روپ دیکھا تھا۔ نفرت کا روپ۔ یا تو سانج نے مجھ سے نفرت کی یا پھر میں نے سانج سے۔ میں نے نفرت کی کوکھ سے جنم لیا۔ اسی ماحول میں پلا بڑھا۔ جہاں ہوا اور شاید اسی میں مر جاؤں۔ میری زندگی میں درجنوں عورتیں آئیں اور گئیں۔ میں نے انٹر میڈیٹ ڈرگ سسٹم کی ہے۔ بہت خوبصورت عورتوں سے میرا تعلق رہا ہے لیکن صرف جسمانی تعلقات کی حد تک۔ میڈم مجھے علم نہیں کہ اس بات کا نتیجہ کیا نکلے گا، ممکن ہے مجھے جان سے بھی ہاتھ دھوئے پڑیں لیکن مجھے آپ سے یہ بات کہنی ہے کہ پہلے ہی روز آپ کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد سے میری اپنی کیفیت بدلنے لگی ہے۔ میں اپنے آپ میں بے بس سا ہو گیا ہوں۔ اگر آج میں آپ سے یہ بات نہ کہتا تو شاید اس مٹھن کے ہاتھوں میں مر جاتا۔ میڈم! آج جب اسٹرکٹر صاحب آپ کے ساتھ بدتمیزی کر رہے تھے تو میں نے خود پر بہت جبر کیا۔ بہت جبر کیا۔ میرا ہی چاہتا تھا۔“

اس کی آواز ہلکا سا تھکا ہوا لگتی تھی۔ ”میں نے اس کی آنکھیں میچک گئیں۔

”مم..... مجھے معاف کر دیں۔“ اس نے بے بسی کی شاندار ادکاری کرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ کاشی کے سامنے بلند کر دیے۔

تیسرین نشانے پر لگا تھا۔ گو کہ اس نے اندھیرے ہی میں چلایا تھا۔ کاشی پر تو جیسے سکھ طاری ہو گیا۔ جیسے کسی نے جادو بڑھ کر اسے زمین میں گاڑ دیا ہو۔ زندگی میں پہلی مرتبہ کسی نے اسے اس نظر سے اس انداز سے دیکھا تھا۔ ظاہر نے جو کچھ بڑی سادگی سے کہہ دیا تھا اس نے کاشی کے دل میں پھیل چادی تھی۔

”فارگاڈ میک۔“ اس نے اپنے سیکپائے ہاتھوں میں ظاہر کے دونوں ہاتھ پکڑ کر انہیں اگایا۔

”بھگوان کے لئے تم جو کوئی بھی ہو دوبارہ یہ بات کہی نہ کہنا۔ تم جانتے ہو اس کا مطلب کیا ہو گا؟ تم جانتے ہو۔“ کاشی نے اسے قریباً جھجھوڑ دیا۔

”ہاں مں کاشی اگر وال۔ جانتا ہوں۔ تم ہی مجھے گولی مار دو گی۔ لو مارو! لیکن تم اپنے اوپر قتل کا الزام بھی کیوں لو۔ مجھے کہو میں ابھی اس چٹان سے نیچے کود جاتا ہوں۔ اگر میری کسی بات

سے آپ کو دکھ ہوا ہے تو پھر میں شاید خود بھی جی نہ پاؤں۔ میں نے کہا ناں۔ اس جذبے نے مجھے مار ڈالا ہے۔ دو ہی راتوں میں مجھے۔“

اس نے اپنی بات اور سی چھوڑ کر پھر بسوے۔ بھانے شروع کر دیئے۔ کاشی اگر وال کو یوں لگا جیسے کیڑہ مہاراج نے تاک کر نشانہ لگاتے ہوئے صحت کا بھالا اس کے پیچھے میں اتار دیا ہو۔

”ظاہر! بھگوان کے لئے نازل ہو جاؤ۔ ہم پھر کبھی بات کریں گے، لیکن اگر تم میرے متعلق کوئی بھی ہمدردی رکھتے ہو تو یاد رکھنا، اگر کبھی اس بات کی بھٹک بھی کسی کے کانوں میں پڑ گئی۔ اگر تمہاری کسی بھی حرکت سے کسی کوئی غیر معمولی پن دکھائی پڑا تو تمہارے ساتھ مجھے بھی اپنی جان سے ہاتھ دھوئے پڑیں گے۔“

اس کی آواز واقعی بھرا گئی۔

”ایسا کبھی نہیں ہو گا کاشی۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ ایسا مت کہیں۔ مت سوچیں ایسا۔ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو خدا کی قسم میں سارے جہان کو آگ لگا دوں گا۔“

یہ کہہ کر اس نے ظاہر بے اختیار ہو کر قدیم کاشٹوں کے سے انداز میں گھٹنا زمین پر ٹکا کر کاشی کا ہاتھ تمام لیا۔

”اوہ۔ ظاہر بس کرو۔ میں مر جاؤں گی۔ او۔ کے۔ آؤ چلتے ہیں۔“

اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ الگ کرتے ہوئے اسے چلنے کا اشارہ کیا۔ ظاہر کا دل خوشی کے مارے بیوں اچھل رہا تھا۔ اسے شاندار اور ناقابل یقین کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ دل ہی دل میں اپنی شاندار ادکاری پر اس نے خود اپنے آپ کو داد دی اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

دونوں نے ساتھ آٹھ منٹ تک یہ مشکل راستہ خاموشی سے اور بات کیے بغیر طے کیا۔ کاشی کو یوں لگ رہا تھا جیسے اب مرتے سے تک اس کے دل کی دھڑکنیں بھی نازل نہیں ہوں گی۔

یہ دشوار گزار راستہ تھا لیکن..... اس کا دیکھا بھالا اس سے پہلے دو گروپ اس کے ہاتھوں تربیت مکمل کر کے جا چکے تھے۔ معمول کے مطابق وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھ رہی تھی جب اچانک اس کا پاؤں پھسل گیا اور اس سے پہلے کہ وہ سر کے بل نیچے سٹکروٹ فٹ گر کر کھائی میں جا کرے پہلی کی سی پھرتی سے آگے بڑھ کر ظاہر نے اسے پکڑ لیا۔ کاشی اس کے بازوؤں میں بھول

مہی۔

○ ○ ○

اس کے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے سینے کا بیجرہ توڑ کر سن کا بیجھی اڑ جائے گا۔ کاشی گڑ بڑا کر رہ گئی۔

ابھی تک اس کے حواس بحال نہیں ہوئے تھے۔ لیکن..... اگلے ہی لمحے وہ نارمل ہو گئی اور اس نے سب سے پہلے ”تھینک یو“ کہہ کر آہستگی سے خود کو طاہر سے الگ کیا اور وہیں ایک پتھر پر بیٹھ کر اپنے سانس اور دھڑکنیں نارمل کرنے لگی۔

”آپ تھینک تو ہیں ناں۔“ طاہر نے بے ساختہ پوچھا۔ اس اچانک حادثے کا اس نے بھی کبہ اثر قبول کیا تھا۔

”تم..... تم کیا ہو؟“ کاشی اگر دال نے اس کے سوال کا جواب اچھے ہوئے لہجے میں سوال ہی کی صورت میں دیا تھا۔

”اس پر پھر کبھی بات کر لیں گے۔ ابھی آپ چلیں۔ ہم اپنا راز مدھل کر لیں۔“ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

کاشی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بڑی ابھی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اسے خود کچھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے آفر کیا ہو گیا۔ زندگی میں اس نے خود کو کبھی اتنا کمزور محسوس نہیں کیا تھا۔ اس لڑکے نے نجانے اس پر کون سا جادو پڑھ کر چوبک دیا تھا۔

دونوں خاموشی سے چل رہے تھے۔ تربیت کے مطابق یہاں انہیں مختلف رکاوٹیں عبور کر کے اپنے ”مارگٹ ایریا“ میں پہنچنا اور پھر واپس آنا تھا اور یہ معمول کی پریکٹس تھی۔ اس درمیان بطور انسٹرکشن کاشی نے ان کی غلطیاں نوٹ کر کے انہیں بچ لکھنے کی تہنیک بتائی تھیں۔ لیکن..... ابھی تک وہ خود غلطیاں کرتے چلی جا رہی تھی۔ طاہر نے اسے بے بس کر دیا تھا۔

”ایک بات پوچھوں طاہر۔“

اس نے اچانک ہی ایک جگہ رک کر طاہر کی آنکھوں میں جھانکا جہاں سوائے معصومیت کے اور کچھ اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کیونکہ طاہر نے اس دوران اپنا چہرہ مستقل مانگنے والوں جیسا

بنارکھا تھا۔

”پوچھیں۔ اس میں اجازت لینے والی کیا بات ہے۔“

طاہر نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”تم کون ہو؟“

اچانک ہی کاشی اگر دال اس کی طرف مگوم گئی۔

”میں..... کاش کاشی جی مجھے علم ہوتا کہ میں کون ہوں۔ آپ یقین چاہیں مجھے آج

تک اپنے آپ سے اس سوال کا جواب نہیں ملا۔“

اس نے سنبھل کر قلقلیانہ انداز اختیار کیا۔ حالانکہ کاشی کے اس سوال پر ایک بار تو اس

کا دل بھی دھک سے رہ گیا تھا۔

”گویا تم بتانا نہیں چاہتے۔“

کاشی نے کھڑے کھڑے کہا۔

”میں نے ایسا نہیں کہا۔“

طاہر نے جواب دیا۔

”طاہر کیا تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔“

کاشی نے براہ راست سوال کر کے اسے بظاہر یوگھلا دینا چاہا۔

”ہاں۔ میں ایمانداری سے کہہ رہا ہوں۔“

طاہر نے بڑھتا ہوا لہجہ اختیار کیا تھا۔

”تم جانتے ہو..... میں کون ہوں اور تم کون ہو۔“

کاشی نے اب چنانچہ شروع کر دیا تھا۔

”ہاں۔ مجھے علم ہے۔ لیکن اس وقت ہم دونوں ایک ہی کشی کے سوار ہیں۔ جس دیش

سے آپ کی وقاداری ہے۔ میں نے اس کی ملازمت اختیار کر لی ہے۔ اسی کے لیے کام کر رہا

ہوں۔“

طاہر نے اپنی دانست میں اسے مطمئن کرنا چاہا تھا۔

”طاہر تمہیں یقین ہے کہ تم جی بول رہے ہو۔“

کاشمی نے یہ بات اس کی طرف دیکھتے بغیر کہی تھی، لیکن طاہر کو لرزاکر رکھ دیا تھا۔

”کاشمی جی۔ میں جی بول رہا ہوں یا جھوٹ۔ اس کا فیصلہ شاید ابھی نہ ہو سکے لیکن جلدی ہو جائے گا۔ مجھے آپ سے صرف یہ کہنا ہے کہ جان بوجھ کر مرنے کا شوق کسی کو نہیں ہوتا۔ کم از کم میں اتنی جلدی مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے اپنے کئی قرض لوٹانے ہیں۔ مجھے علم ہے آپ اگر چاہیں تو مجھے ابھی گولی سے اڑا سکتی ہیں۔ آپ کو اس کا اختیار حاصل ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ آپ میری بات مانتیں تو میں شاید اپنا مقصد بھی حاصل نہیں کر پاؤں گا۔ نہ مانتیں تو بھی دونوں صورتوں میں میری موت ہے۔ لیکن میں نے کہا ناں کہ میں اس جذبے کے ہاتھوں بے بس ہو کر آپ کے سامنے اقرار کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ اب میں اطمینان سے مر سکوں گا۔ اگر اس سے پہلے مر جاتا تو مرنے کے بعد بھی پچھتاوا لگا رہتا۔“

وہ چلتے چلتے اس طرح کاشمی اگر وال کے سامنے آ چکا تھا کہ وہ آگے نہیں جا سکتی تھی۔
”اوہ بھگوان۔“

کاشمی نے بے ساختہ کہا اور طاہر کے روئیں روئیں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ کاشمی کو درغلانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔
”آؤ چلیں۔“

کاشمی نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ دونوں نے اپنی ”ریبی“ مکمل کرنے تک کوئی بات نہیں کی تھی۔ اب وہ ”فنشک پوائنٹ“ کے نزدیک پہنچ چکی تھی۔

”طاہر ایک درخواست کر رہی ہوں۔ اپنا اور میرا خیال رکھنا۔ اگر تمہاری غلطی سے تمہیں کچھ ہو گیا تو شاید میں خود کو زندگی بھر معاف نہ کر پاؤں۔“
اچانک ہی کاشمی رک گئی تھی۔

”تم اب دوسری طرف سے پتھر کاٹ کر پہنچو۔ کسی کو یہ احساس نہیں ہوتا چاہیے کہ ہم دونوں اکٹھے تھے۔ بہت احتیاط کرتا۔ یہ ہم دونوں کے لیے بہتر ہے۔“

اس نے اٹھی سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے طاہر کو راستہ دکھایا۔

”آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“

”تم جانتے ہو ایسے سوالوں کے جواب نہیں ہوا کرتے۔“

یہ کہہ کر کاشمی اگر وال اس کی اگلی بات سے بغیر آگے بڑھ گئی۔

○ ○ ○

طاہر نے سکھ کا لباس سنا لیا۔ ابھی تک وہ کامیاب جا رہا تھا۔ وہ مطمئن تھا۔ اب کاشمی اگر وال بچ کر نہیں جا سکتی تھی۔ اسے علم تھا کہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ مشرق کی ہر عورت ایک جیسی ہی ہوتی ہے اور..... آج اسے اس بات کا ثبوت بھی مل گیا تھا۔

اگلے پندرہ منٹ کے بعد جب وہ مقررہ ہدف پر پہنچا تو کاشمی سلیم اور مشتاق کے ساتھ وہاں موجود تھی۔

”تم تین منٹ لیٹ ہو مسٹر۔“ اس نے جان بوجھ کر قدرے سخت لہجے میں طاہر سے

کہا۔

”آئی ایم سوری میڈم۔“

طاہر نے بھی سعادت مند شاگردوں کی طرح جواب دیا۔

”سوری سے کام نہیں چلے گا۔ اس بڑس میں ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔ ایک ایک

لمحہ..... تم جانتے ہو ایک منٹ کی غفلت سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ میں ممکن ہے وہ ہم جو تم کسی اور کے لیے لگا رہے ہو تمہارے ہاتھ میں پھٹ جائے۔ لیکن ممکن ہے ٹائمنگ کی معمولی سی غلطی تمہارے سارے کیسے کمرائے پر پانی پھیر دے۔“ کاشمی نے جان بوجھ کر قدرے رشت لہجے میں کہا۔

”معافی چاہتا ہوں میڈم۔“ طاہر نے معذرت کی۔

”او۔ کے۔ آؤ چلیں۔ باقی باتیں کمپ میں جا کر ہوں گی۔“

اس نے تینوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

کمپ پہنچنے تک طاہر جان بوجھ کر منہ لٹکائے بیٹھا رہا۔ اسے مشتاق کے متعلق کوئی غلط فہمی یا خوش فہمی نہیں تھی۔ اس لیے وہ اس پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ سلیم نے اس کے رویے کا نوٹس لیا، لیکن طاہر نے اسے آنکھ کے مخصوص اشارے سے سب کچھ بتا دیا تھا۔

رہنے کا اشارہ کرنے کے بعد اس کے کان کے نزدیک اپنا منہ لے جا کر سرگوشی کے انداز میں اس سے کہا کہ وہ مشتاق کے تعاقب میں باہر جا رہا ہے۔

سلیم یہ نہیں چاہتا تھا کیونکہ دوسرے ہی لمحے صورت حال اس کی سمجھ میں آگئی تھی اور وہ جان گیا تھا کہ واقعی مشتاق کو ان کی جاسوسی کے لیے ان کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ یقیناً ممکن ہے وہ کوئی خفیہ رپورٹ ہی ان سے متعلق دینے گیا ہو۔ سلیم کو اس بات کا اطمینان تھا کہ ابھی تک ان کی طرف سے دانستہ یا نادانستہ طور پر کوئی ایسی غلطی سرزد نہیں ہوئی جس کو بنیاد بنا کر ان پر شک کا اظہار کیا جاسکے اور مشتاق کے پاس کہنے کے لیے اور کیا ہو سکتا تھا۔

یقین.....

طاہر کی سوچ مختلف تھی۔ نبجانے کیوں اسے اس بات کا شک ہو رہا تھا کہ اس نے جو رشتہ برقی اپنی انٹرکمر کا شی اگر وال سے ملے کر دیا ہے وہ اس موزی کے طم میں آچکا ہے یا پھر اسے کوئی شک پیدا ہو چکا ہے۔

اگر اس نے اپنا شک اپنے مالکان کی طرف منتقل کر دیا تو شاید کا شی اگر وال سے وہ کام نہ لے پائیں جس کے لیے اس نے اتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ سلیم اور طاہر دونوں نے یہاں آنے کے فوراً بعد ہی یہ رائے قائم کر لی تھی کہ انہیں اگر کوئی مقامی مدد میسر آ جائے تو کام آسان ہو سکتا ہے۔

کام تو انہیں بہر حال کرنا ہی تھا خواہ اس کے لیے ان کی جان ہی کیوں نہ چلی جاتی کیونکہ ایک مرتبہ اپنے ملک و قوم کی برپادی کا سامان کرنے والوں کو دیکھنے کے بعد ان کے لیے یہ ممکن ہی نہیں رہا تھا کہ انہیں چھوڑ دیں۔

انہیں بڑا ری کسپ تباہ کرنا تھا خواہ اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑتی۔ اور..... نبجانے مشتاق کیا گل کھلا دے۔

اس کے عزائم سے باخبر نہ بننے کے لیے ہی طاہر نے اس کے تعاقب کا فیصلہ کیا تھا اور اب وہ بھی اسی طرح بچوں کے مل چلا ہوا دروازے تک پہنچ گیا تھا۔

مشتاق کے کمرے سے نکلنے کے بعد شکل و صورت بعد ہی اس نے دروازہ اس طرح بغیر آواز نکالے کھولا اور گردن باہر نکال دی۔

شام ڈھل رہی تھی جب وہ اپنے کمرے میں پہنچے۔ کا شی ان کے کمرے میں ہی آگئی تھی جہاں اس نے تینوں کے لئے چائے طلب کی تھی اور اب باری باری ان سے رہی سے متعلق سوالات کر رہی تھی۔

قریباً آدھ گھنٹہ ان کے ساتھ گزارنے کے بعد وہ انہیں اگلے روز تک کے لیے الوداع کہہ کر چلی گئی۔

رات ڈھل رہی تھی۔

تینوں اپنے اپنے بستر میں آرام کی نیند سو رہے تھے جب اچانک طاہر کی آنکھ کھل گئی اور اس نے دیکھا کہ مشتاق اپنے بستر پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا۔ شاید وہ ان دونوں سے متعلق مطمئن ہو رہا تھا کہ وہ گہری نیند سو رہے ہیں۔ طاہر نے کروٹ لیٹا بھی مناسب نہ جانا اور اسی ایکشن میں لیٹا رہا۔

مشتاق اس اطمینان کے بعد کہ وہ دونوں گہری نیند سو چکے ہیں اٹھ کر کمرہ ہوا گیا۔ اب وہ بچوں کے بل بلی کی طرح بغیر آواز پیدا کئے چلا ہوا دروازے کی طرف جا رہا تھا پھر طاہر کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے آواز پیدا کئے بغیر دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔

طاہر نے ایک لمحہ توقف کیے بغیر اپنے ساتھ ہی دوسرے چنگ پر لیٹے ہوئے سلیم کو بیدار کیا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے منہ سے کوئی بات کہے۔ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر خاموش

ظاہر کو ظلم تھا کہ یہاں رہائشی بلاگوں میں رات کو پہرے دار نہیں ہوتے البتہ میں گیت اور دیواروں کے ساتھ ضرور بڑا سخت پہرہ ہوتا ہے۔ باہر کچھ فاصلے پر چلنے والے بلب کی ہلکی روشنی میں اس نے مشتاق کی آخری جھلک اس وقت دیکھی جب وہ بائیں ہاتھ ان کے ساتھ والے کمرے کے دوسری طرف گھوم رہا تھا۔ ظاہر نے اپنی پشت پر کمرے سلیم کی طرف دیکھا جو اس اثنا میں اٹھ کر وہاں آ گیا تھا۔

اس نے سلیم کو اشارے سے اپنا پلان بتایا اس کی طرف سے اثبات میں جواب ملنے پر آٹھ بڑھ گیا۔

مشتاق سے دگنی رفتار کے ساتھ وہ بلاک کے کارندہ والے اس کمرے تک پہنچ چکا تھا جس کے بعد مشتاق اس بلاک کی پشت پر پہنچ گیا جہاں قدرے اندھیرا تھا، کیونکہ اس سے آگے گھنے درختوں اور سرکنڈوں کا سلسلہ تھا جہاں انہیں تربیت دی جانی تھی۔

مشتاق درختوں کے اس پہنڈے کے پاس پہنچ کر رک گیا اور اب وہ شاید کسی کا منتظر تھا۔ ظاہر کے لیے بڑی عجیب پجوایشن بن گئی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے ہلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اسے ابھی یہاں ایک بلر کے ساتھ چپک کر ہی صورت حال کا جائزہ لینا تھا۔

اچانک وہ چونکا جب اسے درختوں کے پہنڈے سے کوئی اس طرف آتا دکھائی دیا۔ آنے والے کے نقوش واضح نہیں تھے، لیکن اس کی چال ڈھال سے ظاہر کو یقین تھا کہ وہ انٹرکڑ پوسال کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اب وہ صورت حال کو اچھی طرح جاننے لگا تھا لیکن اس کی خواہش ضرور تھی کہ وہ ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن سکے۔

پوسال نے اس کی نظروں کے سامنے مشتاق سے مصافحہ کیا اور دونوں وہیں ایک پتھر کی بچ پر بیٹھ گئے۔ ان کی پوزیشن اب ایسی تھی کہ ان کے اور ظاہر کے درمیان ایک بار جس کے پیچھے ظاہر بچھا ہوا تھا اور اس کے بعد ایک بڑے درخت کا تاجا حاصل تھا اور اس کے بعد وہ پتھر کا بچ تھا جس پر دونوں بیٹھے بائیں کر رہے تھے۔

ظاہر نے چند سینکڑ بعد ہی خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے لیے جاننا ضروری تھا کہ مشتاق پوسال تک کیا اطلاع منتقل کر رہا ہے کیونکہ ان کے مستقبل کی ساری منصوبہ بندی کا انحصار اس پر تھا۔

انتہائی احتیاط کے ساتھ اور دل ہی دل میں قرآنی آیات کا ورد کرتے ہوئے وہ کوئی آہٹ پیدا کئے بغیر آخر درخت کے پیچھے پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

اب اس نے اپنے کان دونوں کی طرف لگا رکھے تھے۔ یہاں گفتگو واضح تو سنائی نہیں دے رہی تھی، لیکن کسی حد تک ان کی بات سمجھ آ جاتی تھی۔ مشتاق کی آواز آ رہی تھی جو پوسال سے کہہ رہا تھا۔

”سردوؤں کے درمیان کوئی پتھر ہے ضرور، لیکن..... دونوں بڑے چالاک ہیں۔ ابھی تک انہوں نے کوئی ثبوت نہیں دیا۔“

”الو کے پٹھے مجھے ثبوت چاہیے۔ ثبوت۔ اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھو۔ جنہیں ان دونوں کے درمیان اس لیے نہیں چھوڑا گیا کہ تم صرف شک کرتے پھرو۔“ پوسال کی ڈانٹ قدرے واضح تھی۔

”سر میں بالکل چمکنا ہوں۔ ان کی کوئی حرکت مجھ سے چھپی نہیں رہ سکتی۔ میں نے دونوں کی گفتگو سے اندازہ قائم کر لیا ہے۔ آپ بالکل مطمئن رہیں۔ میری نظروں سے وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اوجھل نہیں ہو سکتے۔“

مشتاق نے پالیڈی کا منظرہ کیا۔

”دیکھو تم کسی بھی طرح ان دونوں میں سے کسی ایک کو اعتماد میں لے کر یہ جاننے کی کوشش کرو کہ کاشی اور اس لوہڑے کے درمیان کیا تعلق ہے اور وہ دونوں کس حد تک جا بچکے ہیں.....“

پوسال نے کہا۔

”ایسا ہی ہو گا سر۔ میں ایسا ہی سوچ رہا تھا۔ میں آپ کو پھر یقین دلاتا ہوں سر کہ دونوں کی کوئی حرکت مجھ سے چھپ نہیں سکتی۔ میں نے پاکستان سے یہاں تک ان کی کسی حرکت کو نظر انداز نہیں کیا۔“ مشتاق نے پھر اپنی بات دہرائی۔

○ ○ ○

ظاہر کے لیے یہاں مزید کرنا بے کار تھا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ابھی اس موذی نے صرف شک ہی ظاہر کیا تھا اور کوئی بات نہیں کی۔ وہ جانتا تھا اپنی طرف سے کوئی بھی من گھڑت کہانی سناتا دیتا اور پوسال اس پر یقین کر لیتا جس کے بعد ممکن ہے ان کے لیے لاغفل سانس پیدا ہو

جاتے۔

اس سے پہلے کہ مشتاق کی باتوں کا سلسلہ ختم ہوا اس نے کمرے میں واپس پہنچنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مشتاق اس سے پہلے کمرے میں پہنچ جائے۔ پہلی کی طرح اپنے سانس کی آواز سے بھی ہوشیار ظاہر اپنے بچوں پر چلا دوبارہ اس ہلکے پلنگا جس کے پیچھے وہ کچھ دیر پہلے تک موجود تھا۔

یہاں آ کر اس نے خود کو مارل کیا۔ اپنی بے قابو دھڑکنوں کو سنبھالا اور دوبارہ جس طرح دبے پاؤں آیا تھا واپس اپنے کمرے تک پہنچ گیا۔

سلم شاہ دروازے سے لگا ابھی تک اس کا شہر تھا۔ اس نے بلب کی ہلکی روشنی میں اپنے ساتھی کا ہیولا پہنچاتے ہوئے اس کے لیے دروازہ کھول دیا اور دونوں دوسرے ہی لمبے اپنے اپنے بستر میں منتقل ہو گئے۔

سلم نے کسی بھی ہنگامی صورت حال کا مقابلہ کرنے کی تیاری کر رکھی تھی۔ جس میں مقدمہ پڑنے پر یہاں سے فرار بھی شامل تھا۔ لیکن..... ظاہر کی طرف سے مطمئن رہنے کا اشارہ پاکر اس نے سکون کا سانس لیا۔ دروازہ انہوں نے اسی پوزیشن میں چھوڑ دیا تھا جس میں مشتاق اسے چھوڑ کر گیا تھا۔

ظاہر نے چار پائی پر بیٹھنے کے بعد اسے سرکشی میں بتایا کہ مشتاق کیمپن پوسٹال کو رپورٹ کرنے گیا تھا لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ باقی باتیں انہوں نے صبح کے لیے چھوڑی دی تھیں اور اب وہ پہلے کی طرح ”گہری نیند“ کے حے کر لوٹ رہے تھے۔

چند منٹ بعد مشتاق بھی آ گیا۔ اس کی دانست میں یہاں ”سب اچھا“ ہی تھا۔ اپنی دانست میں اس نے بڑی احتیاط سے دروازہ بند کیا اور پہلے کی طرح اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔

○ ○ ○

پوسٹال کے لیے یہ اطلاع ایک دھماکے کے مترادف تھی۔ گو کہ اس کے تجربے کوئی حتمی بات نہیں کی لیکن پوسٹال جونی تھا۔ اس نے خود ہی ایک مفروضہ قائم کر کے ظاہر کو اپنے دشمن کی حیثیت دے دی تھی۔ اس کے لیے یہ سوچ ہی ناقابل برداشت تھی کہ کاشی اگر وال کسی دہشت گرد میں دلچسپی لے رہی ہے۔ یہ کاشی کا معمولی جرم نہیں تھا۔ پوسٹال کے نزدیک یہ ناقابل معافی گناہ

تھا جس کی کم از کم سزا موت تھی..... موت!

اور.....

اس نے کاشی اور ظاہر دونوں کے لیے اس سزا کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے ان دونوں کو باری باری ختم کرنا تھا۔

پوسٹال کے لیے ظاہر کو مار دینا کچھ مسئلہ نہیں تھا۔ اسے یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ کسی بھی لمبے بغیر کوئی وجہ بتائے اسے سب کے سامنے کوئی مار دے۔ اس کے لیے وہ کسی کو جواہد بھی نہ تھا۔ البتہ کاشی اگر وال کی موت اتفاقاً ہونی چاہیے تھی۔ وہ جانتا تھا کہ کرل اور بریگڈ میجر دونوں ہی اس کے عاشق تھے۔ دونوں ہی کے مددگار تھے۔ اور پوسٹال ان دونوں میں سے کسی کے مدد نہیں لگنا چاہتا تھا۔

یوں تو اس کی حیثیت بنواری کیمپ میں غیر معمولی تھی اور ہیڈ کوارٹر میں بیٹھے اس کے ”پاس“ اس کی کارروائیوں سے بڑے خوش تھے۔ اس کے ہاتھوں تیار کردہ دہشت گردان کی قوتوں سے بڑھ کر بہترین نتائج حاصل کر رہے تھے۔

○ ○ ○

پوسٹال خود انسانی ہمیں میں ایک درندہ تھا۔

وہ اپنے زیر تربیت تمام خیر خیز کاروں کو درندے بنا کر ان کے ٹکڑوں میں بھینچا کرتا تھا اور اس کے تیار کردہ خیر خیز کاروں کے دل و دماغ میں صرف ایک ہی سودا سلیار ہوتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ جانی پھیلا کر اپنی عیاشی کا سامان پیدا کرتے رہیں۔

وہ انسانیت کے دائرے سے نکل کر وحشی بن جایا کرتے تھے۔ یہ پوسٹال تھا جس نے پاکستان بھڑو اگر روپ کھڑا اگر روپ قسم کی تحعار کروائی تھیں۔ کسی انسان کا سر اسی بھڑو سے سے کچل کر مار ڈالنا انسانوں کے بس کی بات ہرگز نہیں تھی۔ جہاں ایک ایسی واردات ہو جاتی سارا شہر ہراساں ہو جاتا۔ ہر طرف خوف پھیل جاتا اور اس خوف کی کوکھ سے جنم لینے والی افواہیں اور خدشات مقامی آبادی کے اذان کو اس طرح جکڑ لیتے کہ انہیں اپنے سارے سے بھی ڈر لگنے لگتا۔

اس سبھی ہوئی قصا میں پوسٹال ہی کے زیر تربیت ایجنٹ خطرناک افواہیں پھیلاتے۔ مقامی آبادی کے منہ میں ایک بات ڈال کر وہ اسے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک

پہنچا دیتے۔ وہ لوگوں کو غیر محفوظ ہونے کا احساس دلاتے اور ان کے دلوں میں اپنی حکومت کے خلاف نفرت پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ اخبارات میں سوال التماس کے آخر کو سختی ادارے اسنے بے بس کیوں ہیں۔

○ ○ ○

پوسال کا کام اور آسان ہو جاتا جب اس کے چارٹر ایریا کی پولیس عوام کو مطمئن کرنے کے لیے جعلی ”ہتھیار گروپ“ گرفتار کر لیتی جس کے ساتھ ہی اخبارات ایک لمپٹیل بچا دیتے، کیونکہ گرفتار شدگان بے گناہ ہوتے تھے اور کوئی نہ کوئی صحافی ان کی اصلیت جان لیتا جس کے بعد اخبارات حکومت پر چڑھائی کر دیتے کہ وہ اپنی تالائیموں پر پردہ ڈالنے اور عوام کو مطمئن کرنے کے لیے بے گناہوں کو گرفتار کر رہی ہے۔

اس کے بعد ایک نیا قہار شروع ہو جاتا۔ لوگ اس خوف و ہراس کی فضا میں اپنی دشمنیاں بھی چکا دیتے۔

وہ اپنے دشمنوں کو اس طرح ہلاک کرتے پیسے پوسٹل کے سدھائے ہوئے وحشی درندے ہلاک کرتے تھے۔ جس کے بعد یہ کارنامے بھی خواتین اور اس کے نام لگتے چلے جاتے۔

روسی سٹیجوں کے ساتھ تربیت حاصل کرنے والے پوسال نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے پاکستان میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔ وہ اپنے ریک کے حساب سے کیپٹن ضرور تھا، لیکن اسے کسی بھی کمرل سے زیادہ مراعات حاصل تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ دوران تربیت اس کے ہاتھوں مرنے والے کسی بھی خزیب کا رے متعلق انکوائری نہیں کی جاتی تھی۔

اس کے افسران جانتے تھے کہ بسا اوقات نفیاتی دھماکا بٹھانے کے لیے اور ان زورخیز غلاموں کو یہ احساس دلانے کے لیے کہ وہ اب بھی ان کی قید سے آزادی کا تصور بھی نہ کریں اس طرح کے نفیاتی حربے آزماے جاتے تھے اور پوسال یا کوئی اور فائرنگر بلا دیتے بھی کسی ذریعہ تربیت خزیب کا کہ جس پر انہیں یہ شک ہو جاتا تھا کہ وہ گھبراہٹ کا شکار ہے یا اپنے ملک میں جا کر مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کر سکیں گے ان کے ساتھیوں کے سامنے اچانک قتل کر دیا جاتا تھا۔

مگر جب معمول کے مطابق وہ لوگ اپنے تربیتی کیمپ میں پہنچتے تو پوسال یہاں کامی اگر ووال کے ساتھ موجود تھا۔ اس نے ظاہر اور سلیم کو اس طرف آتے دیکھ کر جان بوجھ کر کامی کے

ساتھ زبردستی ایک بے ہودہ حرکت کی تھی جس کا جواب کامی اگر ووال نے نفرت سے اس کا ہاتھ جھٹک کر دیا تھا۔

لیکن

پوسال جان بوجھ کر بے شرموں کی طرح دانت نکالتا رہا۔

○ ○ ○

اپنی دانست میں وہ سب کچھ ظاہر کو پیش دلانے کے لیے کر رہا تھا لیکن ظاہر اس صورت حال سے تعلق لاقط دکھائی دے رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے نفیاتی حربے کیوں اور کب اپنانے جاتے ہیں؟ کیا پوسال کو اس کے اور کامی اگر ووال کے درمیان پیدا ہونے والے ایک روزہ تعلق کا علم ہو گیا ہے؟ اگر ایسا نہیں تو وہ کیوں یہ سب کچھ کر رہا ہے؟ شاید اپنے کسی شک کی تصدیق کرنے کے لیے؟

اگر پہلی بات ٹھیک ہے تو پوسال کو یہ شک کیسے ہوا؟ کیا اسے خبری کی گئی ہے؟ اگر یہ صحیح ہے تو ایسا صرف مشتاق ہی کر سکتا ہے کیونکہ مشتاق ہی ان کے گروپ میں مشکوک تھا اور دونوں پہلے ہی سے یہ بات جانتے تھے کہ مشتاق کو ان کے درمیان چھوڑا گیا ہے۔ پھر اس نے سوچا یہ نہ صرف غلطی ہو تو ہو سکتا ہے کیونکہ پوسال کا پہلے روز بھی کامی کے ساتھ بھی سلوک تھا۔ وہ شاید بنواری کیمپ کا سرکاری ساتھ تھا جسے عمل اقتیارات کے ساتھ یہاں بھیجا گیا تھا۔ بات کچھ بھی رہی ہو اسے خود کو قابل رکھتا تھا۔

اور.....

اس نے ایسا ہی کیا۔ وہ سمجھنے کی اس کا رد وائی میں مسلسل اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے کے بعد پوسال کچھ گڑبڑا گیا تھا۔ عین ممکن تھا مشتاق کی اطلاع غلط ہی ہو۔

لیکن.....

کامی کی یہ جرات؟ اس نے پوسال کا کسی بھی طرح حکم ماننے سے انکار کیوں کیا؟ کامی بھی درجنوں لڑکیاں اس کے بستر کی زینت بننے کے لیے تیار رہتی تھیں، پھر کامی نے یہ گستاخی کیوں کی؟ کچھ بھی ہوا ہے سزا ملتی جاے۔ پوسال کی زندگی نقد عروج کو چھو رہی تھی۔ اب اسے صرف مشتاق کے مفروضے کی تصدیق کرنا تھی۔ جس کے لیے اس کے خود ہی

ایک پروگرام تہذیب دے لیا تھا۔

معمول کی کلاس سے فارغ ہو کر تینوں اپنے کمرے میں پہنچ گئے جہاں تھوڑی دیر بعد کاٹنی بھی آگئی۔ کاٹنی نے اپنے جذبات چھپانے کے لیے کوک چرے پر مصنوعی مسکراہٹ جما رکھی تھی اور معمول کے مطابق اپنے فرائض انجام دے رہی تھی۔

لیکن.....

ظاہر ہے ایک ہی نظر میں اندازہ کر لیا تھا کہ وہ بہت کفیوڑ ہے اور پوچھنے کے پریش سے ابھی تک نجات حاصل نہیں کر سکی۔ یہ اس کے لیے تو آئیڈل جوتیشن تھی۔

اسے ان لمحات سے ہی بھر پور فائدہ اٹھانا تھا، لیکن مشق کی موجودگی نے اسے قدرے پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ کاٹنی سے بہت کچھ کہتا چاہتا تھا۔ اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا بھر پور مظاہرہ کرنا چاہتا تھا لیکن..... مشق کی موجودگی میں نہیں کیونکہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا تھا کہ وہ پوچھوال کا بھڑ ہے۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنا ناشتہ خود ہی کچن میں تیار کر لوں۔ دراصل مجھے آلیٹ صرف اپنے ہی ہاتھ کا بنا ہوا پسند آتا ہے۔"

بین ان لمحات میں جب معمول کے مطابق دیگران کے لیے ناشتہ لے کر کمرے میں داخل ہو رہا تھا ظاہر ہے کاٹنی سے معمول کے لہجے میں پوچھا۔

کاٹنی جان گئی تھی۔ شاید وہ بھی یہی چاہتی تھی۔

"اوہ کیوں نہیں۔"

اس نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یار میرے لیے بھی بنالیا۔ اصل میں صبح کا ناشتہ اچھا نہ ہو تو دن اچھا نہیں گزرتا۔"

سلیم نے اسے بلا ثیری دی۔

مشق البتہ ہفتوں کی طرح ان کے منہ کی طرف دیکھتا رہا جس کے سامنے دیگر ناشتہ جارہا تھا۔

"او۔ کے تم صاحب لوگوں کو سرور (Serve) کرو۔ میں ان کے ساتھ کچن میں جاتی

ہوں۔"

کاٹنی نے مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے وہاں سے ہٹ جانا ہی مناسب جانا۔ ظاہر کے متعلق وہ شدید الجھن کا شکار ہو گئی تھی۔ اگر اگلے روز وہ اس کا ہاتھ نہ تھام لیتا تو کاٹنی آج یہاں موجود نہ ہوتی۔ سینکڑوں فٹ اونچائی سے گرنے کے بعد اس کے جسم کا کیا حال ہوتا؟ اس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

○ ○ ○

"را۔" میں اپنی زندگی کے تین سال جتانے کے بعد بھی شاید ابھی تک وہ اپنے اندر کی عورت کو قتل نہیں کر پائی تھی۔ یوں تو اس درمیان اس کی زندگی میں درجنوں مرد آئے اور چلے گئے لیکن وہ سب کچھ اس کے پرفیشن کا حصہ تھا۔ اس کی ذمہ داری تھی۔ کرل بھالیہ کے حکم پر اسے اب بھی یہاں زیر تربیت کسی بھی تجزیہ کار کے لیے اپنی خدمات انجام دینے کا حکم مل سکتا تھا۔ اس میں اب ضمیر نام کی کوئی شے کا وجود ہی باقی نہیں رہ گیا تھا۔

"دیش سیوا" کے نام پر "را" نے اسے جیسی جہانے نکتی لڑکیوں کے جسم کی دلالتی کا وعدہ اپنا رکھا تھا۔ کالج لائف میں وہ خامسی آئیڈل لڑکی تھی لیکن ایڈوٹج پینڈ!!

اس کی سبکی ایڈوٹج پینڈی اسے "را" میں لے آئی تھی اور اس نے خود کو اپنے افسران کی نظروں میں نمایاں کرنے کے لیے ان کے ہر اشارہ اور پروا پر آپ کو قربان کر دیا تھا۔ اسے امید تھی کہ جلد ہی اس کی بے پناہ قربانیوں کے صلہ میں Abroad Posting مل جائے گی۔ اسے کسی بھی یورپی ملک میں موجود بھارتی سفارت خانے میں "را" کی نمائندگی کے لیے بھیج دیا جائے گا۔

بس یہی دھن تھی جو اس پر سوار تھی۔

یہی سودا اس کے دماغ میں مہایا ہوا تھا۔

البتہ ایک حسرت کبھی کبھی دل کے کسی کونے سے ٹھنڈے آتش فشاں کی طرح سر اٹھاتی کہ اس کی زندگی میں آج تک کوئی مرد اس کی مرضی سے نہیں آیا تھا۔ وہ تو کھلوٹا بن کر رہ گئی تھی۔ شاید یہی وہ بے نام سا بچہ تھا جس نے اسے زندگی میں اپنی سروس کے دوران پہلی مرتبہ پوچھوال کے ناجائز احکامات کی تعمیل سے روک دیا تھا۔ شاید اس کے اندر کی عورت جاگنے لگی تھی۔

اور.....

اب جب ایک باہر کے مرد نے گوکہ وہ بھی اس دھندے کا حصہ تھا، لیکن نجانے کیوں اس نے اچانک کاٹنی اگروال سے اظہار محبت کر دیا۔ کاٹنی گڑبڑا کر رہ گئی۔

اس محبت کو تسلیم کرنا جرم تھا۔ اس جرم کی کم از کم سزا ایک دروٹاک اور بے نام موت تھی۔ وہ "را" کے حکم پر ظاہر چیسے درجنوں خرب کاروں کے ہمسر گرما سکتی تھی لیکن اسے اپنی مرضی سے کسی میں معمولی دلچسپی لینے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ جیسا یہاں کا پروفو کول تھا۔ اس "کوڈ آف کنڈکٹ" کی پابندی اس پر لازم تھی۔

یہ ایک خفیہ اور ان لکھا معاہدہ تھا جو اس کے اور ایجنسی کے درمیان پہلے ہی روز طے پا گیا تھا۔ اگر وہ ایسے کسی بھی جرم میں ملوث پائی جاتی تو یہاں اس کے لیے کوئی عدالت نہیں لگتی تھی۔ کوئی کورٹ مارشل نہیں ہوتا تھا۔ ایسا کوئی بھی شک ہونے پر کرٹل بھائیہ یا بریگیڈیئر ملہوتہ کے معمولی سے اشارے پر ہی اسے بے نام موت مل جاتی۔ اسے کبھی بھی اپنے آج تک زندہ رہنے پر حیرت ہونے لگتی تھی۔

○ ○ ○

اسے یاد آگیا کہ دو سال پہلے جب اس کی ایک کورس میٹ مینا کشی نے ایک سولین نو جوان سے محبت کی پیشکش بڑھائی تھی اور ایجنسی کی طرف سے وارننگ کے باوجود ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھا تھا تو اس کا انجام کیا ہوا تھا۔ بے چاری مینا کشی آنکھوں میں ہزاروں سونے سہائے اپنے محبوب سے ملنے کے لیے اپنی موٹر سائیکل پر اس کے ہوسٹل کی طرف جاری تھی تو ہوسٹل کے بالکل نزدیک ایک ٹرک نے اسے کل ڈالا تھا۔ ٹرک ڈرائیور گرفتار ہو گیا تھا۔

لیکن.....

بھٹکل بارہ روز جیل میں گزارنے پر اس کی ضمانت ہو گئی تھی اور بعد میں ایجنسی کے دباؤ ڈالنے پر مینا کشی کے والدین کو اس سے صلح کرنا پڑی۔ اس صلح کی قیمت انہیں البتہ ضرور مل گئی تھی لیکن بیٹی تو ہاتھ سے نکل گئی۔ اب وہ اسی ہندو سماج میں رہے ہوئے ساٹھ ستر ہزار روپے کی رقم کیوں ہاتھ سے جانے دیتے۔ بے چاروں کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔

یوں بھی انہیں یقین دلایا گیا تھا کہ یہ حادثہ اتفاق تھا۔ بد قسمتی سے مینا کشی کے بوڑھے والدین نے اسے نقد پر سمجھ کر قبول کر لیا۔

وہ یہ بات تو جانتے تھے کہ اگر اس میں ٹرک ڈرائیور کا قصور ہوتا تو ایجنسی کے لوگ اس کی کٹا ہوتی کر دیتے کیونکہ وہ معمولی لوگ نہیں تھے۔ ان کی بیٹی معمولی لڑکی نہیں تھی۔

وہ تو اسے بھی دیوی ماں کر کر پا بھجور ہے تھے کہ کم از کم ایجنسی نے دھونس دھاؤں سے ٹرک مالکان سے انہیں اتنی رقم لے دی اور حکومت کی طرف سے ان کے بھٹکل چندہ میں ہزار روپے ہی نکلے تھے کیونکہ ان کی بیٹی نے ابھی نوکری کا آغاز ہی کیا تھا۔ ابھی تو اس نے ابتدائی ملازمت بھی پوری نہیں کی تھی۔ شہہ سرکاری سہولیات کی مستحق قرار پاتی تھی۔

بے چارے بوڑھوں نے اس رقم سے مینا کشی کی بڑی بہن کے ہاتھ پیسے کر دیئے جو گزشتہ دوڑدھ سال سے مطلوبہ رقم نہ ہونے کی وجہ سے اپنی خصوصی کی خیریت بھی تھی۔

شاید دوسری لڑکیوں کی طرح کاٹنی اگروال بھی اسے ایکسٹنٹ سمجھتی لیکن دو سال بعد ایک روز جب راجھستان کے ایک تخریب کاری کے کیمپ میں اس نے اسی ٹرک ڈرائیور کو کیمپ کمانڈر کی چپ چلاتے دیکھا تو اس کا ہاتھ ٹھنکا۔ وہ مینا کشی کے مقدمے کے سلسلہ میں تین چار مرتبہ تھا نے اور عدالت میں اسی ٹرک ڈرائیور کو دیکھ چکی تھی۔ کیا اس کی آنکھوں نے ہلکا کھایا تھا۔

"نہیں۔" اسے اپنے سوال کا جواب ملا۔

اس نے بالکل سمجھ بیٹھا تھا۔ یہ وہی ٹرک ڈرائیور تھا اور اب اسے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ انٹیلی جنس ایجنسیوں کا اپنا طریق کار ہوتا ہے جس کے مطابق انہوں نے یہ کام کر دیا۔

یہاں کسی کو کوئی بھی ڈیوٹی سونپی جاسکتی تھی۔

اور.....

کسی کی مجال نہیں تھی کہ ایجنسی کے حکم کی سرکوبی کرتا۔ ممکن ہے اس بے چارے کا دل مینا کشی کی موت پر مضامند نہ ہوتا۔

لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ یہاں دل کی نہیں دماغ کی نہیں صرف اپنے "باس" کی آواز پر کان دھرنے کا حکم تھا۔

اس روز کاٹنی سہم کر رہ گئی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ اس افکار مشن میں اپنی کسی اور دوست کو شریک کر لے، لیکن..... وہ اب ایسی بے وقوف بھی نہیں رہی تھی۔ جانتی تھی کہ اسے جان بوجھ کر

اسی ڈرامہ پر کچھ جھلک دکھائی گئی ہے۔ شاید وہ لوگ اس کی وفاداری اور پرفیشنل ازم کا امتحان لینا چاہتے ہوں۔ شاید وہ اسے کسی بڑے کام کے لیے تیار کر رہے ہوں۔ کچھ بھی ممکن تھا۔ کچھ بھی۔ کامی نے خاموشی اختیار کر لی۔

اس نے اپنے دل و دماغ کو سمجھایا کہ اس نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ اسے دھوکہ دیا ہو گا۔ اس نے کبھی بھول کر بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا۔

اس طرح اس نے دراصل اپنی ترقی کا ایک اور امتحان بھی پاس کر لیا تھا۔ اس کا اندازہ چند ماہ بعد ہی ہو گیا جب کسی اور طریقے سے اس کے ”باس“ نے اس کی حس رازداری کو سراہتے ہوئے اس کو اسلے کرڈ میں ترقی کا مزہ سنایا۔

آج نہ جانے کیوں اسے دو سال قبل قتل ہونے والی یہ ناشی اچانک ہی یاد آ گئی۔ اور..... کیا اب وہ بھی اگلی یہ ناشی بننے جا رہی ہے۔ یہ اس کے دل کو کیا ہو گیا۔

کہیں دیوی ماں کا شراب تو نہیں پڑ گیا اس پر؟ گزشتہ دو سال سے اس نے کبھی مندر کا دروازہ بھی نہیں دیکھا تھا جب کہ اس کے گھر میں صدیوں سے روزانہ ”کالی ماں“ کی پوجا ہوتی آ رہی تھی۔ اتنے ایڈوانس ہونے کے باوجود ابھی تک اس کی ماما جی روزانہ صبح کو اپنے گھر میں خود ”پوجا“ کا اہتمام کرتی تھیں۔ ہر دوسرے تیسرے ماہ کسی نہ کسی بہانے ان کے ہاں کوئی نہ کوئی ”ہون“ ہوتا رہتا تھا۔ کیسے کیسے برہمچاری کیسے کیسے گرو اور پنڈت ان کے ہاں آیا کرتے تھے۔

لیکن.....

گزشتہ دو سال سے وہ ایسی کسی ”پوجا“ میں شرکت ہی نہیں کیا کرتی تھی بلکہ اب تو اسے اس پوجا پانچھ کے پکھنڈ سے الجھن ہی ہونے لگی تھی۔ ابھی چند ماہ پہلے ہی کی تو بات ہے جب موسیٰ کو شلیانے اسے سمجھا تبھا کر پچاری جی کے سامنے ”تیس نوے“ کو کہا تو اس نے اپنی بوڑھی موسیٰ کو قریب ڈانٹ کر خاموش کر دیا تھا۔ تب ان کے گھر کی برائی ملازمت سے کہا تھا۔

”بھگوان نہ کرے گا کامی بیٹی پر کہیں دیوی ماں کا شراب نہ پڑ جائے۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

آج نہ جانے کیوں اسے یہ ساری بھولی بری باتیں بچپن میں سنائی اپنی نانی ماں کی کہانیتوں کی طرح یاد آ رہی تھیں۔

طاہر کے ساتھ ہی وہ کمروں کے ایک کونے میں موجود کچن تک آئی تھی۔ راستے میں دونوں میں سے کسی نے ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہا تھا۔ طاہر نے کچن میں داخل ہوتے ہی محسوس کر لیا تھا کہ اب تک کامی کا بھائی انا مل تھی اور اس نے بڑی محنت سے اپنے خوشگوار موز کا سواگت رچایا ہوا تھا۔ جیسے ہی وہ کچن میں پہنچے سارے جہاں کا حزن و دیاں جیسے کامی اگر وال کے چہرے پر سٹ آ یا۔

زندگی میں پہلی مرتبہ طاہر کو کسی عورت کا چہرہ دیکھ کر عجیب طرح کے جذبات کا احساس ہوا جسے وہ فی الوقت بھردی کے جذبات ہی کہہ سکتا تھا۔

○ ○ ○

”مجھے کچھ یاد نہیں کرتا۔“

اس نے ایک بڑے سے فریج کی طرف بڑھتی کامی کو دیکھ کر کہا۔

”مجھے علم ہے۔“

کامی نے اس کی طرف دیکھے بغیر فریج کا دروازہ کھول کر دو تین انڈے باہر نکال لیے۔

”بھر بھی آپ.....“

طاہر نے کچھ کہنا چاہا لیکن کامی نے توبہ کر اس کی بات کاٹ دی۔

”ہاں بھر بھی مجھے اس ڈرامے میں حقیقت کا رنگ تو بھرتا ہے۔ کوئی تو جواز پیدا کرنا

ہے۔ کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے۔“

کامی نے عجیب سے کھوئے کھوئے لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کامی جی میں جانتا ہوں یہ۔ کچھ غلط ہے، لیکن میں بے بس ہوں۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ اف میرے خدا! میں کبھی اتنا بے بس نہیں تھا۔ آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ آج میں

نے سب کچھ کیسے برداشت کیا۔ مجھ سے آپ کی بے بسی نہیں دیکھی جاتی۔ میں جانتا ہوں یہ سب کچھ بے سود ہے۔ میں آپ کے لئے مر بھی جاؤں تو کوئی اہمیت نہیں ہوگی اس موت کی۔ کون

جانے گا کہ میں کون تھا۔ کس کے لیے مر گیا اور آپ جان بوجھ کر خاموش رہیں گی کیونکہ یہ آپ کی ڈیوٹی ہے۔ میں سب کچھ سمجھتا ہوں کامی جی، لیکن میں کچھ کر نہیں سکتا۔ میرے اختیار میں کچھ

نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔“

اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

اور.....

کاشی کا دل دھک سے رہ گیا۔

دوسری طرف طاہر کو بھی اچانک ایک زوردار جھٹکا لگا تھا۔

”کیس اداکاری میں حقیقت کا رنگ تو نہیں پچھنے لگا۔“

اس کے خمیر نے جیسے ایک زوردار کوڑا اس کی پیٹھ پر رسید کر دیا اور طاہر سم گیا۔ یہ اسے

اچانک کیا ہونے لگا تھا۔ وہ تو اداکاری کر رہا تھا۔ وہ تو کاشی اگر وال کا دل جیت کر اسے ڈھال بنا

کر اسے بیڑی بنا کر بیڑی کیس کو تباہ کرنا اور یہاں سے زندہ بچ کر اپنے وطن واپس جانا چاہتا

تھا۔ اس نے تو یہ سارا ڈھونگ سلیم کے ساتھ پلاننگ کے بعد چلایا تھا۔ دونوں نے بڑی سوچ بچار

کے بعد تین چار منصوبے تیار کئے تھے جن میں سے بلاخر ایک پر صاف کیا تھا اور وہ یہ سب پچھاس

منصوبے کے مطابق کر رہا تھا۔ یہ اداکاری اس منصوبے کا حصہ تھی۔ عین ممکن تھا کہ اس کی جگہ یہ

پارٹ سلیم ادا کرتا۔

لیکن.....

اس نے طاہر سے معذرت کر لی تھی کیونکہ ماضی میں اسے طاہر کے ساتھ اور دو تین

مہماں کا تجربہ ہو چکا تھا اور وہ جانتا تھا کہ اداکاری کے میدان میں کم از کم اس کے ساتھیوں میں

سے کوئی اس کا جانی نہیں۔

اپنی جرب زبانی، ترو مافی اور شاعر اداکارانہ صلاحیتوں کی بدولت جو شاید اسے

تدریجی طور پر دو دیت ہوئی تھیں طاہر نے بڑے نامکن اور مشکل ترین حالات میں بھی حیرت انگیز

نتیجہ حاصل کئے تھے اور یہاں بھی اسے اپنی ان صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر بہترین نتائج حاصل

کرنے تھے۔

”بیڑی کیس؟“ کوئی عام سا تجزیہ کاری کا مرکز نہیں تھا۔ ایس ایس بی بھارت کی

عام سی انجینیئر نہیں تھی۔

اس کیس کے تربیت یافتہ تجزیہ کاروں نے اس کے ملک میں تباہی مچا دی تھی۔ اسے

بادل خواست اپنی اس جاہ کاری کے مرکز کو تباہ کرنے کے مشن پر روانہ کیا گیا تھا۔

یہ ایک طرح سے Impossible Mission تھا اور انہیں اسے مکمل کرنا تھا

خواہ اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔

لیکن..... یہ کیا؟ یہ اسے اچانک کیا ہو گیا تھا؟ وہ کاشی اگر وال سے متعلق ایسے

غیب و غریب سے جذبات کا مظاہرہ کیوں کرنے لگا تھا۔

”مستغلو صاحب زادے، مستغلو۔ کس چکر میں پڑنے لگے ہو۔ اپنے ساتھ سلیم کو بھی

مرداؤ گے۔ کیا؟ اور تمہارا مشن کا کبائے گا؟“ ایک زوردار فوجی جھگڑے سے وہ قدرے مستغلو کیا۔

کاشی خاموشی سے انڈے توڑ کر انہیں ایک پلیٹ میں ڈال کر پھینٹ رہی تھی۔

”آپ خاموش کیوں ہیں؟ کچھ بولتی کیوں نہیں؟“

اس نے کاشی کے دائیں ہاتھ پر اچانک اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ طاہر کا دل گواہی دے رہا تھا

کہ اس کا یہ عمل بے ساختہ ہے اور اس نے کسی پلاننگ کے بغیر یہ سب کچھ کیا ہے۔ بالکل اُن

ادا کاروں کی طرح جو کبھی کبھی رونے کی اداکاری کرتے ہوئے جذباتی ہو کر خود بھی رو پڑتے ہیں۔

”کیا یہ اس سین کی ڈیما تھی؟“

اس نے اپنے دل کو ایک اور جھوٹی تسلی دے کر بہلا نا چاہا۔

لیکن.....

ادھر سے نفی میں جواب ملنے پر وہ جیسے ڈر گیا۔

کاشمی نے اچانک ہی اس کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں گاڑ دی تھیں۔ کاشمی کی آنکھوں میں چمک جانے کو بے قرار ہوتے ہوئے آنسوؤں کا سیلاب اسے صاف دکھائی پڑ رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے یہ بڑی بڑی گہری سیاہ آنکھیں جو شاید اس کے سارے وجود کا سب سے خوبصورت حصہ تھیں اس کی آنکھوں کے راستے براہ راست اس کے دل میں اتر رہی ہوں۔

”دیکھو جہیں خوش رکھنا میری ذیولنی ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہاری ہر طرح سے سیوا کر سکتی ہوں پھر اس سب کی کیا ضرورت ہے؟ تم مجھے اس کے بغیر بھی.....“

کاشمی کی بات اس نے کاٹ دی۔

”نہیں۔ خدا ارادے نہ کہیں۔ میں یہ کچھ نہیں چاہتا۔ مجھے علم ہے میری زندگی ہی ان کاموں میں بسر ہوئی ہے۔ میرے لیے یہ کچھ یا نہیں ہوگا۔ میں تو.....“

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

”تم جانتے ہو اس کا انجام؟ کبھی تم نے اپنی اور میری حیثیت پر غور کیا ہے۔ ہم دونوں دو الگ انتہاؤں پر پہنچنے والے ہیں۔ اور تم.....“

کاشمی نے اب آلیٹ بنا تا شروع کر دیا تھا۔

”میں سب کچھ جانتا ہوں کاشمی جی۔ میرا دماغ وہی کہتا ہے جو آپ کہہ رہی ہیں لیکن میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا نہیں سکتا۔“ اس نے بے بسی کے انداز میں گردن جھکا لی۔ کاشمی نے آلیٹ بناتے ہوئے نظریں طاہر پر گاڑ دیں جس نے اپنی گردن جھکا لی ہوئی تھی۔ بالکل ان لمحوں کی طرح جو اپنی سزا کے فیصلے کے منتظر ہوں۔

”بھگوان کے لئے مجھے اتنا بے بس نہ کرو۔ تم کیوں مجھے اور اپنے آپ کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہو۔“ کاشمی نے تڑپ کر کہا۔

”نہیں آپ کو نہیں۔ ایسا کبھی دوبارہ مت کہیں۔ صرف اپنے آپ کو۔ جس روز مجھے یہ

فلک بھی ہوا کہ میری وجہ سے آپ کو کچھ ہونے والا ہے تو شاید میں خود کو کوئی مار دوں۔ میں اپنے آپ کو ختم کر لوں گا کاشمی جی لیکن آپ پر ایسا وقت نہیں آنے دوں گا۔“

اس نے بڑے جذباتی پن کا مکمل اور مجرور مظاہرہ کیا۔

کاشمی اگر وہاں شاید اس سے زیادہ صورت حال کی تکفیف کا احساس تھا۔ وہ قدرے چپکے دکھائی دے رہی تھی۔

”طاہر احتیاط کرو۔ یہاں کچھ بھی ممکن ہے کچھ بھی۔ اگر تمہارے جذبات سے متعلق کوئی شک بھی ان لوگوں کو ہو گیا تو وہ مجھے ہی نہیں تمہیں بھی مار ڈالیں گے اور یہ میں نہیں چاہتی۔“

کاشمی اگر وہاں نے پکارا ہتھیار ڈال دیئے۔

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں کاشمی جی۔ میں آپ کو بھی بتانے والا تھا۔ ہمارا تیسرا ساتھی مشتاق پوسال کا بچہ ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے نکل رات کی ساری کہانی سنائی۔

کاشمی خاموشی سے اس کی بات سنتی رہی۔

”او۔ کے میں کوئی صورت نکال لوں گی لیکن پلیز تم نارمل رہنا۔ خاص طور سے پوسال کے سامنے خواہ وہ کچھ ہی کرے۔ خواہ مجھے جان سے مار ڈالے لیکن تم خاموش رہنا۔ اور اپنی کسی بھی حرکت سے انہیں شک میں مبتلا نہ ہونے دینا۔ کسی بھی حرکت سے۔ وہ دہرے وہ دہشت گرد ہیں۔

وہ اب جنونی حرکت کرے گا اور کچھ بھی کر گزرے گا۔ اسے یہاں بے پناہ احتیارات حاصل ہیں۔ اسے سب کچھ کرنے کی آزادی ہے۔ اور ہاں اس لڑکے مشتاق سے تو بہت محتاط رہنا۔ خبردار اس کے سامنے کبھی بھولے سے بھی کوئی بات نہ کرنا۔ تمہارے دوسرے ساتھی کو تو شک نہیں ہوا ناں۔“

اس نے جان بوجھ کر تم کا سینہ استعمال کیا تھا۔

اس مرتبہ کاشمی اگر وہاں مکمل عورت بن گئی۔ اس کے لیے اپنے آنسو ضبط کرنا مشکل تھا۔ آنسو بہاتے ہوئے وہ طاہر کے کندھے سے لگ گئی۔

لیکن..... یہ صورت حال چند منٹ سے زیادہ برقرار نہ رہ سکی۔ کاشمی کو احساس تھا کہ انہیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

”چلو اب تمہارے کمرے میں چلتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ مسکرا دی۔ اس نے حیرت انگیز طور پر خود کو نارمل کر لیا تھا اور اب سبک سے اپنے منہ پر پانی کے پھینے مار رہی تھی۔

آلیٹ کی دو بیٹیاں اس نے تیار کی تھیں اور وہاں دونوں نے بمشکل آٹھ دس منٹ گزارے تھے۔ ابھی دو لوگ ناشتے میں مصروف ہی تھے جب دونوں وہاں پہنچ گئے۔ سلیم نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ مزید چند منٹ کی دیر کی کوئی کمی قیامت ڈھا سکتی تھی۔ اس نے فوراً ہی اس پلٹ پر ہاتھ صاف کرنے شروع کر دیے جو بظاہر بگن سے طاہر بنا کر لایا تھا لیکن اصل میں کاشی نے تیار کی تھی۔ دوسری پلٹ طاہر نے سنبھال لی۔ وہ مشتاق کو کوئی موقعہ نہیں دینا چاہتے تھے۔

”میڈم آپ بھی آج ہمارے ساتھ ہی کھائیں ناں۔“ سلیم کو نجانے کیوں اچانک کاشی کا خیال آ گیا۔

”تھینک یو۔ میں صبح کا ناشتہ نہیں کرتی۔ جو کرتی ہوں وہ کر چکی۔ البتہ تمہارے ساتھ چائے ضرور شہزادہ کر دوں گی۔ میرے کپ میں چینی اور دو تھپنیں ڈالنا۔“

کاشی اگر وال کی گفتگو سے یوں لگ رہا تھا جیسے چند منٹ پہلے اس کے دل و دماغ پر جو منوں بوجھ پڑ رہا تھا وہ اب اتر گیا ہو۔ وہ پہلے کی طرح بہت نارمل اور قدرے شوخ لہجے میں بات کر رہی تھی۔ مشتاق نے اب تک تین مرتبہ اس کی طرف چور نظروں سے دیکھا تھا اور کاشی ہی نے نہیں طاہر نے بھی اس کی چوری پکڑ لی تھی۔

”نے جان بوجھ کر مشتاق سے دو باتیں کی تھیں۔ گو کہ وہ یہ سب کچھ بادل غواستہ کر رہی تھی لیکن ایسا کرنا اس کے لیے ناگزیر تھا۔ ابھی تک مشتاق نے پوچھا کہ سامنے اپنا ٹکٹ ہی ظاہر کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ بات یقینی دکھائی دے۔ حالانکہ اس نے طاہر کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اس کے دل نے عقل پر چڑ پالی تھی اور محبت فاتح عالم کی سچائی اس کے رگ دپے میں سرایت کر گئی تھی لیکن وہ محتاط تھی۔ چونکہ رہتی کی طرح جیسے کسی بھی لمحے کسی بھی سمت سے کسی بھی درندے کے حملہ آور ہونے کا خطرہ ہو رہا ہو۔ اس نے معمول کے مطابق ان کے ساتھ قریباً آدھا گھنٹہ گزارا تھا اور اب اگلی کلاس کا وقت شروع ہونے کی وجہ سے باہر آ گئی تھی۔

○ ○ ○

اسے روزانہ ان تینوں کا نفسیاتی مطالعہ کرنا ہوتا تھا جس میں ان کی معمولی سے معمولی حرکتوں کا ذکر بھی کیا جاتا تھا۔ آج اس نے طاہر کی طرف سے اپنے ہاتھ سے ناشتہ کرنے کی

خواہش اور باقی کی ساری کارروائی بھی اپنے حساب سے لکھ دی تھی تاکہ کوئی بھی چیز آف دی ریکارڈ نہ رہے۔ دو پہر کے بعد وہ معمول کے مطابق کرل بھائیہ کے آفس کی طرف اپنی رپورٹ فائل کرنے جا رہی تھی۔ انہیں ملنے میں ایک روز اپنے اپنے زیر تربیت گروپ کو کرل بھائیہ کے سامنے ”ڈکس“ کرنا ہوتا تھا۔

اور..... آج اس کی باری تھی۔ آج کاشی نے کرل بھائیہ کو پیش کرنے کے لیے رپورٹ کے ساتھ ایک جوڑ بھی تیار کر لی تھی۔ اسے عیش نے یہ راہ بھائیہ تھی۔ یہ قتل کا کام نہیں تھا۔ اس نے اگلے ہی روز کرل بھائیہ کو طاہر سے متاثر ہوتے دیکھ لیا تھا اور اب کرل بھائیہ کے دل میں طاہر کے لیے موجود ”سافٹ کارز“ کا فائدہ اس نے اٹھانا تھا۔

”سر یہ لڑکا بہت کام کا ثابت ہوگا اگر اس پر تجوڑی محنت ہو جائے۔“ کرل بھائیہ کے ایک طرف فائل رکھنے کے بعد اس نے طاہر سے متعلق ریمارکس دیے۔

”ہوں.....“ کرل نے رکارڈ دھواں فضا میں کھیرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں۔ بظاہر تو یہی لگتا ہے لیکن ابھی کچھ کہنا قیامت ڈھونڈنا ہوگا؟“

کرل بھائیہ نے اس کی طرف سوالیہ انداز سے دیکھا۔

”یہی بات میں آپ سے کہنے والی تھی۔ اسے ذرا اور دیکھنا ہوگا۔ سر اس سے بہت کام لیا جاسکتا ہے۔ بہت دم سے اس لڑکے میں“ اس نے بڑے پروفیشنل انداز سے کہا۔

”ہوں۔ کاشی ایک جوڑ ہے۔“ کرل بھائیہ شاید اس سے پہلے ہی ذہن بنا کر بیٹھا تھا۔ واقعی اس نے پہلے ہی روز طاہر کے تیردیکھ کر اندازہ لگایا تھا کہ سلیم نے اس مرتبہ اسے بڑا زبردست لڑکا دیا ہے اور اس سے اب بریکڈ ٹیرمبلو پر چڑھنا حاصل کرنے کے لئے کوئی بڑا کارنامہ بھی تو کرانا تھا۔

”ییس سر۔“ کرل بھائیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے مودب لہجے میں کاشی نے کہا۔

”میک اٹ یو بچل کس۔“ (اسے اپنا خاص کس بناؤ۔)

کرل بھائیہ نے یہاں خاص اصطلاح استعمال کرتے ہوئے کہا۔

”مائی پلیز سر۔ اپنے دیش کے لیے کوئی بھی سپوا کرنا میرا دھرم اور ذمہ داری ہے۔ سر۔ آپ تو جانتے ہیں سر کہ آج تک کاشی اگر وال کا کوئی ”بچل کس“ ناکام نہیں رہا۔ ہمیشہ ہم نے

”بہترین رزلٹ“ دیا ہے سر۔ اور آپ کو طم ہے کہ براڈ پوسٹنگ (بیرون ملک تعیناتی) کے لیے میرا کیس ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا ہے۔ اگر یہ لڑکا بھی میرا کیس بنا تو میرے لیے ”پلس پوائنٹ“ ہو گا سر۔ اب ایک آدھ پلس پوائنٹ کے بعد مجھے یہ چانس مل سکتا ہے۔ میں آپ کی بہت دھنوا دی ہوں سر۔ یو آر ٹیلی گریٹ سر۔“

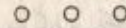
اس نے کرل بھائی کی شان میں قصیدہ پڑھ دیا۔

کرل بھائیہ سمجھ گیا کہ کاٹنی اگر خود بھی اس کیس میں دلچسپی لے رہی ہے تو کسی خاص مقصد سے اور اب اسے اس خاص مقصد کا پتہ بھی لگ گیا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ کاٹنی اگر وال اپنی غیر ملکی تعیناتی کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھی۔ وہ بڑی پروفیشنل لڑکی تھی۔ اسے شروع ہی سے کاٹنی پر بہت اعتماد تھا۔ اس کی صلاحیتوں کا وہ ہمیشہ متحرف رہا تھا۔

اب دونوں اپنی اپنی رار پڑتے۔ اگر کاٹنی کو غیر ملکی پوسٹنگ کے لیے کسی کارنامے کی ضرورت تھی تو کرل بھائیہ کو اپنی کمانڈ پر یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ لمبوترہ سے زیادہ اس کا اہل تھا اور وہی ایک ایسی ہستی ہے جو ایس ایس کی بے ہزاری کپ کو کمانڈ کر سکتی ہے۔ اسے یہ ثابت کرنا تھا۔ دونوں کی نگاہیں اس کام کے لیے طاہر پر لگی ہوئی تھیں۔

”گوا بیڈ بے بی۔ میک اٹ چیٹل۔“ اس نے کاٹنی اگر وال کی چیٹ پر جھکی دیتے ہوئے کہا۔

کاٹنی کو امید نہیں تھی کہ اتنی آسانی سے یہ مہم سر کرے گی۔ اس نے محض اس مفروضے کو بنیاد بنا کر کرل بھائیہ طاہر سے امید ہے اندھیرے میں تیر چلا یا تھا جو اس کی خوش قسمتی سے نشانے پر لگا تھا۔ اسے طاہر سے متعلق گرین سٹیل مل چکا تھا۔ اب پو سوال اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔



بریگیڈ تیر لمبوترہ کچھ دنوں کے لیے رخصت پڑھا اور بٹواری کپ کی کمانڈ عملہ اب کرل بھائیہ کے ہاتھ میں تھی۔ پو سوال کو اس کپ میں جو ”گمناموں“ والی حیثیت حاصل تھی وہ بھی بریگیڈ تیر لمبوترہ کی وجہ سے تھی۔ اب کم از کم وہ ”آئی آر ریکارڈ“ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ ”آف دی ریکارڈ“ اگر وہ کچھ کرنا چاہتا تو دونوں مل کر اس کا سامنا کر سکتے تھے۔ اب

مشتاق کی بختری بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی بلکہ اب اسے تقویٰ بن کر وہ ڈیوٹی کے مطابق اس کیس پر زیادہ محنت کرنا تھی اور طاہر کو یہ تاثر دینا تھی کہ وہ اس پر مبنی ہے۔ اسے اپنے جسم کا عادی بنایا تھا۔ اسے ڈپٹی اور رٹناتی کے ساتھ ساتھ ہلا خرسا نی بھی دینا تھی تاکہ وہ پھر ہمیشہ کے لیے اس کا دم بھرتا رہے اور اس کے اشارہ اور ہر کچھ بھی کر گزرنے کو تیار رہے۔ کچھ بھی نہ۔

کرل بھائیہ کے آفس سے باہر آتے ہوئے کاٹنی سوچ رہی تھی کہ وہ اتنی اس نے کرل کے سامنے ج بولا ہے۔ اگر اسے گرین سٹیل مل بھی کیا تھا تو وہ دونوں کتنا عرصہ ایک دوسرے کے ساتھ رہ پائیں گے۔ یہاں تربیت دو ماہ میں مکمل ہو جائے گی جس کے بعد کیا وہ لوگ اسے طاہر سے رابطہ رکھنے کی اجازت دیں گے؟

”اے بھگوان میں کس مگر وہ دھندے میں پھنسے جا رہی ہوں؟ یہ کیا شراب ہے دیوی ماں؟ اس نے بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

اور نجانے کیوں اس کا دل بھر آیا۔ آج زندگی میں شاید پہلی مرتبہ وہ ایک ہی دن میں دو مرتبہ روئی تھی۔ وہاں جگن میں تو اس نے نکال ضبط سے اپنے آپ پر قابو پایا تھا۔

لیکن..... یہاں اپنے کمرے میں اس نے خود کو تنہا نقد پر چھوڑ دیا۔ زندگی میں اس سے پہلے وہ کبھی سکسکس کے نہیں روئی تھی۔ آج وہ بچوں کی طرح رو رہی۔ اسے اپنے آپ پر ترس آ رہا تھا۔ اپنی بے بسی پر اس کا دل ماتم کرنے کو چاہتا تھا۔ جانے اس نے کب سے اپنے اندر آنسوؤں کا یہ سمندر جمع کر رکھا تھا جواب ریت کی ساری دیواریں توڑ کر بہتا چلا آ رہا تھا اور وہ انہی اپنے کمرے میں روئی رہی۔

رو رہے تو اسے نیند آ گئی۔

اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ معمول کے مطابق آپریٹر نے ٹیلی فون کی گھنٹی بجا کر اسے پانچ بجے پر بیدار کیا۔ یہ یہاں کی پریکٹس تھی۔ تمام انسٹرکٹرز دوپہر کے بعد اپنے کمرہ میں کچھ دیر آرام کیا کرتے تھے اور پانچ بجے پر انہیں دوسری کلاس کی تیار کی کے لیے بیدار کیا جاتا تھا۔

ہاتھ روم کے شیشے میں اپنی شکل پر نظر پڑے ہی وہ مسکرا دی۔ خفاف معمول آج اس نے سہ پہر کو ہاتھ لیا اور جب وہ تیار ہو کر باہر آئی تو اسے اپنا بدن پھول کی طرح ہکا بھکا ہونے کا احساس ہوا۔ جیسے اس نے اپنے سر پر موجود وزن آنکھوں کے راستے آنسوؤں کی صورت بہا دیا

ہو۔ اس نے معمول کے مطابق کپڑے پہنے تھے جو چین اور جیکٹ پر مشتمل تھے، کیونکہ اب وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ تربیت پر چارہی تھی۔

کاشی نے ان تربیتی کمپوں میں آنے کے بعد خود کو عورت سمجھنا ہی چھوڑ دیا تھا لیکن آج ایک طویل عرصے بعد اس کے اندر کی عورت کو جیسے ظاہر نے دوبارہ زندہ کر دیا تھا۔ اس نے کبھی میک اپ نہیں کیا تھا۔ معمول کی فیس کریم ضرور استعمال کیا کرتی تھی لیکن آج نہانے کیوں اس نے اپ سٹک بھی لگا لی تھی۔ عموماً وہ اپنے مگر دھست کے وقت جاتے ہوئے یا پھر جتنے دن اپنے مگر میں رہتی اس عرصے میں اپ سٹک لگا کر تھی یا پھر کپ کے باہر کبھی یا ذریعہ دونوں میں شہر میں کسی تقریب میں شرکت کرتے ہوئے۔ اس طرح میک اپ میں ہونٹوں کو سرخی لگانے کا یہ اس کا پہلا موقع تھا۔

جب وہ ظاہر کے کمرے میں پہنچی تو تینوں ہی حیران رہ گئے۔ ظاہر کے لیے حیرانگی کی بات اس کا لاپرواہ ہونا تھا کیونکہ آج صبح ہی اس نے ظاہر کو خوش طار بننے کے لیے کہا تھا اور اب خود تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر بے تکلفی سے اس کی باتوں میں بائیں ڈال کر اسے باہر لے جا رہی تھی۔

اور.....

سلیم اور مشتاق ہونٹوں کی طرح دونوں کے پیچھے آ رہے تھے۔

”یا اللہ خیر“

سلیم نے دل ہی دل میں کہا۔ ”کہیں اپنی آنتیں گلے کو نہ آ جائیں۔ یوں لگتا ہے ظاہر نے کچھ زیادہ ہی جذباتی اداکاری کر دی ہے۔“

لیکن.....

یہ سب احتیاطی.....!

ظاہر خود بھی سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔

رواگی پر اس نے ظاہر کو اپنے ساتھ بٹھایا تھا اور ان دونوں کو پیچھے سلیم پر گھبراہٹ

ظاہر کی ہو رہی تھی۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اب مشتاق کے لیے کوئی حریف ثبوت تلاش کرنا مشکل نہیں

ہوگا اور وہ کسی بھی لمحے مارے جائیں گے۔

○ ○ ○

اسے اپنے فیصلے پر خود ہی ہچکتا ہوا ہو رہا تھا کہ اس نے ظاہر کو کس کام پر لگا دیا لیکن..... ظاہر بھی اتنا بے وقوف تو نہیں۔ اس نے سوچا اور تین ہفتہ یہ ہو کر بیٹھ رہا۔ تمام راستے وہ تینوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی آئی تھی۔ اس دوران اس نے پہاڑی راستوں پر ڈرائیونگ کرتے ہوئے دو تین مرتبہ کسی بات پر قہقہہ بھی لگا یا اور ایک مرتبہ تو سٹیرنگ پر اس کا ہتھ ڈر سا بہکا اور تینوں ہم کر رہ گئے۔

”ارے اس میں ڈرنے والی کیا بات ہے؟“

اس نے گاڑی کو سیدھے کرتے ہوئے کہا اور تینوں خواہ مخواہ مسکرا دیئے۔

تربیت گاہ پر پہنچ کر وہ رک گئے۔

گاڑی کے ڈیش بورڈ سے اس نے نقشہ نکال کر یونٹ پر بچھا دیا اور انہیں ہاتھ کے اشاروں سے سمجھانے لگی کہ کون کون سا ڈرگٹ کہاں کہاں ممکن ہے جس کے بعد اس نے سلیم اور مشتاق کو ڈی ایم دے کر جنگل اور پہاڑی راستوں روانہ کر دیا۔

سب نے اپنی اپنی گھڑیاں آپس میں ملائی تھیں۔ انہیں اپنا اپنا کام مکمل کر کے اس جگہ واپس پہنچنا تھا۔

دونوں..... ظاہر کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی اپنی منزل کی طرف چل دیئے۔
دونوں نے کچھ راستہ اکٹھے کرنا تھا جس کے بعد انہیں الگ ہونا تھا۔

”میڈم ظاہر پر کچھ زیادہ ہی ہیریاں نہیں ہوئیں کیا؟“

اچانک ہی مشتاق نے سلیم سے کہا۔

سلیم کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے بہت سوچہ سمجھ کر جواب دینا تھا۔ وہ قطعاً یہ تاثر دینے کے لیے تیار نہیں تھا کہ وہ ظاہر ایک ہی ہیں۔ البتہ ایک بات کی اسے اب تک سمجھ آ گئی تھی کہ اگر واقعی ظاہر نے کاشی کو شیشے میں اتار لیا تھا تو ہرگز بے احتیاطی نہ خود کو رسکا تھا اور نہ ہی کاشی ایسا کرنے کا غلطہ مول لے سکتی تھی۔ اگر کاشی ظاہر میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی ظاہر کر رہی تھی تو ضرور یہ کسی پلان کا حصہ ہوگا۔

اس سوچ کے بعد اب وہ اطمینان سے اس کی ہاں میں ہاں ملا سکتا تھا۔

”ہاں بھئی اپنے اپنے نصیب ہیں۔ پچھلی مرتبہ وہاں راجستھان میں ہمارا بھی دل لگ گیا تھا اس مرتبہ ہم یونہی رہ گئے۔ بہر حال ابھی تو کافی عرصہ باقی ہے۔ ہمیں بھی محروم تو نہیں رکھا جائے گا۔ ویسے ہے سالی چائے۔“

اس نے مشتاق کی طرف دیکھ کر آکھڑ بابئی۔

مشتاق کے لیے اس کا جواب بالکل غیر متوقع تھا۔

لیکن.....

وہ نابل رہا۔

اب وہ کم از کم پوسال کو ضرور یقین کے ساتھ سب کچھ بتا سکتا تھا اور..... پوسال

کی طرف سے نقدی اور شراب و شہاب کی صورت میں اسے خاصا انعام مل سکتا تھا۔

”ہاں ہاں واقعی اپنی اپنی قسمت ہے۔“

مشتاق نے بظاہر غصہ ڈی آدھری۔

اور.....

دونوں الگ ہو گئے۔

اب انہیں ایک گھنٹہ الگ گزارنا اور اپنے اپنے ٹارگٹ مٹ کرنے تھے۔ دونوں نے اپنے اپنے واک ٹاکی چیک کئے اور کاشمی کو روٹنگی کا سٹغل دے کر اپنی اپنی منزل کی طرف چل دیئے۔

”غیر اگلے کیا؟“

کاشمی نے ان کے وہاں سے بہتے ہی طاہر سے کہا۔

”نہیں لیکن.....“

طاہر کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کہے کیا نہ کہے۔

”بھئی میں نے سوچا جب یاد کر کیا تو ڈرتا کیا۔ تم سے ملنے کے بعد میرے.....“

اچانک ہی خیالات بدل گئے۔ جب تم میرے لیے اپنی جان کی پروا نہیں کر رہے تو میں کیوں کروں۔ بھڑا میں گھبراہٹ میں اور وہ..... پوسال اور یہ تمہارا جاسوس۔“

کاشمی کی مسکراہٹ کسی اور بات کی چٹلی کھا رہی تھی۔

طاہر ابھی تک الجھن کا شکار تھا۔

”کاشمی خدا کے لیے ہنس ختم کرو۔ تم جانتی ہو مجھے تمہاری زیادہ فکر ہے۔“ اس نے کہہ دی

دی۔

اور.....

کاشمی پر غشی کا دورہ پڑ گیا۔

بہتے بہتے وہ طاہر سے بغل گیر ہو گئی اور اسے اپنے ساتھ گھسیٹتی ہوئی جیپ کے نزدیک

ہی ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گئی۔

○ ○ ○

”طاہر مجھے تمہارے سامنے شکست کا اعتراب کرتے ہوئے شرمندگی ہو رہی ہے۔“

یقین جانتا میں نے زندگی میں کبھی اس انداز میں سوچا ہی نہیں تھا۔ میں اپنے کالج کی زندگی میں

بہترین اچھلیت تھی۔ محبت آئیڈیل تھی لیکن محبت کرنے کا شاید وقت ہی مجھے نہیں ملا یا پھر کوئی مجھے

متاثر ہی نہ کر سکا۔ کالج کی زندگی ختم ہوئی تو اپنی ایڈ وچر پسند طبیعت کے ساتھ میں نے یہ پیشہ اختیار

کر لیا۔ یہاں اپنی تربیت مکمل کرنے کے بعد مجھے فیلڈ میں بمشکل ایک سال کام کرنے کا موقع ملا

جس کے بعد مجھے اس کام پر لگا دیا گیا۔ جب سے اب تک مختلف تحریب کاری کیپوں میں میری

ڈیوٹی بنتی رہی ہے۔ میرے کام سے خوش ہو کر مجھے ”بنواری کیپ“ میں بھیج دیا گیا۔ یہ کسی بھی لڑکی

کے لیے بڑا اعزاز ہوتا ہے۔ میں شاید واحد لڑکی ہوں جسے تین سال کے اندر ہی اس کیپ میں بھیج

دیا گیا۔ اس دوران میں نے درجنوں تحریب کاریوں کو ٹریڈ کیا ہے۔ یہ میری ڈیوٹی ہے۔ مجھے

وقت آنے پر دیپٹی سیدو کے لیے کسی کی بھی سیدو کرنی پڑتی ہے۔ طاہر! یہ ابھی بات ہے یا بری۔

مجھے اس کا علم نہیں۔ میرے انسٹرکٹروں نے مجھے بتایا تھا کہ اپنے شاستروں کے مطابق ہمیں اپنی

جسم بھری کو بچانے کے لیے اپنا شریر (جسم) بھی ”تیاگنا“ پڑے تو یہ ہمارا کر تو ہے (فرض) ہے۔

میرے لیے یہ سب کچھ بڑے ”گر بھ“ (خوف) کی بات رہی ہے۔ میرے پاس نے مجھے بتایا تھا کہ

ہیڈ کوارٹر میرے کام سے بہت خوش ہے اور اب دوسری ایروڈپوسٹنگ کے متعلق سوچ رہے ہیں۔

جیسی جیسی بھی زندگی تھی میں اس سے مطمئن تھی۔ میں کبھی دھماک (غذابی) نہیں رہی

لیکن میرا سارا پرچار بہت دھماک ہے۔ کچھ عرصہ پہلے میری کسی بات سے ناراض ہو کر میری

موسیٰ نے کہا تھا مجھ پر دیوی ماں کا شراب پڑے گا۔ تب میں نے اس بات کو اہم نہیں جانا تھا۔ اسے معمولی بات سمجھ کر نظر انداز کر دیا لیکن اب مجھے لگتا ہے مجھ پر دیوی ماں کا شراب پڑ گیا ہے۔ تمہارے ساتھ ملاقات کے بعد مجھے یقین نہیں تھا کہ تم میری زندگی میں بھی یہ مقام حاصل کر لو گے جو آج سے ساتھ آٹھ سال پہلے کسی ہندو نوجوان کو حاصل کرنا چاہیے تھا۔ تم نے مجھے لاچار کر دیا ہے طاہر۔ بے بس کر دیا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ بے ساختہ رو دی۔

طاہر کو یوں لگا جیسے کسی نے پورے زور سے اس کے دل پر گھونسر سید کر دیا ہو۔ جیسے کسی نے اسے اچانک اس طرح سے چھوڑا ہو کہ اس کے بدن کا رواں رواں کا پٹنے لگا۔

اس کا دل نہانے کیوں بھرا آیا۔

”یہ اداکاری کبھی اس طرح حقیقت کا روپ بھی دھار لے گی۔“

یہ سوچ کر وہ رزا تھا۔

اسے یوں لگا جیسے اس نے کاشی سے جو کچھ بھی کہا تھا وہ سچ تھا جیسے اس نے سلیم کی مشاورت سے اداکاری نہیں کی۔ دراصل اپنے دل کی آواز کا کاشی تک پہنچا دی تھی۔ زندگی کے دس سال اسی چٹھے میں گزارنے کے بعد

درجنوں خطرناک اور جان لیوا مہمات سر کرنے کے بعد

اپنے ملک و ملت کے لیے کارہائے نمایاں انجام دینے کے بعد

ایک روز

اس طرح بلا آخروہ ”دا“ کی تربیت یافتہ کسی فاحشہ کی زلفوں کا اسیر ہو جائے گا۔ یہ

بچتا ہوا اس کی جان کو آگیا تھا۔

”نہیں..... نہیں۔“

اس نے خود کو تپلی دیتے ہوئے کہا۔

یہ تو ہمدردی کے جذبات ہیں۔ شاید اسے کاشی اگر سوال کی بے بسی پر رحم آگیا ہے۔

شاید اسے ہمدردی ہے اس سے یہ محبت نہیں..... اس نے سوائے اپنے عظیم مشن کے اپنے ملک و

ملت کے اپنے کا ز کے اور کسی سے محبت کرنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ یہ تو وطن سے اس کا مشق تھا جو اس

نے خود کو رضا کارانہ طور پر اس خطرناک فیلڈ میں دھکیلا تھا۔ ورنہ وہ تو آرمی آفیسر تھا۔ فوج کا باقاعدہ آفیسر جس کے کریڈٹ میں کئی کارنامے تھے۔ جب کبھی وہ اپنی وردی پہنتا۔ اس کا سارا میدان اعزازات سے بھر جاتا جو اس نے یکے بعد دیگرے حاصل کئے تھے۔

○ ○ ○

نیاب

وہ اپنی یونٹ کا مایہ ناز کمانڈر تھا۔

محیر العقول کارنامے اس سے وابستہ تھے۔

اور.....

آج..... آج یہاں ایک لڑکی کے سامنے وہ ہتھیار ڈال رہا تھا۔

یہ لڑکی اسکی منزل نہیں تھی۔

یہ تو راستے کا کوئی رنگ میل ہو سکتا تھا۔ وہ عشق کرنے نہیں بڑاڑی کپ کو تباہ کرنے آیا

تھا۔

میں اتنا کمزور نہیں ہوں کا منی اگر وال۔ مجھے اپنا مشن پورا کرنا ہے۔ میں تمہارے

ساتھ وہ تمام خراب کاری کپ ایک ایک کر کے تباہ کر دوں گا۔ جن سے تربیت حاصل کرنے

والے میرے ملک کے آستین کے سانپ میرے ملک میں تباہی و بربادی پھیلا رہے ہیں۔ نفرت

کی فصل بڑھ رہی ہے۔ سلامتی کے لیے چیلنج بن گئے ہیں۔

اس نے اپنے عزم کو دہرایا اور بڑے مضبوط قدموں پر کھڑے ہو کر کا منی کے کندھے

پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔

”کا منی اگر میرے کسی عمل سے تمہیں دکھ ہوا ہے تو مجھے معاف کر دینا۔ یہ میرا غیر

اختیار عمل تھا۔ تمہیں دکھ دینا میرا مقصد نہیں تھا۔ میں تو اپنے دل کے ہاتھوں بے بس تھا۔

اس کا دل نبھانے کیوں بھرا آیا لیکن..... بڑی مردانگی سے اس نے اپنے آنسو ضبط کر

لئے۔

دونوں نے پھٹکی آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دونوں مسکرا دیئے۔ اس

لحے کا منی کی آنسوؤں سے پھٹکی مسکراہٹ نے اسے ایک نئی زندگی کا احساس دلایا۔ کا منی اب

نازل ہو چکی تھی۔ اس نے طاہر کو سب کچھ بتا دیا تھا اور اسے کہا تھا کہ ”اب ایک“ پینچل کیس“ کی

حیثیت سے اس کے مکمل اختیار میں آ چکا ہے۔ کم از کم ہماری دوران تربیت وہ کا منی سے الگ نہیں

ہو سکتا۔“

”اور اس کے بعد.....؟“

نبھانے کس طاقت نے یہ فقرہ نہ چاہتے ہوئے بھی طاہر کے منہ سے کہلوایا۔

”طاہر ہنگو ان کے لیے یہ بات دوبارہ کبھی نہ کہنا۔ کبھی نہ کہنا۔ مجھے آج میں جی لینے دو

صرف آج میں۔ کل کیا ہوگا؟ مجھے یہ سوچ ہی مار ڈالے گی۔“

اس کی آواز طاہر کو کھین دور افق کے پار سے سنائی دے رہی تھی۔ اس لمحے وہ بالکل بدلی

ہوئی کا منی تھی۔ جب وہ طاہر سے بات کر رہی تھی اس کے چہرے کی کڑکٹی اور چالاک کی جگہ ایک عام سی

معصومیت سمٹ آئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ یہ سب کچھ خود نہیں کہہ رہی کوئی اور طاقت اس سے کہو لاری

ہے۔

دونوں خاموشی سے سامنے پہاڑ پر سورج کی روشنی سے سرخ ہوتے سبز درختوں کو

دیکھتے رہے۔ دونوں ہی خاموش تھے۔ دونوں کے پاس کینے کو تو بہت کچھ تھا لیکن دونوں کچھ نہیں

کہہ پارہے تھے۔

”آؤ تمہارا“ ہنسک ”مکمل کر لیں۔“

اس نے شرٹ کی آستین سے اپنی آنکھوں کی نمی صاف کرتے ہوئے کہا۔

”چلو۔“ جو متصل دل سے طاہر نے کہا اور دونوں پہاڑی سلسلے میں داخل ہو گئے۔ طاہر

کی بجائے اس کا سارا کام وہ خود ہی کرتی جا رہی تھی۔ شاید وہ ہوسوال کے لئے کوئی بہانہ باقی نہیں

چھوڑنا چاہتی تھی۔ اپنے تجربے کی بنیاد پر اس نے ایک گھنٹہ کا یہ کام پینچل آدھ گھنٹہ میں مکمل کر لیا

پھر طاہر کی جانب متوجہ ہوئی جو عمر زدہ معمول کی طرح اس سے بندھا چلا آ رہا تھا۔

”کیا بات ہے پُرنیشان کیوں ہو رہے ہو؟“ اس نے بے تکلفی سے طاہر کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر کہا۔

”کچھ نہیں۔ سوچتا ہوں کہ مجھ سے کوئی زیادتی تو نہیں ہو گئی۔ خدا جانے یہ سب کچھ۔“

اسے اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے مناسب الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے۔

”میں نے تو زیادتی کی شکایت نہیں کی مہاراج۔ اور اس کھیل کا آغاز بھی آپ ہی نے کیا ہے۔ اب خود ہی بھاگ جانے کے پتھر میں ہو۔ طاہر اب تم بھاگ نہیں پاؤ گے۔ یاد رکھنا۔“ اس نے عجیب سے لہجہ میں کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر جیب کی طرف واپس ہل دی۔ دونوں جیب کے پاس کافی دیر تک خاموش کھڑے رہے۔ ایک دوسرے سے بہت کچھ کہنے کی خواہش کے باوجود ان کے پاس مناسب الفاظ ہی نہیں رہے تھے۔ طاہر سوچ رہا تھا کہ اپنا کام مکمل کر کے جیب وہ چلا جائے گا تو کاغذی پر کیا گزرے گی۔ اور..... اس کے ساتھ طاہر کے بعد جو کچھ ہونے والا تھا اس کا قصوریہ یو الرزہ خیر تھا۔ طاہر نے پہلی مرتبہ خود کو عجیب سے محسوس کا شکار پایا تھا۔ دونوں یکجہ دیر اور اصرار کی باتیں کرتے رہے۔

کاغذی نے اس دوران آئندہ کے لائحہ عمل سے آگاہ کر دیا تھا اور خصوصاً اسے سمجھا دیا تھا کہ اسے پوسال سے بچ کر رہنا ہے۔ اس نے پوسال کے متعلق طاہر کو بہت کچھ بتایا تھا۔ کچھ اندازہ اسے پہلے ہی سے تھا اور باقی معلومات اسے کاغذی اگر وال نے ہم پہنچا دی تھیں۔

اس کی گفتگو کے خاتمے پر اس کے دل و دماغ نے پوسال کے لیے کم از کم سزا موت تجویز کی تھی۔ کاغذی اگر وال کی زبانی اسے علم ہوا تھا کہ اس کے ملک میں پھوڑا گروپ اور دہشت پھیلانے والے دوسرے واقعات کا بانی بھی پوسال ہے جس نے روسی کمانڈوز کے ساتھ کئی جلی کے زیرِ سرایت تربیت حاصل کی تھی۔ جہاں اسے زندہ جانوروں کو اپنے ہاتھوں سے مار کر اس کا خون پینے کی تربیت دی گئی تھی۔

جہاں اسے دو دو ماہ تک گھسنے جنگلات میں جنگلی پتے درختوں کی چھال اور جانوروں سے پیٹ کی آگ بجھانے کی تربیت دی گئی تھی اور وہاں سے اپنے اندر سزا موت کرنے والی ساری

ورنگی وہاب پاکستان کے خلاف استعمال کر رہا تھا۔

کاغذی نے اسے بتایا کہ دہشت پھیلانے کے نئے طریقے نکالنا کمیشن پوسال کا کام ہے اور ایس ایس بی کے کسی بھی کمرل سے زیادہ مراعات اور اختیارات کا مالک ہے۔ اس کیسپ میں موجود ”را“ کی جتنی بھی لڑکیاں ہیں ان میں سے کسی کی بھی یہ مجال نہیں کہ اس کے حکم کی سرتالی کر سکے۔ اس نے طاہر سے صاف کہہ دیا تھا کہ پوسال کو اگر واقعی یہ شک ہے کہ وہ کاغذی میں دلچسپی لے رہا ہے یا کاغذی اس میں دلچسپی لے رہی ہے تو وہ کسی سفلی کو خاطر میں نہیں لائے گا۔ ڈیپلن کی پابندی کے نام پر بظاہر کچھ بھی کرے گا لیکن اپنی شیطانی فطرت کی وجہ سے وہ ان دونوں کے لیے بے پناہ مسائل پیدا کر سکتا ہے۔ انہیں اپنے انتقام کی آگ میں اندھا ہو کر مار بھی سکتا ہے۔

کاغذی نے اسے بتایا تھا کہ ”آف دی ریکارڈ“ کسی بھی کارروائی پر پوسال سے کوئی پوچھ کچھ نہیں ہوگی۔

طاہر جانتا تھا کہ کاغذی اسے خوف زدہ نہیں کر رہی ہے بلکہ اسے ہوشیار کر رہی ہے اور اس نے سوچ لیا تھا کہ جب ساپ کے گل میں ہاتھ دے دیا ہے تو پھر ڈرکس بات کا۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ مشتاق اور سلیم اپنے مقررہ وقت پر وہاں پہنچ چکے تھے اور ایک مرتبہ پھر کاغذی اگر وال اپنے خورساختہ روپ میں واپس آ گئی تھی۔ جب کو بگائی ہوئی وہ انہیں کیمپ میں واپس لے آئی۔

○ ○ ○

”مائی فٹ۔“

پوسال نے اپنے سامنے دھڑے کرکٹ بھاپیہ کے تازہ ترین آرڈر پر ایک نظر ڈالنے کے بعد کاندھ کو اس طرح زمین پر دے مارا جیسے اپنی دانست میں وہ طاہر یا کاغذی اگر وال کو زمین پر پٹخ رہا ہو۔

”سالی نے اپنا باران بھانے کے لئے اب یہ بھانڑا شاہ ہے۔“

اس نے کاغذی کو گالی دیتے ہوئے کہا۔ اسے اب یقین ہو چلا تھا کہ جو کچھ بھی مشتاق نے کہا تھا وہ سچ ہی تھا۔ اب اس نے اپنی اگلی نکتہ عملی طے کرنی تھی۔ اس بات کا تو سوال ہی نہیں تھا تھا کہ وہ کاغذی یا طاہر کو معاف کر دے۔ اس کے نزدیک اس جرم کی کم از کم سزا موت تھی

اور.....

اس نے دونوں کو سزائے موت دینے کا حکم ارادہ کر لیا تھا۔ اسے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مناسب وقت کا انتظار تھا۔ اگلے دس بارہ روز اس نے معمول کی ٹریننگ میں گزار دیئے۔ اس دوران اس نے کبھی طاہر کو اہمیت نہیں دی تھی البتہ وہ اس کے سامنے کاٹنی اگر وال کے ساتھ یہود و مذاق ضرور کرتا رہا تھا۔

ایک دوسرے تو طاہر کا خون بھی کھولا کیونکہ وہ اب کاٹنی سے متعلق کچھ عجیب و غریب جذبات کا شکار رہنے لگا تھا۔ لیکن..... کاٹنی اور پھر مسلم کی سختی سے دی گئی ہدایات کے تحت اس نے خود کو مارل رکھا۔ سلیم کو اس نے ایک ایک لمحے کی مصروفیات سے آگاہ رکھا تھا۔

اس دوران کاٹنی اسے قریباً ہر دوسرے تیسرے روز اکیلے اپنے ساتھ ”لائف ڈرائیو“ پر لے جاتی تھی اور گزشتہ تین چار روز سے طاہر کو پکے کے ایریا سے باہر نکلنے ہی خود راہیو گنگ سیٹ سنہال لیتا تھا۔ وہ جان بوجھ کر کسی غلط پہاڑی راہ سے پڑ جاتا اور کاٹنی اسے روک دیتی۔

طاہر اس دوران اس سے غلط راستے کی تفصیلات اس طرح جان لیتا تھا جیسے یہ سب معمول کی باتیں ہوں۔ قدرت اس کے لیے خود ہی آسانیاں فراہم کر رہی تھی۔

تین چار مرتبہ کپکپ سے باہر دیرہ دون کے پہاڑوں اور جنگلوں میں سے گزرتے راستوں پر سڑ کرنے کے بعد اسے کم از کم کپکپ کے چادرول طرف فرار کے راستوں کا علم ہو گیا تھا۔ اب وہ بڑے اعتماد سے یہاں سے باہر نکل سکتے تھے اور کوئی بھی راستہ اختیار کر سکتے تھے۔ کبھی کبھی طاہر کا ضمیر اسے غلامت بھی کرنے لگتا تھا کہ وہ کہیں اپنے مقصد کی بجائے آوری کے لیے کاٹنی اگر وال پر غلام تو نہیں کر رہا ہے۔

وہ جانتا تھا اس فرار کے بعد ”را“ کاٹنی کے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔ اسے کاٹنی پر بہت رحم آتا تھا۔ لیکن..... اپنے مشن کی مقصدیت کے سامنے اسے یہ تمام جذبے بچھ دینا پڑتے۔ کاٹنی کو شاید باتیں کرنے کا خون تھا یا پھر یوں لگتا تھا جیسے اسے زندگی نے مکمل مرتبہ سب کچھ کھردینے کا موقع دیا تھا اور اب وہ اسے کھو نہائیں چاہتی تھی۔ اس نے اپنے بچپن سے رات بک ساری کہانی طاہر کو سنائی تھی۔

طاہر نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کاٹنی را کے تربیتی مراکز تک پہنچنا سوائے ایک جذباتی حادثے کے اور کچھ نہیں۔ وہ اندر سے مکمل عورت تھی۔ ایک بھر پور مشرقی عورت جو زندگی کے بیشتر فیصلے عقل کی بجائے دل سے کیا کرتی ہے۔

اس نے یہ فیصلہ بھی دل ہی دل میں کیا تھا جس کا غیاز وہ آج تک بھگت رہی تھی۔ طاہر نے اندازہ لگا لیا کہ ان تجرباتی کیسیوں میں وہ جو بھی خدمات سرانجام دے رہی تھی اس میں ”دلش سیوا“ کا جذبہ کم اور خوف کا عنصر زیادہ شامل اور نمایاں تھا۔ شاید اسے علم تھا کہ ایک مرتبہ را کی اکیڈمی سے سند ملنے کا مطلب ہے گرداب میں پھنس جانا۔ اب اسے ساری زندگی اسی گرداب ہی میں چکر کاٹنے بسر کرنی تھی۔ اس نے چونکہ اپنی مرضی سے اس دلدل کا انتخاب کیا تھا اب جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہی تھی اس میں اور زیادہ وضاحتی پہلی جا رہی تھی۔

طاہر سے متعلق کچھ بھی خیالات کاٹنی اگر وال کے بھی تھے۔ اس نے بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ وقتی جذباتیت اور معاشرتی ناہمواریوں کے خلاف اپنے دل میں پیدا ہونے والے انتقام کے اندھے جذبے نے اسے اس جہنم کی طرف دھکیل دیا ہے۔ جہاں اس کے لیے سوائے ذلت اور موت کے کچھ نہیں ہے۔ کبھی کبھی اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ طاہر کو یہاں سے بھاگ جانے کے لیے کہہ دے۔ اس انکشاف کے بعد کہ اسے طاہر سے محبت ہو گئی ہے اسے اپنے اندر ایک عجیب سی تبدیلی کا احساس ہوا تھا جیسے کسی نے ٹرانسپلانٹ کر کے اس کے اندر نبادل رکھ دیا ہو۔ اپنے دھرم کے متعلق اس کے جذبات اور نظریات اس سے بے یاس کے گمراہیوں سے کبھی ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ بچپن ہی سے حیرت انگیز طور پر وہ اندر جانے سے بچ پاتی تھی۔ البتہ اپنے گھر سے کچھ فاصلے پر ”بابا جی سرکار“ کے مزار پر قوالی سننے ضرور چلی جایا کرتی تھی۔ گمراہیوں کے لیے بھی خود کاٹنی کا بھی یہی خیال تھا کہ اسے میوزک سے دلچسپی کی وجہ سے قوالی پسند ہے۔ اور یہی شوق اسے ”بابا جی سرکار“ کے پاس لے جایا کرتا تھا۔

گزشتہ چھ سال سے اسے بابا جی سرکار کے پاس بھی بمشکل چار پانچ مرتبہ ہی جانے کا موقع ملا تھا۔

○ ○ ○

اس روز جب دونوں اپنی معمول کی تربیت مکمل کرنے کے بعد شام ڈھلے مشتاق اور

○ ○ ○

سلم کو کمپ میں چھوڑ کر اپنے معمول کے مطابق دوبارہ واپس جا رہے تھے اور پہاڑی سلسلے کے ایک قدرے محفوظ گوشہ عافیت میں قدرتی گھاس کے فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھے باتوں میں مشغول تھے تو اچانک ہی طاہر کے اچھے ہوئے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کامنی نے ایسی بات کہہ دی کہ طاہر بے اختیار سن کر سیدھا ہوا گیا۔

”طاہر کبھی کبھی میرا دل کہتا ہے کہ تم یہ سب کچھ غلط کر رہے ہو۔ یا شاید تم وہ نہیں ہو جو تم بظاہر دکھائی دیتے ہو۔ ان دونوں میں سے ایک بات سچ ہے پہلی یا دوسری۔ اگر تم نہ بھی جانتا یا ہو تو بھی یہ بات سچ ہے کیونکہ کبھی کبھی میری چھٹی حس مجھے بالکل صحیح بات کہہ دیتی ہے۔“ اس نے اچانک ہی کہا۔

طاہر کو تو ایک دفعہ زوردار ہلکا لگا لیکن دور سے ہی لمبے وہ سنہیل کیا۔ ”ہاں کامنی تم سچ کہتی ہو۔ میں بھی کبھی کبھی تمہارے متعلق یہی گمان کرتا ہوں کہ تم جو کچھ دکھائی دے رہی ہو اصل میں وہ نہیں ہو۔ یوں لگتا ہے جیسے تم نے زبردستی اپنی شخصیت پر کوئی خول چڑھا رکھا ہے۔ تم جیسی لڑکی کا انتخاب ایسے کاموں کے لیے میرے خیال سے تو مناسب نہیں۔ کہاں یہ ماروھاڑ، قتل و غارت گری اور کہاں تم۔“

اس نے اپنی دانست میں سنہیل کر جوابی حملہ کیا تھا لیکن..... اس روز نچانے کامنی کو کیا ہوا۔ وہ موضوع بدلے پر تیار نہیں تھی۔

”طاہر میں جانتی ہوں کہ تم یہ بات براے بات کر رہے ہو۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم کبھی سچ نہیں بتاؤ گے لیکن مجھے سچ کا علم ہے۔ میں دھرم پر کچھ ایسا درشاں تو نہیں رکھتی، لیکن مجھے یوں لگتا ہے جیسے دیوی ماں نے مجھے کوئی ایسی شہتی دے دی ہے جو مجھے ان باتوں سے آگاہ کر سکتی ہے۔ طاہر تم گھبراؤ نہیں۔ اگر کبھی وہ کچھ سچ بھی بھلا جو میرا وجدان کہہ رہا ہے تو بھی میں شاید دل کے ہاتھوں اتنی مجبور ہوں کہ وہ کچھ نہیں کر پاؤں گی جس کے لیے مجھے تجوہا ملتی ہے۔ اور جو میرا ”کرتوے“ (فرض) ہے مجھے علم نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بو جھل ہو گئی۔

طاہر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہے، کامنی کھڑی ہو گئی۔ ”آؤ کہیں اور بیٹھیں۔“ اس نے زبردستی اپنی آنکھوں میں آئے آنسو روکے ہوئے تھے۔

”کامنی تم.....“ طاہر نے کچھ کہنا چاہا لیکن کامنی نے اس کے منہ پر انگلی رکھ کر خاموش کر دیا۔

”باقی باتیں پھر کبھی۔“

یہ کہہ کر وہ طاہر کا ہاتھ پکڑ کر اسے قریب کھینچتی ہوئی بیپ تک لے گئی۔ ڈرامیٹک سیٹ پر وہ خود بخود چلی تھی۔

جیپ کا رخ اب ڈیڑھ دوں شہر کی طرف تھا۔ طاہر کچھ گیا تھا کہ کامنی اسی ہوٹل کی طرف لے جا رہی ہے جہاں وہ اس سے پہلے بھی دوسرے جا چکے تھے۔ یہاں وہ اسے ہمیشہ خصوصی ”فریٹ“ دینے کے لئے لے جایا کرتی تھی۔

”کامنی تم میری وجہ سے پریشان ہو گئی ہو کیا؟“

قریباً دس منٹ کی مسلسل خاموشی کے بعد طاہر نے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن آف کرتے ہوئے کامنی سے پوچھا، جس کو کامنی نے شاید گفتگو سے بچنے یا اپنے جذبات چھپانے کے لئے جیپ میں بیٹھے ہی اشارت کر دیا تھا اور جس کی آواز اب طاہر کو تکلیف دہ لگنے لگی تھی۔

”طاہر زندگی جتنی بھی ہے جتنا بھی ہمارا ساتھ ہے۔ یہ بات دوبارہ کبھی مت کہنا۔ مجھے اس سے بہت دکھ ہو گا۔ میں اپنی نہیں تمہاری وجہ سے پریشان رہتی ہوں۔ تم..... تم..... میں کیا کروں۔ میں تمہیں کیا کہوں۔ طاہر تم اس دنیا سے نکل جاؤ۔ تم دھوکے کا شکار ہو۔ تم جو کچھ کر رہے ہو غلط ہے۔ ایک دم غلط۔ کیا معاشرے سے انتقام لینے کے لیے کوئی اپنے گھر کو آگ لگا دیا کرتا ہے۔ وہ یہ کیسا انتقام ہے طاہر؟ تم اپنے دلش کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرو گے۔“

اس نے اچانک ہی جیپ سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے رک دی تھی اور طاہر بھونچکاں اس کے منہ کی طرف ٹکڑ ٹکڑ کچھ دیا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے کان جو کچھ سن رہے ہیں وہ واقعی کامنی اگر وہاں کے منہ سے براہِ مدہور ہا ہے۔

”طاہر حیران نہ ہونا“ میں اپنے دلش سے ننداری کر رہی ہوں۔ مجھے انہی کی طرف سے جھپٹ صیحت کرنے کی نہیں، جھپٹیں روٹلا کر تمہارے ہاتھوں تمہارے ہی بھائی بندوں کے خلاف جہاں پھیلانے کی تجوہا دی جاتی ہے، لیکن بھگوان جانے مجھ میں کہاں سے میرا ضمیر زندہ ہو

گیا ہے۔ کبھی یہ بچہ اچھا نہیں لگتا ہے۔ تمہارے ہاتھوں یہ سب کروانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔“
 وہ بگڑ کر وہ باقاعدہ اس کے کندھے سے سر لگا کر رو دی۔ طاہر چکر آ کر رہ گیا۔ کہیں یہ
 کریم نہیں ہوگی۔ کہیں اس کی اصلیت جانے کے لیے ”را“ نے کامی آ کر دال کو اس کے ساتھ تو نہیں
 چھپا دیا۔ اس کا دل یہ بات تسلیم نہیں کر رہا تھا، لیکن..... اسے دل کی نہیں عقل کی ہدایت پر عمل
 کرنا تھا۔

”کاشی پلیز نائل ہو جاؤ پلیز۔ یہ ہم دونوں کے لیے خطرناک ہو گا۔ یہاں کوئی بھی
 آ سکتا ہے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

اس نے کاشی کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

شاید کاشی نے بھی اس صورت حال کی عقلی کا احساس کر لیا تھا کیونکہ وہ شہر کے نزدیک
 آرہے تھے اور اب سڑک پر ٹریفک کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔
 ”آئی ایم سوری۔“

کاشی نے اپنی آستین کے پلو سے اپنا چہرہ صاف کیا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔
 آنسوؤں سے بھیگی اس کی یہ مسکراہٹ کسی تیزے کی آبی کی طرح طاہر کو اپنے گلیچے میں اترتی ہوئی
 محسوس ہوئی۔

○ ○ ○

اس مرتبہ اس نے ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا تھا اور اپنی سیٹ پر بدن ڈھیلے چھوڑ کر آرام
 سے خود کو حالات کے محم و کرم پر چھوڑ بیٹھا رہا۔ کاشی کی باتیں مگر ارین کے اس کے دل و دماغ میں
 گونج پیدا کر رہی تھیں اور وہ مسلسل ایک ہی گرداب میں پھنس کر رہ گیا تھا کہ کیا یہ کاشی کے دل کی
 آواز تھی؟ یا پھر وہ اسے ”ٹریپ“ کر رہی تھی۔

گوکہ بار بار سوچتے اور غور کرنے پر بھی اسے پہلی بات سچ دکھائی دیتی تھی، لیکن اس نے
 ابھی تک اس سچائی کو عقل سے تسلیم نہیں کیا تھا اور اپنے آپ سے سختی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ دل کی
 باتوں پر اپنی الوقت کا نہیں دھرے گا۔

ذریعہ دون آ گیا تھا۔

کینٹ ایریا کے خوبصورت ہوٹل ”آکاش“ کی پارکنگ میں کاشی نے جیب کھڑی کر

دی۔ اپنے دشمنی بیک سے شیشہ نکال کر اس نے نظر اپنے چہرے پر ڈالی اور اپنی بے بسی پر شاید خود
 ہی مسکراتے ہوئے ٹشو پیپر سے چہرے کو ٹھیک کیا، پھر بلا ہرجرت انگیز طور پر نائل ہوتے ہوئے
 طاہر کا ہاتھ پکڑ کر نیچے اتر آئی جو بیپ سے نیچے اتر کر اس کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔

○ ○ ○

دونوں ابھی ہوٹل کے مین گیٹ پر ہی پہنچے تھے جب مین گیٹ کے سامنے تین کاریں
 یکے بعد دیگرے آ کر رکیں اور کسی نے ”بے خدائی رایش مہاراج کی“ کا نعرہ لگایا۔ اس آواز پر
 اچانک ہی رک کر کاشی نے اس کی طرف گردن گھمائی۔

ایک مرسیڈس بیز کار سے ”راکیش مہاراج“ برآمد ہو رہے تھے اور ان کے پندرہ میں چیلے
 چاہنے ان کے گرد حلقہ باندھے شاید انہیں ہوٹل کے دروازے تک اپنے جیلوں میں لے جانے کی تیار
 کر رہے تھے۔

”اوہ مائی گاڈ۔ یہ کم بخت کہاں سے آ گیا۔ پلو واپس چلیں۔“ کاشی نے طاہر سے کہا
 اور دونوں انہی قدموں پر واپس گھوم گئے۔

غور و دال میں کچھ کالٹھا لیکن طاہر نے یہاں کچھ پوچھنا مناسب نہ جانا اور اس کے
 پیچھے پارکنگ تک آ گیا۔

کاشی نے اپنی کھڑی میں وقت دیکھا اور جیب کا رخ شاید کسی دوسرے ہوٹل کی طرف
 کر دیا۔

طاہر چپ چاپ اس کے ساتھ بیٹھا اس کے افعال کا جائزہ لے رہا تھا۔

○ ○ ○

منتخب لائبریری و جلدیں
 0333
 2115358
 لکھنؤ دارالافتاء و صاحب دہال

تین چار منٹ سے چپ چاپ بیٹھا تھا۔

”ہاں شاید۔“

اس نے ٹھنڈی آدھ کر بھر کر نگاہ کاٹنی کو یہ بتانا چاہا کہ اسے بھی افسوس ہو رہا تھا اور شاید وہ بھی آج کاٹنی سے بہت کچھ کہنا سنتا چاہتا تھا۔

”کم بخت نے ساری شام برا کر دی۔“

کاٹنی نے سڑک پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”یہ سوامی جی مہاراج ہے کون؟ اور کوئی بھی ہوا آخر۔“

طاہر کی بات مکمل ہی رہی۔ کاٹنی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”دیکھو میں ابھی شاید تمہارے ہر سوال کا جواب اندوے پاؤں۔ بس یہ سمجھ لو کہ تمہارا اس کے سامنے نہ جانا ہی دونوں کے لیے بہتر تھا۔ دیکھو طاہر میرا من کہتا ہے کہ تم کسی خاص مشن پر ہو۔

یہ میں نہیں کہتی اپنے دلش کی طرف سے یا بھگوان کی طرف سے۔ بہر حال گتا ہے کہ تم ایک دن اس سب کچھ کو چھوڑ کر بھاگ چاؤ گے۔ کیونکہ تم اس سیٹ اپ میں ان فٹ ہو۔ شاید تم محض اپنے

اشتعالی جذبہ کی تسکین کے لیے یہاں تک آ گئے ہو۔ شاید تمہیں پرماتما کسی خاص مشن کے لیے تیار کر رہا ہے کیونکہ یہ سارا گورکھ دھند جو یہاں پہنچایا گیا ہے اس کا مقصد سوائے انسانیت کی

جہاں کے اور کچھ نہیں۔ یہاں انسانوں کو جیدان بنایا جاتا ہے۔ انہیں درد بے بنا کر اپنے ہی لوگوں کے خون سے ہولی کھیلنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے اور تم ابھی تک انسانیت کی سطح سے گرے نہیں۔

ابھی مجھے تمہارے اندر وہ دردنگی دکھائی نہیں دی جو یہاں آنے والوں میں نظر آتی ہے۔ یا تو تم بڑے اداکار ہو اور میرے ساتھ محبت کا جھوٹا کھیل رچا رہے ہو۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر تمہیں ایک روز

یہاں سے بھاگنا ہوگا کیونکہ محبت کرنے والے اپنے بچوں کو ہم دھاکوں سے نہیں اڑا لیا کرتے۔ اپنے ہشتے بستے گھروں کی سیٹوں اور کھانیاؤں کو اجاڑ نہیں کرتے۔ تم میری باتیں سن رہے ہو نا؟“

اس نے اچانک ہی چپ سڑک کے کنارے گھٹے درختوں کے ایک جھنڈ میں کھڑی کر کے اس کی آنکھوں میں جھماکتے ہوئے کہا۔

طاہر ہنسنے لگا۔

یہ بڑا بھروسہ نفاذی حملہ تھا۔

کاٹنی کے چونک جانے کا انداز اتنا فطری اور اچانک تھا کہ طاہر کو کچھ دیر کے لئے سیریس ہونا پڑا۔ اس نے ابھی تک سوامی کی ایک جھلک دور ہی سے دیکھی تھی لیکن اس کا سراپا ایک نظر دیکھنے پر بھی طاہر کے دل و دماغ پر نقش ہو گیا تھا۔

”کون ہے یہ؟“

اس نے حیران و پریشان کاٹنی سے دریافت کیا۔

”لعنت بھیجو آؤ چلیں۔“

کاٹنی نے اپنی دانست میں یہ کہہ کر جان چھڑائی تھی۔

”لیکن۔۔۔۔۔“

طاہر کا تجسس قائم تھا۔

وہ کاٹنی کے تعاقب میں کار پارکنگ ایریا کی طرف جا رہا تھا جہاں انہوں نے چپ پارک کی تھی لیکن اس کی آنکھیں ابھی تک وہیں جمی تھیں۔

سوامی اب ہونٹ کے دروازے سے اندر داخل ہو گیا تھا اور اس کے تعاقب میں آنے والی بھیڑ بھی اندر ہی چلی گئی تھی۔

دونوں ایک مرتبہ پھر چپ میں بیٹھ گئے تھے۔

”شاید یہ موسم محبت کے لیے سازگار ہی نہیں۔“

کاٹنی نے اس کا دھیان ہٹانے کے لیے کہا کیونکہ اس نے نوٹ کیا تھا کہ طاہر گزشتہ

اسے سنبل کر جوانی وار کرنا تھا۔ وہ جانتا تھا کاشی کچ کھڑی ہے۔ وہ بہر حال عورت تھی جس کے دل میں اس نے اپنے جھوٹے سچے جذبے سے محبت کی جوت جگا کر اسے اس کی اصلیت کی طرف واپس لوٹا دیا تھا۔

وہ جانتا تھا کاشی کچ کھڑی ہے۔

نہیں.....

کیا یہ کچ اس کی اصلیت اگوانے کے لیے بولا جا رہا ہے؟ یا پھر کاشی اسے احساس دلا رہی ہے کہ وہ واپس چلا جائے گا کیونکہ اس کی زندگی کا جہاز کسی غلط سیارے پر لینڈ کر گیا ہے۔ یہ اس کی منزل نہیں۔

یہ تو سراب ہے۔ سراب.....

کاشی اسے اس دھوکے دینے کے نال دینا چاہتی تھی۔

اگر یہ کچ تھا تو کاشی اسی لمحے دنیا کی عظیم ترین عورت بن کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔

وہ اپنی زندگی کا ایسا جوا کھیل رہی تھی جس میں سوائے ہار کے اور کچھ نہیں تھا۔ جس کا انجام سوائے ایک اذیت نام موت کے سوا کچھ نہیں تھا۔

○ ○ ○

طاہر کو ہالی وڈ کی وہ فلمیں یاد آ گئیں جو اس نے دیت نام کی جنگ پر دیکھی تھیں جہاں کسی جوا خانے میں بھرے ہوئے پتول کے ساتھ ہارنے والے کی کینٹی پر یہ کہہ کر فائر کیا جاتا تھا۔ کہ میگزین میں ایک گھر خالی ہے اور دوسرا بھرا ہوا ہے اور ہر دفعہ پتول کا ٹریگر دہنے سے تماشا بینوں کے دلوں کی دھڑکن کس طرح رک جیلا کرتی تھی۔

آج حالات نے اس کے ہاتھ میں خالی میگزین والا پتول دے کر کاشی کو اس کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا تھا۔

اب اسے کاشی اگر وال کی کینٹی پر گولی چلائی تھی۔

اور.....

اس کا انجام کیا ہوتا؟

وہ بخوبی جانتا تھا۔

اس کے دل نے اسے گمراہ نہیں ہونے دیا تھا، لیکن آج نبھانے کیوں طاہر کو لگا جیسے اس کا دل اس کا ساتھ چھوڑ رہا ہے کیونکہ وہاں سے کاشی کے متعلق کیے گئے سوال کا ایک ہی جواب آ رہا تھا۔

کاشی جیسا ہے۔

وہ اس کی طرح اداکاری نہیں کر رہی۔

کسی کمزور ترین لمحے میں اس نے کاشی کی طرف کیونچہ مہاراج کا جوتیر چلایا تھا وہ سیدھا اس کے دل میں ترازو کر گیا تھا۔

اور.....

اسے احساس ہو گیا ہے کہ دلش بھگتی کے نام پر اس کی زندگی تماشا بن چکی ہے۔ یہ تو کوری تو دی اور بھارت کے دوسرے بڑے شہروں کے ہوٹلوں میں کرنے والی پیشہ ور کال گرلز سے بھی زیادہ بری تھی۔

وہاں تو ہر کال گرل کو اس بات کا علم ہوتا تھا کہ وہ جسم فروشی کی قیمت اپنی مرضی سے وصول کر رہی ہے۔

اور..... یہاں

یہاں اس کا جسم ہی نہیں دل و دماغ بھی گروڈی رکھ کر ان کے آقا اپنی مرضی سے اپنی قیمت پر فروخت کر رہے تھے اور بکتے والی کے ہاتھ سوائے ایک بدنام بچھتاوے کے اور کچھ نہیں آتا تھا۔

اپنی دوسری بہت سی دوستوں کی طرح آج کاشی اگر وال کے ضمیر نے بھی اس سے دریافت کیا کہ ایک طرف تو ان کا دھرم مسلمانوں کو کٹھ بھتا ہے اور دوسری طرف.....

بھارت ماتا کی اکھنٹا کے نام پر ان کے جیون کا بلییدان (قربانی) کیا جا رہا تھا۔

انہی مسلمان نوجوانوں کو گمراہ کرنے کے لیے ان کے جسم پیش کئے جا رہے تھے۔ اپنی دلش بھگتی کے نام پر حکم دیا جا رہا تھا کہ فلاں ایجنٹ کا بستر گرم کر کے اسے اپنے دام تڑویں میں پھنسا لو تاکہ پھر وہ تمہاری زلفوں کا اسیر بن کر تمہارے اشاروں پر بندروں کی طرح ناچتا رہے اپنے ہم مذہبوں ہم وطنوں کا خون بہا رہے۔

یہ سب کیا تھا؟

آخر یہ بڑے بڑے دھرماتما (غریبی اور سیاسی لیڈر) کسے دھوکہ دینے جا رہے تھے۔
گذشتہ تین چار سالوں میں کاشمی نے کئی مسلمان نوجوانوں کو اپنے ناز و ادا سے
”غدار“ کے لیے آباد کیا تھا۔

اب تو اسے ڈھنگ سے ان کے نام بھی یاد نہیں آ رہے تھے۔

اور اسے اس کا عوصان کیا ملا؟

کچھ خصوصی اساتذہ کچھ نقد انعامات..... اور ”ایراڈ پوسٹنگ“ کا وعدہ
لغت ہے۔

اسے اپنے آپ سے اپنے دھندے سے جسے پیشہ کا نام دیا جاتا تھا، تمہن آنے لگی تھی۔
”کاشمی..... میں جانتا ہوں تم مجھ سے کیا سنتا چاہتی ہو؟ لیکن ابھی میں تمہارے کسی
سوال کا جواب نہیں دے پاؤں گا۔ دراصل ہر سوال کا جواب اتنی جلدی دیا نہیں جاسکتا۔ بہت
سے سوالوں کے جوابات وقت دیا کرتا ہے۔ ہاں ایک بات میں ضرور کہوں گا کہ وقت جلد آنے
والا ہے جب تمہیں ان تمام سوالوں کا جواب ضرور ملے گا۔ میں تمہیں صرف ایک بات کا یقین دلا
سکتا ہوں کہ میں تمہارے ساتھ زندگی کے آخری سانس تک غلطیوں کا اور یہ کہ میں نے محبت
کے جن جذبات کا اظہار کیا ہے، ممکن ہے وہ پہلے جھوٹ ہی ہوں لیکن یہ میری زندگی کا سب سے
بڑا سچ ہے اور اس سچ کی مجھے جو بھی قیمت ادا کرنی پڑے میں ضرور ادا کروں گا۔“

اس نے کاشمی کی آنکھوں کے راستے اس کے دل میں اپنے الفاظ کے ذریعے سچائی کی
ایسی طاقت اتار دی تھی جس نے کاشمی کے دماغ کے قدموں کو مضبوط کر دیا۔

اس کے دل و دماغ پر بے شکوک و شبہات کی گہری دھندلے سورج کی تیز کرنوں کے
ساتھ اچانک تحلیل ہو گئی۔

اب سامنے کا منظر واضح تھا۔

کاشمی کو اپنے تمام سوالوں کے جوابات مل گئے تھے۔ گو کہ یہ ”آن دی ریکارڈ“ جوابات نہیں
تھے۔

لیکن.....

ظاہر کے منہ سے نکلے ایک ایک لفظ کی سچائی نے اس کے اندر بیٹھے خوف اور وسوسوں
کے سارے اندھیروں کو چاٹ لیا تھا۔

اب وہ بڑے صاف اور واضح ذہن سے کوئی بھی فیصلہ کر سکتی تھی۔ اب اسے اپنے کسی
لفظ یا صحیح فیصلے پر کوئی پچھتاوا نہ ہوتا۔

اور.....

وہ سبھی چاہتی تھی۔

اب وہ غلامی کے اس طوق کو جو ایک ہندو گھرانے میں جنم لینے سے اس کے گنگے میں
دھرم اور دیش منگشی کے نام پر ڈال دیا گیا تھا، اتار کر پھینک سکتی تھی۔ مکمل اعتماد اور بھروسے کے
ساتھ۔

ایک سرشاری کے عالم میں۔

فتح کے احساس سے۔

سر بلندی اور فخر کے ملے جلے جذبات سے اس نے ظاہر کی طرف دیکھا اور اس کے
سر پر اے کو دو قاب اور یک جان بنا ڈالا۔

طمینانیت کے لمحات اسے اگلے گھنٹوں کی سیر کروانے لگے تھے۔ اسے اپنا وجود ہلکا ہو
کر آسمانوں پر تیرتا محسوس ہونے لگا تھا۔

مدھوشی کی ایک رنگ و پے میں سرایت کر جانے والی کیفیت نے اسے اپنی پیٹ میں
لے رکھا تھا۔ جب سامنے سڑک پر دور سے آنے والی کسی گاڑی کے ہارن کی آواز نے جو یہاں کی
ٹیز می میڑ می پھاڑی سڑکوں کا مؤثر مزے ہوئے سامنے سے آنے والے ڈرائیور بجایا کرتے تھے
کاشمی کو عالم ہوش میں واپس لوٹا دیا۔

بادل ٹو استہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوئے اور جیپ بھر سڑک پر پھٹنے لگی۔

کافی دیر تک دونوں اپنے اپنے دل کی دھڑکن سننے رہے۔ شاید دونوں ہی ایک
دوسرے سے بات کرنے کی خواہش رکھنے کے باوجود آگے مل کر بات نہیں کرنا چاہتے تھے جیسے
دونوں ایک دوسرے کے چور تھے اور دونوں نے ایک دوسرے کی چوری پکڑ لی تھی۔ دس پندرہ
منٹ خاموشی کی بھیبت چڑھ گئے۔

سڑک کے دو روپہ کھڑے تباہ درختوں کے چوں کی سرسراہٹ جس میں جپ کے انجن کی آواز بھی شامل تھی دروازوں سے نکلا کر بڑی زوردار آواز پیدا کر رہی تھی اور دونوں خواب کے مسافروں کی طرح جپ کو بھاری طرح اڑاتا ہوا محسوس کر رہے تھے۔

بنواری آنے والا تھا۔

ریسٹ ہاؤس والی سڑک سے دو اپنی منزل کی طرف گھوم گئے۔

سڑک کے دورویہ بجلی کے گھبوں پر لٹکے لمبوں کی زرد روشنی سیاہ تارکول میں لپٹی سڑک پر پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ رہی تھیں۔

”سوای اگر زندگی کے کسی موڑ پر مل جائے تو اس سے بچ کر رہنا۔ انجینی میں اسے کوئی بہت خصوصی حیثیت حاصل ہے۔“

اچانک ہی کاٹھی نے سامنے سڑک پر نظر میں جھٹکتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر بغیر کہا اور اسے چونکا دیا۔

”تھیک ہو۔“

بے ساختہ ظاہر کے منہ سے نکل گیا۔

”اس کی ضرورت نہیں تھی۔“

کاٹھی نے پچھلی مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی۔

دونوں اب مین گیٹ سے اندر داخل ہو رہے تھے۔

کاٹھی جپ کو ہیرک تک لے آئی تھی۔

”Please be normal“

اس نے ظاہر کو اترنے کا اشارہ کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر اپنے اندر کے ڈر سے روشناس کرایا۔

”Please be brave“

ظاہر نے اس کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا اور نیچے اتر گیا۔

اس نے سڑک کاٹھی کی طرف نہیں دیکھا تھا جو اس کے ہیرک کو جانے والے راستے کی

سبز حیاں چھٹنے تک اس کی مختصر رہی پھر ظاہر کو جپ شارٹ ہونے کی آواز سنائی دیا اور کاٹھی

آگے بڑھ گئی۔

○ ○ ○

دونوں اسی بات سے قطعی بے خبر تھے کہ ان کے گیٹ سے اندر داخل ہونے سے یہاں تک کے ایک ایک لمحے کا ٹپٹپ پوسال نے اپنی نفرت بھری آنکھوں سے مکمل نظر اکر لیا ہے۔ مین گیٹ پر موجود اس کے خبرنے انٹرکام کے ذریعے پوسال کو جو اس وقت ٹی وی پر ایک بیلیئم سے لطف اندوز ہو رہا تھا دونوں کی آہ کی خبر دی تھی۔ اور پوسال ٹی وی کا سوئچ آف کر کے پھرتی سے اپنی ٹائم وین (اندھیرے میں دیکھنے والی) دور بین آنکھوں سے لگا کر اپنے کمرے کی کھڑکی سے انہیں اندر داخل ہوتے دیکھ رہا تھا۔

اس کا کمرہ رہائشی بلاک کے فرسٹ فلور پر تھا جہاں سے سارا منظر بڑا واضح دکھائی دے رہا تھا۔

غصے اور نفرت سے اس کے بدن پر چوہنیاں رینگ رہی تھیں۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ابھی جائے اور دونوں کو لازیت ناک موت سے دوچار کر کے اپنی فتح کا جشن منائے۔ وہ ایسا کرنے کا اختیار بھی رکھتا تھا۔

لیکن.....

کمرے میں بھاپیہ نے ”سچ کس کس“ کی فائل اس تک پہنچا کر اس کے ہاتھ باندھ دیئے تھے۔ اس سے پہلے دنیا کی کوئی طاقت کاٹھی کو اس کے بستر تک پہنچنے سے نہیں روک سکی تھی۔ وہ اتنا با اختیار تھا کہ جب چاہتا یہاں موجود انٹرکام لڑکیوں میں سے ایک کو بھی اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آتا۔

یہاں کی کسی لڑکی کی جرأت نہیں تھی کہ اس کی مرضی کے خلاف معمولی سا احتجاج بھی بلند کر سکے۔ اگر وہ کاٹھی کے خلاف اب ”آن ریکارڈ“ کوئی حرام کاری کرتا تو اس مسئلے کا سیریس نوٹس لیا جاسکتا تھا کیونکہ بریگیڈیئر ملہوترا کی غیر موجودگی میں کمرے میں بھاپیہ مکمل اختیارات کا مالک تھا اور ملہوترا کا زودیکی ساتھی ہونے کی وجہ سے بات کوئی غلط رخ بھی اختیار کر سکتی تھی۔

بریگیڈیئر ملہوترا ہی کی وجہ سے تو وہ یہاں راجا بنا ہوا تھا۔ اس کی تمام تر بد معاشریوں کی مکمل پشت پناہی ملہوترا کی طرف سے ہی ہوتی تھی۔

اب اسے جو کچھ بھی کرنا تھا "آف دی ریکارڈ" کرنا تھا۔
اور.....

کسی معقول وجہ کے بغیر انتقام کی آگ میں سگتے ہوئے پرسوال نے کامنی کو بڑی ہنسٹیک سزا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا جس پر وہ اگلے آٹھ دس روز کے بعد ان کی "فائل ایکسرسائز" کے وقت عمل کر سکتا تھا۔

رات کے اندھیرے میں "بنواری کپ" کے کچھ قاصطے پر گئے جنگل میں اس نے اس فائل ایکسرسائز کے موقع پر کامنی کی آبروریزی کے بعد اسے "حادثاتی موت" سے دوچار کرنے کا مکمل منصوبہ بنالیا تھا۔

○ ○ ○

جگل اور رات کے اندھیرے میں اسے ڈکا کھینے کا لنتماز آئے گا۔
کامنی کس طرح ترپے گی اور وہ کتنی درندگی سے اس کی یونٹیاں نوچنے کے بعد اس کے جسم کو سینکڑوں فٹ گہری کھائی میں پھینک دے گا جہاں تیز رفتار برقائی ٹالے میں سے کسی ایک ٹالے میں اس کی لاش چھروں سے ٹکرانے کے بعد جب یہاں سے کچھ دور برآمد ہوگی تو اسے "اتفاقی حادثہ" لکھ کر کیس ختم کر دیا جائے گا۔ اپنی حیوانیت کے اس تصور سے ہی اس کے رگ و پے میں شہزادہ لگا۔ اس نے فی کی کیفیت کو دواؤں شہ کرنے کے لئے اس نے رم کی پوئلنگائی اور انٹر کام پر لگے اگلے ہی روز "بنواری سنسر" جو ان کرنے والی لڑکی کو اپنے کمرے میں پھنپنے کا حکم دیا۔

○ ○ ○

"آج بڑی دیر لگادی۔"

اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی سلیم نے مشتاق کی طرف دیکھ کر آنکھ دبا تے ہوئے مخصوص اشارے سے کہا۔

"آج میڈم اپن کو لمبے ٹپ پر لے گئی تھی۔"

طاہر نے قماش جینوں کے سے لیے میں اس طرح کہا کہ مشتاق وہی سمجھے جو وہ چاہتے

تھیں۔

"یا تمہارے ساتھ سالی بڑی سیٹ جا رہی ہے۔"

سلیم نے جان بوجھ کر اگلا فقرہ کہا۔
"یہ تو اپنی اپنی قسمت ہے پیارے۔ ذرا دھرجالینے دو۔ ایک دھماکہ کر کے ہی سالی کو اپنے قابو میں کرلوں گا۔ بس تم دیکھتے رہنا۔"

طاہر نے قہقہہ لگایا۔

سلیم کے ساتھ مشتاق نے بھی بادل خوشاستی ہی ان کا ساتھ دیا تھا۔

مشتاق اب جلیوں بہانوں سے ایسے سوال کر رہا تھا جس میں ان دونوں سے حقیقی شک کا کوئی پہلو نکلے اور وہ اس سے پرسوال کو باخبر کر دے۔ پرانا ایجنٹ ہونے کے ناطے وہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھا کہ بسا اوقات کسی ایجنٹ میں خصوصی مہارت دیکھنے کے بعد انجینیئرس اس کے ساتھ کسی لڑکی کو مستقل چپکائے رکھتی ہے تاکہ وقت آنے پر وہ اس گدھے کو اس لڑکی کے ذریعے بہتر طریقے سے استعمال کر سکیں۔ اسے یہ تو سمجھ آ رہی تھی کہ کامنی اور طاہر کے درمیان جو بھی معاملات چل رہے ہیں ان کا علم انجینیئری کو ہوگا۔

لیجین.....

اسے کیپٹن پرسوال کو مطمئن کرنے کے لئے اس سے الگ کوئی بات تلاش کرنی تو تھی ہی۔ وہ اپنے انعام کی رقم میں اضافہ کروا سکتا تھا۔

رات کا کھانا انہوں نے حسب معمول ہال کمرے میں کھایا جس کے بعد انہیں گزشتہ تین روز سے شروع ہونے والی رات کی تربیت کے لیے بلایا گیا۔ یہ خصوصی تربیت تھی جو انہیں آسام کے ایک کرنل نے دی تھی۔

کھانے کے بعد پندرہ لاکھوں کے ایک گروپ کو وہ لوگ ایک فوجی ٹرک پر بٹھا کر یہاں سے ڈیرہ دون کی طرف لے گئے۔ یہ علاقہ جہاں وہ آئے تھے طاہر کے لیے بھی اجنبی تھا۔ حالانکہ اس نے کامنی کے ساتھ یہاں خاصی مشرکت کی تھی اور نوڈیک دور کی سڑکوں اور راستوں کو بھی اسے علم ہو گیا تھا۔

شاید بھارتی آرمی کی کوئی فرینڈ فیئلڈ تھی جہاں انہیں ٹرک سے اتار کر کرنل صاحب کے سامنے پیش کیا گیا جنہوں نے باری باری تمام لڑکوں سے انہیں سیناؤ کے حعلق دی گئی تربیت کے حعلق سوالات پوچھے۔

قریباً ایک گھنٹہ کے بعد انہیں ایک بڑے میدان میں لے جایا گیا جسے ان لوگوں نے ایک ریلوے پلیٹ فارم کی شکل دے رکھی تھی جہاں بالکل اسی انداز کے ریلوے کے ڈبے اور انجن موجود تھے جیسے پاکستان میں ہیں جب کہ دوسرے کو نے پر پاکستانی نہیں کڑی تھیں۔ یہاں کرل نے ان سے باری باری فرین کے ڈبوں نمونوں اور لاریوں میں خفیہ طریقے اور برق رسانی سے بم نصب کروانے کا عملی مظاہرہ کروایا۔

○ ○ ○

وہ سوائے تین لڑکوں کے اور کسی کی ٹائمنگ سے مطمئن نہیں تھا۔ ان کے ساتھ کپ سے آنے والے کینٹین پولس سے اس نے بڑے طور پر انداز میں دو تین ہاتھ کر کے اپنی بے اطمینانی کا اظہار بھی کیا تھا اور ان کے چار روز تک مسلسل یہاں آ کر ان کی ٹائمنگ کو بہترین بنانے کی تلقین کی تھی۔

پیش سردس بیورو (ایس ایس بی) اپنے تربیت یافتہ تیز ب کا روں کو خوب ب کاری اور دہشت گردی میں اون کمال تک پہنچانے میں اپنا جانی نہیں رکھتی تھی۔

یوں تو بھارت میں بہت سے دہشت گردوں کے تربیتی کیمپ موجود تھے لیکن اس کیمپ سے تربیت پانے والے ایجنٹ اپنے بہترین نتائج کی وجہ سے اپنے فن میں یگانا سمجھے جاتے تھے۔ جن تین لڑکوں کی کارکردگی پر کرل نے اطمینان کا اظہار کیا تھا ان میں ایک طاہر بھی تھا جس کا مطلب یہی تھا کہ کینٹین پولس کو بڑے پیمانے پر اذیت دینا اور اس کا شمار اس کورس کے بہترین تربیت یافتہ دہشت گردوں میں ہونے لگا تھا اور اس کے خلاف کسی بھی کارروائی میں کسی انسٹرکٹر کے ذاتی تعصب کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔

واپسی پر کینٹین پولس کا موڈ بہت خراب تھا۔ وہ تمام راستے اپنے شاگردوں کو گالیاں دیتا آیا تھا۔ البتہ طاہر اور بنگلہ دیش کے دونوں لڑکوں کی اس نے بطور خاص تعریف کرتے ہوئے ان کے لیے مخصوص رقم کے انعام کا اعلان کر دیا تھا۔

اس نے بھی ایک لمبے کے لیے یہ تاثر نہیں دیا تھا کہ وہ اس کی اصلیت کو جانتا ہے۔ طاہر کو اب زیادہ انتظار نہیں کرنا تھا۔

انگلے میں کسی بھی دقت یہاں بارشوں کا سیزن شروع ہونے والا تھا اور وہی ان

کے لیے کام کرنے کا بہترین وقت تھا۔

یہاں کے کڑے انتظامات کے سبب تو ابھی تک انہیں "سیف سٹائل" (جاسوس اپنے ٹارگٹ تک محفوظ پہنچنے کے بعد اپنے ہیڈ کو راز کو جو سٹائل دیتے ہیں) بھی نہیں سمجھ سکے تھے لیکن انہیں علم تھا کہ ان کے "وائٹنگ کمان" کو ان کی خیریت کی اطلاع ہو چکی ہوگی کیونکہ وہ اکیلے ہی یہاں نہیں تھے۔

بہت کچھ ممکن تھا۔

میں ممکن تھا کہ یہاں کوئی اور بھی ان کی طرح ایسے ہی کسی مشن پر بھیجا گیا ہو۔

وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اپنے افسران اور ان کے درمیان جو ایک رد جانی واسطہ ہر وقت موجود رہتا ہے اس نے انہیں ضرور طاہر اور سلیم کی خیریت سے آگاہ رکھا ہوگا۔

جاسوسی اور تباہ کاری کے اس کیمپل میں سب کچھ طے شدہ اصولوں کے مطابق ہی نہیں کھیلا جاتا۔ بہت مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے جب حالات اور واقعات خود ہی نئے رخ اور ضابطے بناتے چلے جاتے ہیں۔

○ ○ ○

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی جب وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچے۔ کینٹین پولس سوال جان بوجھ کر اسے اس کے کمرے تک چھوڑنے آیا تھا۔ اس دوران اس نے جی بھر کے طاہر کو اس کی استعداد کار کی داد دی تھی اور دوسرے ہی روز اس کا نقد انعام بھی اس تک پہنچانے کا وعدہ کیا تھا۔

تینوں کو ان کے کمرے تک پہنچا کر وہ "گڈ نائٹ" کہہ کر واپس چلا گیا۔ اس دوران وہ تینوں سے باتیں کرتا آیا تھا۔

لیکن.....

کیا عیاں جو اس نے ایک لمبے کے لیے بھی ایسا تاثر دیا ہو کہ وہ پہلے سے مشتاق کو جانتا ہے یا اس کا مشتاق سے کوئی تعلق بھی ہے۔

صبح چونکہ ان کی چھٹی تھی اس لیے تینوں دیر گئے تک لمبی تان کر سوتے رہے البتہ طاہر کی آنکھ معمول کے مطابق کھل گئی اور بیدار ہوئے ہی کاخی ایک سوال بن کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی جس کے بعد وہ پھر سو نہیں پایا۔

اس کے خیر نے اس سے ایک ہی بات دریافت کی تھی کہ کیا وہ واقعی کاٹنی کو "را" کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بھاگ جائے گا تاکہ وہ اس کے تمام جرائم کی قیمت پھر کاٹنی سے وصول کرتے رہیں۔

ظاہر جانتا تھا کہ یہاں جس مشن پر وہ آئے ہیں اسے مکمل کرنے کے بعد اگر وہ زندہ نکل جائے میں کامیاب ہوں تو پھر کاٹنی کو دنیا کی کوئی طاقت ایس ایس بی کے تقبلی مرکز میں جانے سے نہیں بچا سکتی جہاں وہ لوگ اس کے جسم کی بوٹی بوٹی الگ کر کے اس کے منہ سے سارے اگوا لیس گے۔ گو کہ کاٹنی کو اس کے عزائم کا علم نہیں ہے لیکن اس نے جھوٹا یا سچا اپنے اور اس کے درمیان جو تعلق قائم کر لیا تھا اس کے بعد کاٹنی کو ایس ایس بی زندہ و زور و گور کر دے گی پھر وہ کیا کرے گی۔

کاٹنی سے تعلق کو توڑنا اب اس کے اختیار میں تو نہیں رہا تھا۔ یہ بات وہ جانتا تھا کہ ایک مرتبہ اگر کاٹنی کو ڈانچ دے کر یہاں سے نکل جانے میں کامیاب ہو بھی گیا تو اس کا خیر ساری زندگی اسے بچو کے دیتا رہے گا۔

لیکن.....

کیا محض اس کی خواہش سے کاٹنی اس کے ساتھ چل دے گی؟ کیا اس کے لیے اپنے گرد و پیش اتنی مضبوط اور لاتعداد جھروں کو توڑنا ممکن رہے گا؟ بہت سوچ بچار کے بعد وہ بہر حال ایک نتیجے پر پہنچ کر مطمئن ہو گیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر حالات نے آخری مراحل پر کاٹنی اور اس کو آپس میں کرا دیا تو وہ کاٹنی کو یہ آخر ضرور کرے گا کہ وہ اگر چاہے تو ظاہر اسے ایک نئی زندگی سے آشاکر دلا سکتا ہے۔ اس کے اندر رنگی کی جو شمع جلی تھی اسے جلانے رکھنے میں اس کی معاونت کر سکتا ہے اور اس کے خیر سے اٹھنے والے تمام سوالات سے اسے نجات بھی دلا سکتا ہے۔

اس کے بعد کاٹنی کیا فیصلہ کرتی ہے؟

یہ اس کی قسمت۔ اگر وہ انکار بھی کرے تو بھی اس کا خیر تو مطمئن رہے گا کہ اس نے کاٹنی کے ساتھ خداری نہیں کی۔ اپنے ایمان سے بے وفائی کا مرتکب نہیں ہوا اور اپنی پیشہ وارانہ تربیت کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے مسلمان ہونے کو نہیں بھلایا۔ اپنے ایمان اور خیر کے مطابق اپنا

فرض ادا کیا ہے۔

○ ○ ○

اگلے تین روز کیسے گزر گئے، ظاہر اور کاٹنی کو علم نہ ہو سکا۔ البتہ ان تین دنوں میں ظاہر نے بالکل غیر جانبداری سے کاٹنی کی شخصیت کا مکمل جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ کاٹنی اگر وال کی "کاپیٹ" ہو سکتی ہے۔

وہ ایک بدلی ہوئی لڑکی تھی۔

اس کے اندر کوئی بہت بڑی انقلابی تبدیلی جنم لے چکی تھی جو نہ صرف اس کے بلکہ سارے ہندو سماج کے لیے بہت دھماکہ خیز ثابت ہو سکتی تھی۔

ان تین دنوں میں اس نے ظاہر پر مسلسل ایک ہی دباؤ ڈالا تھا کہ وہ یہاں سے بھاگ جائے۔ اس نے ظاہر سے کہا تھا کہ اسے فرار ہونے میں مدد دینے کے لئے وہ تیار ہے۔ خواہ اس کی اسے کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔

جب ظاہر اس سے دریافت کرتا کہ وہ اسے یہاں سے بھاگ جانے پر کیوں مجبور کر رہی ہے تو اس کا ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ یہ ظاہر کی دنیا نہیں ہے۔ وہ نہ یہاں اپنی مرضی سے آیا ہے نہ ہی وہ پائے گا۔ اس سے پہلے کہ یہاں کے مکین اس کی اصلیت جان جائیں وہ بھاگ جائے۔

"اور تم.....؟"

"میں یہ سروس چھوڑ دوں گی۔"

ظاہر کے سوال کا اس نے ایک ہی جواب دیا تھا۔

"تم جانتی ہو کاٹنی ایک مرتبہ اس دلدل میں اترنے کے بعد اس سے نکلنا ممکن نہیں۔ تم یہ سروس اپنی مرضی سے جو ان کر سکتی تھی اپنی مرضی سے چھوڑ نہیں سکتی۔ ایسا ممکن نہیں ہے۔"

ظاہر نے اسے کہا۔

"تمہیں اس سے کیا۔ کیا وہ مجھے مار ڈالیں گے یا مار ڈالیں مر جانے دو مجھے مجھے اپنی اس زندگی سے بچنے کے لئے لگی ہے۔ یہ کوئی زندگی ہے۔ قاحضہ عورت کی زندگی لعنت ہے۔"

وہ چکر جواب دیتی۔

”لیکن یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔“

ظاہر نے اس روز کہا۔

”تو پھر تم کیا برداشت کر سکتے ہو۔ مجھے لے جاؤ گے اپنے ساتھ۔ کر سکو گے یہ بات؟“

اس روز کا منی نے گویا اس کے اعصاب پر غامض چلا ہی دیا۔

”کاشی تم سچ کہہ رہی ہو۔“

اس نے کاشی کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے

کہا۔

”میں جاننے کے باوجود تمہارے ساتھ جھوٹ نہیں بول سکتی۔“

کاشی نے اس سے نظریں ملاتے ہوئے سچ بولا۔

”دیکھ لو کاشی۔ یہ آسان کام نہیں ہے بہت بڑا فیصلہ ہے تمہارے اور میرے درمیان

ملک ہی نہیں مذہب کی دیوار بھی حائل ہے کاشی تم یہ دیوار جین عبور کر لو گی؟“

کاشی کو اس کی آواز کی گہرے سکون سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

”ہاں۔ اگر تم میرے ساتھ ہو۔ اگر تم اپنے ایمان کے مطابق میرا ساتھ دو تو میں دنیا کی

تمام دیواریں پھلانگ جاؤں گی۔ ظاہر مجھے اب یہ زندگی نہیں بیٹنا۔ مجھے اس زندگی سے اب سب کچھ

آن لگی ہے۔ نفرت ہو چکی ہے۔ مجھے اب ایک مشرقی عورت کی زندگی بیٹنا ہے یا پھر میں مر جاؤں

کی۔“

کاشی کے لیے کے اعتماد نے ظاہر کو رزا کر رکھ دیا۔

”ٹھیک ہے کاشی۔ اگر تم تیار ہو تو مجھے پیچھے نہیں پاؤ گی۔ اور ہاں میں دعویٰ تو نہیں کرتا

لیکن یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں اتنا آسانی سے مرے نہیں دوں گا۔ اب موت کو تم تک پہنچنے کے

لیے مجھ سے نگرانا ہوگا۔ ہاں کاشی پہلے مجھ سے۔“

اس نے کاشی کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر مضبوطی سے دیا۔

ظاہر نے اب بھی احتیاط برتی تھی اور اسے اس دن سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ بس یہی کہا

تھا کہ اگلے دو تین روز میں وہ بھاگ جائیں گے۔

”کل تمہاری فائل ریپرسل ہے۔ میں تم تینوں کے ساتھ بطور انسٹرکٹر جاؤں گی۔ اس

ریپرسل میں چند روز کے حصر لیں گے جن کے انسٹرکٹر بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ اگر تم کو تو یہ

موقع بہت مناسب ہے۔“

کاشی نے کہا۔

”نو۔ کیسی بات کرتی ہو۔ تم جانتی ہو کہ ان لوگوں نے ریپرسل کے لیے سارے

علاقے کو گھیرے میں لیا ہوگا کیونکہ دھماکوں کی آواز دور تک جاتی ہے۔ میرے خیال سے بیٹواری

کے گرد اگر دسے چند روٹیں میل کا پیرا تو انہیں ”لینڈ لاک“ کر دیا ہوگا۔“

ظاہر نے عندیہ ظاہر کیا اور اس کے لیے اپنا مشن مکمل کیے بغیر یہاں سے فرار ہونا ناممکن

تھا۔

”اوہ اس طرف تو میرا خیال ہی نہیں گیا تھا۔“

کاشی نے اسے نظروں ہی نظروں میں داوری۔

”دیکھو کاشی تم مجھے ہمیشہ ٹائل رہنے کی تلقین کرتی ہو۔ آج میں تمہیں حکم دے رہا ہوں

کہ اب تم بالکل ٹائل رہو اور خاص طور سے پوسٹل پر نظر رکھنا۔ مجھے وہ بہت کینہ پرور شخص نظر آتا

ہے۔ اس سے کچھ بعید نہیں ہے۔

”اوہ۔ ظاہر میں اب چلنا چاہیے۔“

کاشی نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ٹھیک ہے۔“

دونوں نے ایک دوسرے سے گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر اپنے اپنے عہد کو پورا کرنے کی

یقین دہانی ایک دوسرے کو دلائی اور حاصل کی تھی۔

آج ان کے کورس کا پہلا سطر مکمل ہوا تھا اور وہ فائل ریپرسل پر جا رہے تھے۔ انہیں

یہاں سے دس میل دور ایک کھلے جنگل میں جانا تھا جہاں ان کے لیے ”ہارٹ ڈیمیاں“ رکھی ہوئی

تھیں۔ ہر ایجنٹ کو اپنا ہارٹ مقررہ مدت میں ہٹ کر کے اپنے محفوظ ٹھکانے پر پہنچنا اور اپنے اپنے

انسٹرکٹر کو رپورٹ کرنا تھی۔

انہیں داغے اور فرار کے راستے سمجھانے کے ساتھ ساتھ یہاں ”واج ڈاگ ڈیمیاں“

بھی موجود تھیں جن سے انہیں سچ کر کام مکمل کرنا تھا۔

○ ○ ○

رات ایک پہر وصل چکی تھی جب ان تینوں کی میم اپنی اسٹرکٹر کا مٹی آکر وال کی سربراہی میں یہاں پہنچی۔ انہیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ یہاں آنے والی پہلی میم ہے یا آخری۔ کیونکہ یہاں جنگل میں جو لوگ بھی آپریٹ ہٹ کر رہے تھے ان سب کو ایک دوسرے کی نظر دلوں سے پوجھل رو کر اپنا کام مکمل کرنا تھا۔

رداگلی پر جب چند کینڈی کی تنہائی طاہر اور کا مٹی کو میسر آئی تو کا مٹی نے جھپٹے ہی اس سے کہا۔

”پوسوال اچانک تین دن کی رخصت پر چلا گیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کی ماں بستر مرگ پر ہے اور اس کا جانا تاگزیر ہے۔ ایمر جنسی چھٹی لے کر یہاں سے بہت کم لوگ ہی جایا کرتے ہیں۔“

کا مٹی کے خبر بتانے کا اعزاز چٹلی کھار کا تھا کہ ضرور وال میں کچھ کالا ہے۔

طاہر کا ماتھا فوراً خشک۔

اس کی چٹھی حس نے بتایا کہ کینٹین پوسوال سابقہ ”مسٹینر“ بھی ہے۔ اب اس جنگل میں ان کا شکار کھیلے گا کیونکہ اسکی کارروائیاں یہاں آف دی ریکارڈ ہی کی جاتی ہیں، لیکن اس نے کا مٹی کو پریشان کرنا مناسب نہیں جانتا۔

”لیکن ہے ایسا ہی ہو۔ اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے؟“

”ظاہر تم ہوشیار رہتا۔ میں خود ساری کارروائی مکمل کر لوں گی۔ تمہاری او۔ کے رپورٹ دے دوں گی لیکن بھگوان کے لیے تم۔“

ابھی اس کی بات تکمیل ہی تھی جب مشتاق انہیں اپنی طرف آتا دکھائی دیا، لیکن طاہر نے اسے ہاتھ اور آنکھوں کے اشارے سے مکمل اطمینان دلانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی چاروں اپنے لیے مخصوص کردہ جگہ پر پہنچ گئے۔

آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے کیونکہ یہاں اب کسی بھی لمحے بارش شروع ہونے والی تھی۔

نیم چری رات اور جنگل کے سناٹے نے فضا میں ایک بے نام سا خوف بٹھادیا تھا۔

کا مٹی نے جب کے ہونٹ پر نقشہ بچھا کر انہیں جنگل کی لوکیشن سمجھائی اور مشتاق کے بعد پانچ منٹ کے وقفے سے سلیم کو بھی جنگل میں دھکیل دیا جس کے بعد طاہر کی باری تھی۔ جیسے ہی طاہر نے قدم آگے بڑھایا اس نے طاہر کا بازو تھام لیا۔

”تم نہ جاؤ۔“

کا مٹی نے بڑے لٹچی لہجے میں کہا۔

”پاکل ہوگئی ہو کیا۔ کیوں ان لوگوں کو خشک میں جلا کر رہی ہو۔“

طاہر نے اپنا بازو آہستہ سے جھڑپایا۔

اور.....

اس کی طرف دیکھے بغیر جنگل کے کھلے سلسلے میں اپنے بیک سمت قایم ہو گیا۔

دو روز پہلے ہی اسے کرنل بھادیہ نے طلب کیا تھا۔

”لیس سر۔“

خلاف معمول کینٹین پوسوال نے کرنل بھادیہ کے کمرے میں داخل ہو کر دونوں ایندیاں

بجاتے ہوئے اسے ضرورت سے زیادہ ہی تعظیم دی تھی۔

کرنل نے کمرے ہو کر اس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور اس کی خیریت دریافت کر کے اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

”کل فائل ریہرسل ہے۔ اس مرتبہ ٹارگٹ اور ٹائمنگ چارٹ تم تیار کرو۔“

میری خوش قسمتی ہے جب اگر آپ مجھے اس فائل سمجھتے ہیں۔ آج شام کو میں آپ کی میز پر سارا ”لیوسکیچ“ بنا دوں گا۔

اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”مجھے تم سے یہی امید ہے کینٹین پوسوال۔“

کرنل بھادیہ نے اپنی بھاری مونچھوں کے عقب سے دانت چمکاتے ہوئے کہا۔ یہ جنگل پوسوال کے لیے کبھی اجنبی نہیں رہا تھا۔ گذشتہ تین سال سے وہ یہاں دہشت گردوں کو تربیت دیتا آ رہا تھا۔ اسے یہاں کے ایک ایک چپے کا علم تھا اور اس بات کا بھی کہ فائل جان تیار کرنے کے لئے کرنل بھادیہ کے بیواری مرکز میں اس سے زیادہ سینئر اور سمجھدار آفیسر اور کوئی نہیں۔ اسے

در اصل اس دن کا انتظار تھا۔

گزشتہ ایک ماہ سے وہ جس انتقام کی آگ میں جل رہا تھا اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے اسے اب موقع ہاتھ لگا تھا۔

○ ○ ○

اب اس کی حس حیوانیت کی تسکین ہمیشہ کے لئے ہونے والی تھی۔ اب وہ روی کماغ دوز ”سٹینز“ کے ساتھ کی جانے والی اپنی تربیت بروئے کار لانے والا تھا۔ اس تربیت میں انہیں زندہ جانور کا پتھر اور گھڑی کے ساتھ شکار کرنے کے بعد اس کے خون سے اپنی پیاس بجھانے اور بھوک بجھانے کی تربیت دی جاتی تھی۔ اسے آج بھی اپنی بھوک اور پیاس بجھانی تھی۔

اسے سانبیریہ کے سرحدی علاقوں کے وہ دیہات یاد آنے لگے جو روی سٹینز کی آمد پر اپنے دیہات خالی کر کے بھاگ جایا کرتے تھے کیونکہ ان کے زیر تربیت درندوں کے لیے انسانوں کی حیثیت بھی جنگلی پرندوں سے زیادہ نہیں رہ جاتی تھی۔ مگر گاؤں کی اکا دکا دو شیر و کبھی گھڑیوں کی تلاش میں کسی بڑے جنگل میں ان کے قابو آ جاتی تو وہ اسے جانوروں کی طرح نوچ کر اپنی پیاس بجھانے کے بعد جنگلی درندوں کی خوراک بنانے کے لئے پھینک کر آگے نکل جاتے تھے۔

دو تین روز کے بعد جب دیہاتیوں کو شہ لاش ملتی تو وہ بے چارے پہلے پہل یہی سمجھا کرتے تھے کہ شاید یہ جنگلی جانوروں کا زامہ ہے۔ اس کا علم گاؤں میں بعد میں ہوتا تھا کہ یہ جانوروں کا نہیں انسان نما درندوں کا کارنامہ ہوتا تھا جن کو ”سٹینز“ کہا جاتا ہے اور جو روس کی ریڈ آرمی کے مایہ ناز کمانڈرز تھے۔

ایک مرتبہ اس نے بھی اپنے روی ساتھی کے ساتھ ایک ایسی ہی لڑکی کا شکار کھلیا تھا اور اس شکار کا مزہ بھی دونوں نے ہی لیا تھا جس کے بعد انہوں نے بد قسمت لڑکی کو بے رحمی سے گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور اس کے زخم خوردہ جسم کو وہیں ایک گہرے کھڈ میں پھینک کر اپنی راہ لی تھی۔

اس شکار کا نشہ جب بھی اسے یاد آتا وہ پاؤں لگا جاتا۔ اس کی حس درندگی کو جتنی تسکین وہاں پہنچتی تھی اس کے بعد پھر سری لنکا میں اس نوعیت کا شکار مل سکا جب وہ بھارتی امن فوج کا ایک آفیسر بن کر ”ٹی کلاہ“ میں گیا تھا جہاں انہوں نے تامل ٹائیگرز کے خلاف کارروائی کی اور

ایک جگہ جنگل میں رات کو گھسٹ کے دوران جب ایک تامل لڑکی اس کے قابو میں آئی تو وہ تربیتی پہنچتی اس لڑکی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی خفیہ پناہ گاہ پر لے آیا تھا جہاں اس نے اپنے ایک کورس میٹ کے ساتھ مل کر سانبیریہ کی یاد تازہ کی تھی جس کے بعد انہوں نے لڑکی کو مار کر پھینک دیا تھا۔

دو سال بعد تک اس درندگی کا سحر تازہ رہا۔

اب تو وہ بڑی تحقیقی محسوس کرنے لگا تھا۔ اب اسے واقعی اپنے خون کی حدت قائم رکھنے کے لیے کسی ایسے شکار کی تلاش تھی۔

اور.....

اب وہ کامنی اگر دال کا شکار کھیلنے جا رہا تھا۔

سالی حرام خور مجھے چھوڑ کر اس سسلے کے ساتھ یا راند لگا رہی ہے۔ کتے کی پگنی

اس نے دل ہی دل میں تجانبانے لگی گالیوں سے کامنی کو نوازا تھا۔

اس نے اپنے وعدے کے مطابق بروقت نقشہ کرل بھاریہ تک پہنچا دیا تھا۔

”دل ڈن“

بھاریہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

واقعی سٹینز پر سوال اپنے کام کا ماہر تھا۔

”سرا میری خواہش تھی کہ اس مرتبہ میں خود گرائی کرتا لیکن بد قسمتی سے میں ایسا نہیں کر پاؤں گا۔ ماما کی بستر مرگ پر ہیں اور آپ تو جانتے ہیں میرے چاتی بھی جب سور گہاں ہوئے تو میں شکاری کپ میں تھا۔ اس مرتبہ بھی اگر ایسا ہوا تو میرے خاندان کے لوگ شاید مجھے برادری ہی سے نکال دیں۔“

اس نے موقع مناسب دیکھ کر کہا۔

”اوہ۔ آل راہیت۔ تم آ جاؤ۔ واقعی سیریس مسئلہ ہے۔ کوئی بات نہیں منڈو لکر ہے ناں۔ اس کو آ خر کس بات کی تنخواہ ملتی ہے بھئی۔“

کرل بھاریہ نے تہنید لگا یا اور پر سوال نے اس کا ساتھ دیا تھا۔

اس طرح وہ اگلے تین دن کی چھٹی لے کر اس رات بڑا لڑکی کپ سے چلا گیا تھا۔

کیمپ کی حدود سے باہر نکلتے ہی اس نے اپنے اردلی کو گاڑی واپس لے جانے کا حکم دیا تھا اور جیپ کی نظروں سے مابل ہوتے ہی جنگلی سلسلے میں غائب ہو گیا۔

ساری رات کیمپن پوسال نے جنگل میں گزاری۔ ساری رات وہ پیدل چتا رہا اور پو پھٹنے کے نزدیک اس جنگل تک پہنچ گیا جہاں اس نے اپنا ٹکا رکھنا تھا۔ اپنے ہاتھوں تربیت کے لئے تیار کردہ سارا نقشہ اس کے ذہن پر نقش تھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے ایک کھنے درخت کا انتخاب کیا اور اب وہ اس درخت پر اپنے بیک سمیت بندر کی پھرتی سے چڑھتا چلا گیا۔

○ ○ ○

سالوں پرانے اس کھنے درخت کی کئی شاخوں میں جس کے چوں سے چھن کر سورج کی روشنی بھی بھٹکل زمین تک پہنچ پاتی تھی اس نے بڑے اطمینان سے ٹائیلوں کی جالی کی مدد سے اپنا ستر بھایا اور لمبی تان کر سو گیا۔

چار گھنٹے وہ اطمینان سے سوتا رہا۔ اس کی آنکھ نیچے موجود ٹڈا لکڑا اور اس کے ساتھیوں کی آوازوں سے کھلی جو یہاں ڈبی مار گیت اور واج ڈاگ میٹ کرنے آئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ چلے گئے۔

ان کی روانگی پر پوسال درخت سے نیچے اتر آیا۔ اس نے اپنے بیک سے ڈیپ کھول کر اطمینان سے کھانا کھایا۔ سگریٹ نوشی کی اور وہیں بیٹھا رہا۔ چونکہ اس نے خود یہاں پانچوں گروہوں کا پروگرام بنایا تھا اس لیے وہ جانتا تھا کہ کب ان کی آمد شروع ہوگی۔

ان کی آمد سے ایک گھنٹہ پہلے ہی وہ اپنے ٹھکانے پر واپس چلا گیا، لیکن زمین پر اس نے اپنے کپڑے تبدیل کر لیے تھے اور سیاہ رنگ کا وہی لباس پہنا تھا جو وہ پہنا کرتا تھا۔ اپنے چہرے پر سیاہ ماسک چڑھا کر وہ بارہ درخت پر چڑھ گیا۔ اب اسے کاشی کا انتظار تھا۔

کاشی اپنے ساتھیوں کے ساتھ جیسے ہی اس پہاڑی موڑ تک پہنچی جس سے راستہ اس ٹیلے تک آ رہا تھا۔ وہ کیمپن پوسال کی ٹائٹ وہیلن کی ریش میں آ گئی۔ وہ جیپ پر نظریں جمائے چوکس بیٹھا تھا اور اب اسے اپنے ڈکار کا انتظار تھا۔

کاشی نے جیپ نیچے ہی کھڑی کر دی تھی اور اب وہ اپنے ساتھیوں کو رخصت کرنے کے بعد اوپر آ رہی تھی۔ جس درخت پر وہ بیٹھا تھا زمین سے اس کی اونچائی یہاں ڈیڑھ سو فٹ سے بھی

زیادہ نہیں تھی۔

اس نے کاشی کو طاہر کا ہاتھ پکڑ کر روکے اور طاہر کو ہاتھ چھڑا کر جانے کا منظر بھی دیکھ لیا

تھا۔

یہ منظر دیکھنے کے بعد سے اس کے جسم میں خون کی جگہ انگارے دوڑنے لگے تھے۔

اب اس میں صبر کی تاب نہیں تھی۔ کاشی اس درخت سے کچھ فاصلے پر ایک قدرے کھلی جگہ پر ایک چتر پر آ کر بیٹھ گئی تھی جہاں اسے دو گھنٹے تک رہنا تھا۔ اس دوران اس کے ساتھیوں نے اپنے اپنے ٹارگٹ ہٹ کر کے "واج ڈاگز" کی نظروں سے خود محفوظ کر کے وہاں تک پہنچنا تھا۔

○○○

642517

طاہر کو جنگل میں گئے بمشکل پانچ منٹ ہی ہوئے تھے جب وہ بندروں کی طرح بغیر آواز پیدا کئے ہائیڈرو پلانٹ کی ایک چھوٹی سی سیڑھی پر اپنے منہ میں دو ہائے درخت سے اس طرح نیچے اترا تھا کہ کاشی کو معمولی سی آہٹ بھی نہیں ہو پائی تھی۔

اگلے ہی لمحے وہ کاشی کے سر پر موجود تھا۔

”ہائے کاشی ڈارلنگ“

اپنے خیالوں میں گم کاشی کے کانوں میں اس کی آواز پھلتے ہوئے سیسے کی طرح

اتری تھی۔

”تم۔“

اس نے بیٹھے بیٹھے گردن کھائی اور چاند کی روشنی میں اپنے سامنے کپٹن پوسال کو دیکھ

کر کہہ مئی۔

”ہاں میں۔ کیا بات ہے تم ڈر گئی کیا۔ ارے بھی میں تمہارا دوست ہوں۔ تمہارا پرانا

یار۔“

یہ کہتے ہوئے وہ جست لگا کر کاشی پر اس طرح گرا کہ ایک ہاتھ اس کے منہ پر پختی سے جھادیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے کاشی کو اس طرح جکڑ لیا تھا کہ اس کے لیے اپنی جگہ سے جنبش کرنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ پلک جھپکتے ہی اس نے ہائیڈرو پلانٹ کی سیڑھی سے کاشی کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ کر اسے زمین پر گرادیا تھا۔

ابھی وہ بمشکل سیدھا ہی کھڑا ہوا تھا کہ اس کی کمر پر پڑنے والی زوردار لات نے اسے سامنے درخت سے ٹکرا دیا۔

غصے اور حیرت سے پوسال نے گردن گھمائی، سامنے طاہر کھڑا تھا۔

طاہر نے اس کی موجودگی کے امکان کو ذہن میں رکھا تھا۔ اس نے کاشی کی بات کو نظر انداز نہیں کیا تھا اور بظاہر اسے یہ تاثر دینے کے بعد کہ وہ جنگل میں گھس چکا ہے وہ سبیل زمین سے چپک کر بیٹھ گیا تھا۔

اندھیرے کی وجہ سے پوسال کو درخت سے اترتے تو نہیں دیکھ سکا تھا البتہ اس نے کاشی کے منہ سے نکلنے والی ہلکی سی چیخ نما آواز کے ذریعے حالات کی سنگینی کا اندازہ کر لیا تھا۔

کاشی تک پہنچنے سے پہلے پوسال نے اس کے دونوں ہاتھ باندھ دیئے تھے۔

زخمی سانپ کی طرح بل کھا کر پوسال نے اس کی طرف دیکھا۔

اور.....

مخلقات بکنا ہوا اس پر حملہ آور ہوا۔

لیکن.....

طاہر نے بمشکل اس کا وار خالی کر دیا۔

پوسال کا وار ضرور خالی کیا تھا لیکن اس کے قدموں نے زمین نہیں چھوڑی تھی۔ وہ اپنے قدموں پر مضبوطی سے کھڑا تھا۔ پھر اچانک اس نے بالکل خلاف توقع اپنی قلابازی لگائی اور طاہر پر آن پڑا۔

اس مرتبہ طاہر پر حملہ اتنا اچانک اور بھرپور ہوا تھا کہ وہ منہ کے بل زمین پر آ رہا۔

پوسال کا سارا وزن اس پر موجود تھا۔

اس طرح اچانک ہونے والے حملے نے طاہر کو حواس باختہ کرنے کی بجائے اس کا

غصہ دو چند کر دیا اور اس نے دوسرے ہی لمحے خود کو سنہال لیا۔

اس سے پہلے کہ پوسال اس کی گردن پر اپنا دلاؤ آزمائے، طاہر نے زمین پر اس طرح

اس کے بدن سمیت پلٹا کھایا اور پوسال کی سپرنگ کی طرح چھیل کر دوڑ جا کر۔

لیکن.....

ظاہر کے زمین پر قدم جمانے سے پہلے ہی وہ سنبھلا اور قدرے جھٹکتے ہوئے اس نے اپنی پنڈلی سے بندھا بھجڑ نکال لیا۔

شاید پوسال نے لاشعوری طور پر کاشی کی طرف سے ہونے والی مزاحمت کے پیش نظر کمانڈوزی طرح اپنے جسم سے بھجڑ باندھنا ضروری سمجھا تھا یا بھجڑ اپنی تربیت کو فراموش نہیں کیا تھا۔ کاشی جس کے دونوں ہاتھ کر کے پیچھے بندھے تھے بڑی بے بسی سے یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ پوسال نے اس کے ہاتھوں کو اس طرح گانٹھ لگائی تھی کہ اسے اپنا جسم ہانپوں سے گزار کر ہاتھ سامنے لانا ہی کاشی اگر وال کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس کے باوجود اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ ظاہر کی آمد نے اس کا حوصلہ دو چند کر کے اس میں نئی زندگی پیدا کر دی تھی۔ ورنہ تو پوسال کے اچانک حملے کے بعد وہ زندگی ہی سے ناامید ہو چکی تھی۔

چاند کی روشنی میں بھجڑ اس کے ہاتھ میں چنک رہا تھا۔ اس سے زیادہ چنک پوسال کی شکارتی آنکھوں میں آئی تھی۔ بالکل اس بیخبر بڑے کی طرح جسے بہت بھوک کے بعد اچانک شکار دکھائی دیتا ہے۔

”ظاہر ہوشیار۔“

کاشی نے چیخ کر اپنی دانت میں ظاہر کی مدد کرنا چاہی۔ وہ بے چاری اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

ظاہر کی آنکھیں پوسال کے ہاتھوں پر جمی تھیں۔ اسے اپنے انسٹرکٹرز کی وہ وارننگ یاد آ رہی تھی جو اسے دوران تربیت بار بار دی جاتی تھی۔

”اگر ایک لمبے کے لیے بھی دشمن کے ہاتھوں کی حرکت سے غفلت برتی تو دنیا کی کوئی تربیت تمہیں نہیں بچا سکے گی۔ دماغ“ آنکھیں اور ہاتھ ایک ساتھ روپہٹھیں۔ کبھی تم ایک ساتھ۔ اگر تینوں میں سے ایک بھی آگے پیچھے ہو گیا تو مارے جاؤ گے۔“

اور.....

ظاہر کو اب دماغ“ آنکھیں اور ہاتھوں کو ایک ساتھ روپہٹھ کرنا تھا کیونکہ اس نے اسی فن پر کمال حاصل کیا تھا جس کی آزمائش اب ہونے جارہی تھی۔

عقاب کی طرح وہ چوٹا اور زمین پر مضبوطی سے قدم گاڑے کھڑا تھا۔

پوسال نے بھجڑ کو ہاتھوں میں تولاد اور قد بھر کر اس پر حملہ آور ہوا۔ یہ الگ بات کہ ظاہر نے اپنی جگہ سے ہٹ کر اس کی پشت پر الٹا ہاتھ جمایا اور وہ سیدھا سامنے درخت سے ٹکر لیا تھا۔

لیکن.....

حیرت انگیز طور پر وہ سنبھل گیا اور اس سے پہلے کہ ظاہر اپنے حملے کا آغاز کرتا پوسال اس کے سامنے کھڑا تھا۔

اس مرتبہ پھر اس نے ہاتھ چلایا اور ظاہر جھکا کر دے کر الگ کھڑا رہا۔ تیسرے حملے سے پہلے ظاہر اچانک کمر کے بل زمین پر گرا۔ اس کی یہ حرکت کاشی اور پوسال دونوں کے لیے چونکا دینے والی تھی۔ کاشی کی طرح پوسال نے بھی یہی اندازہ لگایا کہ شاید وہ لڑکھڑا کر گرا ہے کیونکہ اس کے گرنے کا انداز ہی ایسا تھا۔

پوسال نفرت، حسد اور فحشے کے ناقابل برداشت جذبہ بات کے ساتھ اس پر بھجڑ لیکن ظاہر کی طرف سے غیر متوقع عمل سے کاشی کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

ظاہر نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے پوسال کے بالکل نزدیک آنے پر دونوں آنکھیں اپنے پیٹ سے لگا کر پوری قوت سے پوسال کے پیٹ میں ماریں۔

یہ حملہ اچانک بھجڑ پر اور پوسال کے لیے ”سُرپرائز“ تھا۔ ہوا میں اچھل کر وہ زمین پر گرا اور دوبارہ نہ اٹھ سکا۔ کیونکہ گرتے ہوئے اس کی پوزیشن بھجڑ کی اور ہاتھ میں بھجڑ اس کی گردن کے نیچے آ گیا۔

پوسال منہ کے بل گرا تھا۔

ظاہر جھٹکتے سے بازی گروں کی طرح قدموں پر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ پوسال کی طرف سے اگلے حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے پرعزل رہا تھا۔

لیکن.....

پوسال کے جسم نے دو تین جھٹکتے کھائے اور ٹھنڈا پڑ گیا۔ شاید یہ بھجڑ ہر میں بچھا ہوا تھا۔ برق رفتاری سے آگے بڑھ کر اس نے کاشی کے ہاتھ کھولے جو بچوں کی طرح خوفزدہ سکپاں لیٹی اس کے گلے سے لگ گئی تھی۔

”کاشی حوصلہ کرو۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ ابھی بہت سے کام کرنے ہیں۔“

اس نے کاشی کی بیٹہ تھپکاتے ہوئے اسے خود سے آہستگی سے الگ کیا اور زمین پر منہ کے بل گرے پوسال کو دونوں ناٹھوں سے گھسٹ کر چترلی چٹان کے کونے تک لے آیا۔ اس چٹان کے بالکل نیچے قریباً سونٹ کی گہرائی پر ایک تیز رفتار ٹالہ بہہ رہا تھا۔ طاہر نے اگلے ہی لمحو پوسال کے مردہ جسم کو چٹان سے نیچے ڈھیل دیا۔ اپنی بلندی سے اس کا جسم زوردار اور گہرے پانی والے ٹالے میں گرے جسے آواز تو ضرور پہنچا ہوئی تھی۔

لیکن.....

یہاں اس آواز پر توجہ دینے والا اب کوئی موجود نہیں تھا۔ کاشی شاید ابھی تک اس حادثے کے اثر سے باہر نہیں آئی تھی۔ وہ پشیمانی نظروں سے طاہر کو یہ سب کچھ کرتے دیکھتی رہی پھر اچانک اپنی جگہ سے اٹھ کر سسکیاں لیتی دوبارہ اس سے لپٹ گئی۔ اس مرتبہ بھر طاہر نے اس کو وقت کی نزاکت کا احساس دلانے کے بعد قدرے تارل کرنا چاہا۔

اور.....

اس مرتبہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہا۔ کاشی نے روٹا بند کر دیا تھا اور اپنا چہرہ بھی رومال سے صاف کر لیا تھا۔

”خارج لاؤ۔“

اس نے کاشی سے اچانک ہی کہا اور وہ سمجھا ہوئی کچھ قاصطے پر کھڑی جیب تک جا کر اپنی ایمر جیبی خارج لے آئی۔

اپنی چھٹی جس کی طرف سے ملنے والی دارنگ کے تحت اس نے خارج اس درخت کی طرف پھینکی اور جلد ہی اسے درخت کی ٹہنیوں میں پھنسا دہ نائیون کا جھولنا نظر آ گیا۔

خارج کاشی کو جھکا کر وہ انگور کی طرح درخت پر چڑھا اور پوسال کا بیگ اور نائیون کا جھولنا ہستر اس نے نیچے کاشی کے نزدیک پھینک دیا اور خود نیچے اتر آیا۔ اس سارے عمل میں اس

نے ہشکل چھ سات منٹ ضائع کئے۔ نائیون کا جھولنا تہہ کر کے اس نے بیگ میں بند کیا اور وہ بیگ بھی پوسال کے پیچھے ہی پھینک دیا۔ اب وہاں صرف خون کے نشانات تھے جنہیں مٹانے کے لیے ممکن نہ تھا۔

”میرے پاس صرف ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہے۔“

اس نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کاشی سے کہا جو ابھی تک کھل حواس میں دایس نہیں لوٹی تھی۔

”تم۔“

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن طاہر نے کاشی کی بات کاٹ دی۔

”میری بات دھیان سے سنو۔ اگلے پانچ منٹ میں خود کو مارل کرو۔ یہاں اس چٹان پر کوئی بھی خون کے دھبے تلاش کرنے نہیں آئے گا۔ پوسال نے دونوں کی چھٹی لی ہوئی ہے۔ کل سے اس کی چھٹی شروع ہو جائے گی اور ہم پرسوں یہاں سے نکل رہے ہیں۔ تم اپنے ذہن کو قابو میں کرو۔ فی الحال اڑتالیس گھنٹے کوئی تمہارے متعلق کوئی بات سوچ بھی نہیں سکتا البتہ اگر تم نے خود پر قابو نہ پایا تو میں ممکن ہے کہ ہم دونوں وقت سے پہلے ہی بے موت مارے جائیں۔“

طاہر نے اسے سمجھایا۔

اور.....

اس کی یہ بات تازیا نے کام کر گئی۔

کاشی واقعی مارل ہو رہی تھی۔

”میں اپنا ٹارگٹ ہٹ کر کے واپس آ رہا ہوں کیونکہ کام ادھورا نہیں چھوڑا جا سکتا۔ تم اب جیب کے پاس چلی جاؤ اور اطمینان سے اپنی ڈیوٹی کرتی رہو۔“

یہ کہہ کر وہ کاشی کا جواب سننے بغیر تیزی سے ہشکل کی طرف بڑھ گیا۔

اب وہ مکمل کاغذ وین گیا تھا۔

اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹارگٹ ٹائم سے پانچ چھ منٹ پہلے ہی اپنا ٹارگٹ ہٹ کیا اور واپس پہنچنے والوں میں حسب معمول وہ سب سے پہلے نمبر پر تھا۔

کاشی نے یہ ڈیڑھ گھنٹہ کیلئے گزر ارا تھا۔

اس دوران اس پر بہت سے خیالات باری باری حملہ آور ہوتے رہے۔ اس نے ماضی حال اور پھر مستقبل کا بڑی تنبیہی اور مکمل غیر جانبداری سے جائزہ لیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ اس کے خود بخوشی کرنے سے کارہا با حیات میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

یہ سہم جوں کا توں رہے گا۔

اس کی جگہ کوئی اور کا مٹی کسی اور نام کے ساتھ لے لے گی۔

پوسال کی جگہ کوئی اور پوسال آ جائے گا۔

پھر وہ کیا کرے؟

اور.....

زندگی میں پہلی بار بڑی ایمانداری سے اس کے ضمیر نے اس سوال کا وہی جواب دیا تھا جو وہ چاہتی تھی۔ اس نے زندہ رہنے اور خدا کی ودیعت کردہ اس نعمت کو جس کا نام زندگی تھا انسانوں کی طرح پسینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اس نے طاہر کے روپ میں اپنا محفوظ مستقبل پالیا تھا۔

اگر وہ دہشت گرد تھا تو اب نہیں رہا ہوگا۔ یہ اس کے دل و دماغ کا متفقہ فیصلہ تھا کیونکہ کوئی دہشت گرد ایسے ہند بات نہیں رکھتا جن کا مظاہرہ اس نے کیا تھا، نہ ہی وہ کسی کا مٹی اگر وہاں کے لیے کسی کمیشن پوسال کی جان لے سکتا ہے۔

اس کے دل نے کہا تھا کہ طاہر ہرگز وہ نہیں جو دکھائی دے رہا ہے۔ اس نے ضرور کوئی سوا نگہد چار کھا ہے۔

وہ ضرور کوئی اور ہے۔

اس نے اب تن من سے طاہر کی ہو کر خود کو حالات کے دم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ اسی میں اس کی حیات تھی۔

اس فیصلے نے اس میں بڑا اعتماد پیدا کر دیا تھا اور اس اعتماد کا مظہر تھا اس کی طرف سے طاہر کو جانے کا کپ بٹس کرنا۔ یہ چاہے اس نے ایک فلاسک میں پہلے ہی سے بنا کر رکھی ہوئی تھی کیونکہ اسے علم تھا کہ وہ یہاں تین مہینے تنہا ہی گزارے گی۔

”کامٹی اب میری بات دھیان سے سنا۔ شاید پھر تفصیل سے گفتگو کرنے کا وقت نکل سکے۔ کل اتوار کی وجہ سے جھٹی ہوگی۔ تم اپنے معمول کے مطابق یہاں سے لکھنا اور ڈیرہ دونوں سے باہر مسوری کی طرف سفر کرنا۔ ڈیرہ دونوں سے مسوری کو جاتے ہوئے اس جگہ ایک سرائے اور مندر آئے گا۔“

اس نے جپ کی بوٹ پر کامٹی کو وہ جگہ انگلیوں سے لکیریں کھینچ کر سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے علم ہے۔ یہ مانی کا کھانا مندر ہے۔“

”شاہاش۔ بالکل ٹھیک ہے۔ یہاں بچاری دشوانا تھ کا کرو مندر کے پچھلی طرف ہے جس پر اس کا نام لکھا ہے۔ تمہیں اس کمرے کے شمال کی سمت کتوں کے ساتھ جو ٹیلا بنا ہوا ہے وہاں میرا انتظار کرنا ہوگا۔ بھگوان نے مجھ کو میری صبح ہماری ملاقات و ہیں ہوگی۔ تم رات تین بجے سے صبح نو بجے تک وہاں میرا انتظار کرنا۔ اگر میں نہ بھی پہنچ سکے گا تو میری جگہ کوئی اور ضرور پہنچے گا جو تمہیں وہاں آ کر میرے حوالے سے بات کرے گا۔“

”بھگوان نہ کرے۔“

کامٹی نے اس کی آخری بات منہ سے نکلے ہی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

طاہر نے اسے مزید کچھ ہدایات دیں اور خاموش ہو گیا کیونکہ سامنے سے اب سلیم کی آمد کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔

سلیم اسے پہلے سے وہاں دیکھ کر سہرا لیا۔

”واہ استاد پھر نمبر لے گئے ناں۔“

اس نے طاہر کی طرف دیکھ کر آنکھ دہائی۔

”اوہ اپنی اپنی قسمت ہے پیارے۔“

طاہر نے بھی اپنے لچکے لچکے ہنسنے کی برقرار رکھی۔

کیا مجال جو ایک لمحے کے لیے بھی اس کے دل و دماغ میں دو مہینے پہلے والے واقعات سے متعلق کوئی نشوونما پیدا ہوئی ہو۔ اس کے اضران واقعی گنج کہتے تھے کہ وہ پھر کے اعصاب دکھتا

ہے۔

مستحق اپنے نام گٹ نام سے چندہ منٹ لیٹ تھا۔ کامٹی نے پروفیشنل کی طرح اس کو

ابھی طرح ڈانٹا اور تینوں کو لے کر بڑا ریکیپ آگئی۔
صبح ہو رہی تھی جب وہ بڑا ریکیپ بچے۔

وہ بہر حال ان گروپوں میں بہرہ ور رہے تھے کیونکہ کاشی اگر وال کے تینوں شاگردوں نے اپنے اپنے ہارگٹ ہٹ کر لیے تھے اور ”دھن“ کی نظروں سے بھی محفوظ رہے تھے۔
آج اتوار تھا۔

یوں بھی وہ اپنی فاکل رہبر سل سے واپس آئے تھے اس لیے سو گئے تو کسی نے انہیں بیدار نہیں کیا۔ پھر کاشی نے ہی انہیں جگا دیا۔

”بھئی تم لوگ کیوں میری جھٹی برہا کر رہے ہو۔ مجھے بھی اپنے کام کرنے ہیں۔ اچھا اپنا اپنا ”بریک فاسٹ“ کرو اور گٹھ بانی۔ اب کل ملیں گے۔“
اس نے تینوں کی طرف سرکہاٹ اچھائی اور واپس چلائی۔

صبح کے گیارہ بج رہے تھے جب انہوں نے ناشتہ کیا۔ رات سے آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ابھی بارش نہیں برسی تھی۔

طاہر دل ہی دل میں دما بنگ رہا تھا کہ آج بارش کا آغاز ہو جائے کیونکہ بارش ان کے لیے اس حالت میں حلیہ خداوندی سے کم نہیں تھی۔

مشتاق تھوڑی دیر بعد کسی کام سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ وہ دونوں بھی بظاہر چلتے ہوئے باہر آ گئے جہاں کپ کے میدانوں کے مختلف کونوں میں اپنی اپنی بیروں کے باہر باتاں میں زیر تربیت دہشت گرد خوش گویوں میں مصروف تھے۔ اتوار کا دن یہاں ایسے ہی گزرتا تھا۔

”آج رات.....“

بلّا غمناہنے فیصلے کن لہجے میں تسلیم سے کہا۔

”او۔ کے۔“

سلیم نے اس سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

دونوں وہاں ایک کونے میں بیٹھ گئے اور ایک دوسرے کے ساتھ منصوبہ کی تفصیلات طے کرنے لگے۔

بڑی احتیاط سے دونوں نے اپنے اپنے پلان پر بحث کی۔ متفقہ نکات تلاش کیے اور

قرار کے راستوں کا جائزہ لینے کے بعد دل ہی دل میں اپنے مشن کی کامیابی کی دعا کی اور نارمل ہو کر بیٹھ رہے کیونکہ مشتاق ان کی طرف آ رہا تھا۔

اسی اثنا میں کپ کے سینا ہال میں قلم کا اعلان ہونے لگا اور وہ دونوں اٹھ کر اسی طرف چل دیے۔ بطور خاص اتوار کو ان کا ”منور نجم“ کیا جاتا تھا۔

○ ○ ○

آج بھی پردہ سکریں پر حسب روایت پہلے ایک مخصوص بلیو قلم چلائی گئی جس کے بعد ایک بھارتی قلم دھکا کی گئی اور بعد میں پھر بلیو قلم کے بعد چھٹی۔ اب وہ لوگ دوپہر کا کھانا کھانے جا رہے تھے۔

شام گئے تک ایسی ہی سرگرمیاں جاری رہیں اور رات حسب معمول وہ اپنے اپنے کمروں میں واپس چلے گئے۔

شاید بارش ان کے کمروں تک پہنچنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اچانک ہی آسمان پر زوردار دھماکوں کی اور طوفانی بارش کا آغاز ہو گیا۔ ڈیرہ دونوں کی بارشوں کے متعلق انہوں نے سنا ہی تھا۔ آج دیکھنے کا اتفاق پہلی مرتبہ ہوا۔

مشتاق تو تھوڑی دیر بعد ہی مہری نیند سو گیا تھا۔

لیکن.....

وہ دونوں ایک لمبے کے لیے بھی نہیں سو پائے تھے۔

اندھیری رات کا قہر بڑھتا جا رہا تھا۔

بادل یوں گرج رہا تھا جیسے بجنے سے نکل کر آزاد ہونے والا کوئی خونی درندہ فروزی کے سینے میں بھی چھا جوں میں برس رہا تھا۔

لیکن.....

اس سب کے باوجود کپ کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

یہاں معمول کے مطابق گشت جاری تھا اور ہر شخص اپنی جگہ مستعد اور کسی بھی ہنگامی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رکھائی دے رہا تھا۔

پہلے طاہر اپنی چار پائی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھا تھا جس کے بعد سلیم نے اس کی تقلید کی۔ وہ

جانتے تھے کہ کسی بھی لمحے مشتاق بیدار ہو کر ان کے لیے مسائل پیدا کر سکتا ہے۔ انہیں پہلے اس غدار سے نمٹنا تھا جو اب تک دشمن کا آلہ کار بن کر کھتے ہی ہم وطنوں کے خون سے ہولی میل چکا تھا۔

آج اس کا یوم حساب اس دشمن کے گھر میں آ گیا تھا جس نے اسے آستین کا ساپ بنا کر اپنے ہی وطن میں اپنے لوگوں کو ڈسنے کے لیے کھلا چھوڑ دیا تھا۔

شاید اس کے ناقابل معافی گناہوں کی وجہ سے قدرت کو اس کی موت کو بھی پاک سر زمین پسند نہیں تھی اور اس کی سرتیہ (موت) کے لیے بھی وہ جگہ پسند کی تھی جہاں اسے قبر کی مٹی بھی نصیب نہ ہو۔

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

اپنی اپنی گمزی کا وقت دیوار پر لگی گھڑی سے ملایا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ دونوں ایک دوسرے سے بڑی گرم جوشی سے بغل گیر ہوئے اور ایک دوسرے کی پیٹھ ٹھونکنے ہوئے الگ ہو گئے۔

دوسرے ہی لمحے جیسے ان کے جسموں میں کوئی نا دیدہ قوت سراپت کر گئی۔ برقی رفتار سے آگے بڑھ کر ظاہر نے خواب خرگوش کے مزے لیتے ہوئے شراب کے نئے نئے دھت مشتاق کو یوں آکٹو پس کی طرح بکڑا کر اس کے لیے اپنے جسم کے کسی انگ کو حرکت دینا ناممکن ہو گیا۔

عین ان ہی لمحات میں سلیم نے اپنے دونوں ہاتھ مشتاق کی گردن پر گاڑ دیے۔

مشتاق کی آنکھیں پھٹ چکی تھیں۔

وہ خندے بیدار ہو چکا تھا۔

لیکن.....

اس کے لیے ملحق سے آواز نکالنا یا اپنے جسم کے کسی حصے کو جنبش دینا ناممکن تھا۔ البتہ اسے ایک سہولت ضرور حاصل تھی۔

ا وہ بے بسی سے اپنی موت کا تماشا ضرور آخری لمحات تک دیکھ سکتا تھا۔

اور.....

یہ لمحے بھی بے حد مختصر تھے۔

بشکل دومنٹ بھی وہ مزید پی پاپا جس کے بعد زندگی سے اس کا باطل کر گیا۔ سلیم کے ہاتھوں کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ مشتاق کی گردن پر اس کی انگلیوں کے نشان ابھر آئے تھے۔

دونوں نے نفرت سے ایک نظر اس کے مردہ وجود پر ڈالی اور اس کے منہ پر کھل ڈال کر اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچ گئے۔

آواز پیدا کئے بغیر پہلے ظاہر نے دروازے کی کنڈی اندر سے کھولی اور سامنے کوریڈور کو خالی پا کر اللہ کا نام لے کر پہلا قدم باہر رکھ دیا۔

سلیم اندر ہی موجود رہا۔

ظاہر نے پلان کے مطابق بیلی کی طرح پنجوں پر چلتے ہوئے کوریڈور کے آخری کونے تک ایک چکر لگایا اور مطمئن ہو کر واپس اپنے کمرے تک آ گیا جس کے باہر سلیم موجود تھا۔

سلیم نے اسی اثنا میں دروازہ بند کر دیا تھا۔

○ ○ ○

ظاہر کی طرف سے ”سب اچھا“ کا اشارہ ملنے کے بعد وہ اب اس کے تعاقب میں اپنے پاؤں چل رہا تھا۔

دونوں انتہائی چوکے تھے۔

ان کی حیات اتنی بیدار تھیں کہ دونوں کو اپنے دلوں کی دھڑکنوں اور سانسوں کے زیر و بم کا بخوبی احساس ہو رہا تھا۔

کوریڈور سے باہر نکل کر وہ اپنے کمرے کی قطار کی پشت پر آ گئے اور بشکل دس بارہ لمبے ڈگ بھرتے ساپ کی طرح ان سرکنڈوں میں رینگ گئے جن سے وہ گزشتہ پانچ چھ روز سے روزانہ گزر رہے تھے۔

یہی جنگی گھاس دہشت گردوں کی تربیت کے لیے لگائی گئی تھی۔

یہ جگہ ان کے لیے انتہی نہیں تھی۔ گزشتہ پندرہ روز سے وہ یہیں تربیت لے رہے تھے۔

دونوں اب سرکنڈوں کے آخری حصے میں پہنچ چکے تھے جس کے بعد ایک چھوٹی سی نہر عبور کر کے انہیں اپنے ٹارگٹ تک پہنچنا تھا۔

اچانک ہی آسمان پر بجلی زور سے گڑی اور سارا منظر روشن ہو گیا۔

شاید یہ تائید نہیں تھی کیونکہ بجلی کے کوندے سے جو روشنی ہوئی اس میں دونوں نے سر کندوں سے کچھ قائلے پر بارش میں بیٹھنا ہوا ایک انسانی ہیولہ دیکھ لیا تھا۔ یہ وہ گارڈ تھا جو معمول کی گشت کر رہا تھا۔

دونوں وہیں جم کر بیٹھ رہے۔

انہوں نے اپنے کپڑوں پر اور کوٹ پہن رکھے تھے جو یہاں کے گاڑرات کو استعمال کیا کرتے تھے، لیکن اب بارش میں بھیگ کر ان کا وزن بھی دوگنا ہو رہا تھا اور دونوں اس مصیبت سے جلد از جلد نجات کی فکر میں تھے۔

سلیم نے طاہر کی طرف دیکھا جس نے ہاتھ کے مخصوص اشارے سے اسے صبر کی تلقین کی اور اپنی دائرہ پروف گھڑی پر مزید تین منٹ تک انتظار کے بعد تسلیم کو وہیں رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ جب تک کہ وہ قدموں چلتا ہوا سڑک عبور کر گیا جس کے بعد انہوں نے ٹریفک ایریا تک پہنچنا تھا۔

شاید گاڑا اب وہاں سے آگے چلا گیا تھا۔

سلیم نے طے شدہ پروگرام کے مطابق مزید تین منٹ انتظار کیا اور طاہر کی تقلید میں وہ بھی آگے بڑھ گیا۔

اسے علم تھا کہ طاہر کہاں مل سکتا ہے۔

دونوں کی ملاقات اسی منتخب گیت کے سامنے ہوئی جس کا انتخاب انہوں نے پہلے سے کر رکھا تھا۔

دوسرے ہی لمحے تسلیم کا ہاتھ اپنے کوٹ کی جیب میں گیا اور ایک لوہے کی تار سے بندھا وہ پلاس باہر آ گیا جہاں انہوں نے اگلے ہی روز چر لیا تھا۔

دو منٹ کی مزید جدوجہد کے بعد وہ گیت کا تالا کھول چکا تھا اور اب دونوں نے اندر داخل ہو کر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

انہیں یقین تھا کہ اندر کوئی نہیں ہوگا۔ یہاں حساسی نوعیت کے مختلف ”ڈیوائس“ اور دھماکہ خیز مواد کی وجہ سے دن کے اوقات میں بھی یہ لوگ نزدیک جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔

دونوں یہاں کے چپے چپے سے آشنا ہو چکے تھے اور اب جیزی سے اس چھوٹے سے کمرے کے سامنے پہنچ گئے تھے جہاں کل ہی آنے والی تازہ کھپ کے ”ریوٹ کنٹرول“ رکھے ہوئے تھے۔

اگلے پون گھنٹہ میں انہوں نے ہڈاری کپ کے اس تریچے کپ میں قریباً پندرہ جگہوں پر دھماکہ خیز مواد نصب کر کے ان کے ریوٹ کنٹرول اپنی جیبوں میں رکھ لیے تھے۔

دونوں نے بطور خاص پٹرول، بارود کے ذخائر، ٹرانسپورٹ ایریا اور انسٹرکٹرز کے ریڈیو نفل ایریا کو اپنی زد میں لے لیا تھا۔ اب تک ان کا منصوبہ گھڑی کی سوئیوں کے مین مطابق طے پا رہا تھا۔

انہوں نے اپنا کام ایک گھنٹے میں مکمل کرنا تھا جس کے بعد دھماکوں کا آغاز ہونے والا تھا۔

تین بڑے ٹائم بم جو انہوں نے آخری چندرہ سولہ اور سترہ منٹ کے وقفے سے فٹ گئے تھے، کے سنسنے میں بمشکل تین چار منٹ باقی رہ گئے تھے جب وہ اس ڈیوائس کے مین گیت کے نزدیک ایک محفوظ مقام پر بیٹھ گئے جہاں سے واحد راستہ باہر کی طرف جاتا تھا۔

دونوں کے دل کی دھڑکنیں اب معمول سے زیادہ تیز چل رہی تھیں۔

جین

کیا خیال جو ایک لمحے کے لیے بھی دونوں میں سے کسی ایک کو خوف چھو کر بھی گزرا ہو۔

○ ○ ○

طاہر نے آخری لمحات میں اپنی جیب میں رکھے گاڑ کو فائر پوزیشن میں کر کے اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام لیا تھا جب کہ تسلیم تربیت کے مطابق اس سے چند قدم کے فاصلے پر ڈیوائس کے اندر کھلنے والے دروازے کے بالکل نزدیک اس طرح کھڑا تھا کہ دروازے کھلتے ہی وہ آسانی سے ڈیوائس میں داخل ہو سکے۔

اچانک ہی فضا ایک زوردار دھماکہ کی آواز سے لرز اٹھی۔

پہلا دھماکہ اسی بارود میں ہوا تھا جو جہاں کہ ہم بتانے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

اس سے پہلے کہ تمام انتظامیہ کو صورت حال کی سمجھ آئے، دوسرا دھماکہ پٹرول ڈمپ

کے نزدیک ہوا اور آگ کی لپٹیں آسمان کو چھونے لگیں۔ ایک منٹ کے وقفے سے تیسرے دھماکے نے تو جیسے اس سارے کپ کو اس کے تختہ خیمین سمیت زمین میں ہونے پر مجبور کر دیا۔

○ ○ ○

دھماکوں سے نکلنے والی آگ پر بارش اثر انداز نہیں ہو رہی تھی اور اس کے شعلے بلند سے بلند ہوتے جا رہے تھے۔ اچانک ہی ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا اور یوگھلائے ہوئے گاڑو دھماکوں والی جگہوں کی طرف بھاگنے لگے۔

شاید یہاں کوئی الارم سسٹم نہیں تھا۔

شاید ان لوگوں کے ہم مکان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ ان کا دشمن اتنی دیدہ دلیری کا مظاہرہ کر پائے گا اور ان کی منوں میں کس کس کے قلب میں ڈانٹا رہے گا۔

ایس ایس بی کوئی مموئی سسٹم نہیں تھی۔

بھارت کی مختلف شاخیں جن ایجنسیوں کے شروماں یہاں جمع تھے اور ان شروماں کے اجتماع میں کچھ کرگزرتا جوئے شیر لانے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔

لیکن یہاں سیکورٹی کا فول پروف نظام ضرور بنایا گیا تھا۔ وہ تو تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ یہاں موجود کسی بھی ایجنٹ کے دل و دماغ میں ایک لمبے کے لیے بھی جنم لینے والا کوئی منصوبہ ان کی عقلی نظروں سے چھپ سکے گا۔

شاید انہوں نے کبھی اس امکان کو ذہن میں رکھا ہی نہیں تھا کہ اس کپ میں دشمن کے تحریک کار بھی داخل ہو سکتے ہیں۔

ابھی وہ لوگ مشکل اپنے آسمان ہی بحال کر پائے تھے جب طاہر اور سلیم کے ہاتھوں میں پکڑے ریوٹ کنٹرول سے دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

یوں لگتا تھا جیسے انیر فوس نے حملہ کر دیا ہو۔ دھماکوں کا زلزلہ والا سلسلہ جاری تھا اور صورت حال ایسی خطرناک ہو گئی تھی کہ یہاں ہر کوئی میں مقیم درجنوں تحریک کار خیرند سے ہڑبوا کر اٹھے اور دیوانہ وار اپنی جانیں بچانے کے لیے ڈیوڑھی کی طرف بھاگنے لگے جبکہ ڈیوڑھی تک پہنچنے والے گاڑو کو کچھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کریں۔

ابھی تک رات کی اس گہرائی کی طرف سے انہیں کوئی واضح ہدایت نہیں ملی

تھیں۔

آج تک ایسی صورت حال پیش نہیں آئی تھی۔

اب ایک نئی چٹان پر پڑی۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اپنی جانیں بچائیں اس جگہ پر قابو پائیں یا اپنی جان بچانے کے لیے بھاگتے ہوئے ان تحریک کاروں کو کنٹرول کریں۔ طاہر اور سلیم اپنا کام مکمل کر چکے تھے۔

اسی وقت وہ دونوں لمبے لمبے اور کوٹ پہنے ہوئے رات کو پہرہ دینے والے گاڑو کی دکھائی دے رہے تھے۔

پندرہ بیس یوگھلائے ہوئے گاڑو زاوروں کا بارہ زیر تربیت تحریک کار جن میں سے زیادہ تر رشی حالت میں تھے ان کے گرد موجود تھے۔ ہر کسی کی کوشش تھی کہ وہ ڈیوڑھی کے راستے باہر نکل سکے۔

یہ مناسب موقع تھا۔

ظاہر نے اپنے پاس موجود آخری کھلو تاجم اپنے ہاتھوں میں لیا اور دونوں اسی بھیڑ کا حصہ بنے ڈیوڑھی میں گھس گئے جو یہاں پہلے سے موجود تھی۔

پندرہ بیس لوگوں کے اس اجتماع میں وہ گاڑو کا حصہ ہی دکھائی دے رہے تھے۔ ڈیوڑھی میں اندر میرا تھا۔ شاید بجلی کا نظام بھی دھماکوں کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ مین گیٹ کھلا ہوا تھا اور رشی تحریک کار چیتے چلاتے اس سے باہر بھاگ رہے تھے۔

مین گیٹ سے ملحق آفس میں دو تین یوگھلائے ہوئے ذمہ دار موجود تھے جو شاید وائزلیس پر چلاتے ہوئے اپنی بانی مکان کو اس حادثے کی خبر دے رہے تھے۔ خوف زدہ صورت حال سے انتہائی پریشان اور منتشر ذہن ان تحریک کاروں اور ان کے کارہائوں کو طعم نہ ہو سکا کہ کب سلیم اور ظاہر نے اپنے پاس موجود دو آخری پٹانے وہاں پہنچے اور دوسروں کی تھلید میں چیتے چلاتے مین گیٹ سے باہر نکل گئے۔

ان کے باہر نکلتے ہی دونوں پٹانے دھماکوں کے ساتھ پھٹ گئے کیونکہ انہوں نے آخری ”ریوٹ کنٹرول“ استعمال کر دیئے تھے۔

انتہائی طاقت ور ان دھماکوں سے ڈیوڑھی کی ایک دیوار ٹوٹ کر اندر م توڑے منتشر

ہجوم پر گری اور ان کی جھپٹیں بھی اس ڈھیر میں دب کر رہ گئیں۔

ڈیوڈ جی کے باہر موجود گارڈروم میں موجود تمام میزیں چھت سے لگ کر دو پارہ ان کے سروں پر گر گئیں جو یہاں موجود تھے اور انھیں شدید زخمی کر دیا۔

○○○

دونوں اس وقت یہاں سے پچاس ساٹھ گز دور زمین سے چپکے ہوئے تھے۔ وہ آخری جہتی کا خطرہ دیکھنے کے لئے یہاں رکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

ابھی ابھی انہوں نے اپنے جسموں سے گیلے ہو کر چپکے بھاری کوٹ الگ کر دیئے تھے۔ بارش کا زور اب اتنے ٹوٹنے لگا تھا اور وہ بڑے مستعد اور تربیت یافتہ کمانڈرز کی طرح گھڑی کی سوئیوں کے مطابق مرحلہ وار منصوبے پر عمل پیرا تھے۔

دونوں کا رخ اب کسپ کے رینڈ پینٹل ایریا کی طرف تھا جہاں ملٹی رویشیاں بھج چکی تھیں کیونکہ بارش یا پھر دھماکوں کی وجہ سے مین سیٹائی میں کوئی غلط پڑ گیا تھا۔

دونوں اب اپنی دانست میں رہائشی ایریا کے اس حصے تک پہنچ چکے تھے جہاں انہیں کوئی امداد میسر آ سکتی تھی۔

”اوپر آؤ۔“

سلیم کو طاہر کی سرگوشی سنائی دی اور وہ اس کے پیچھے اس راستے پر گھوم گیا جو یہاں سے دوسری طرف اس گھڑی پر مڑتا تھا جہاں سے وہ لوگ سڑک پر پایا کرتے تھے۔

”آگے سڑک ہے شاید۔“

سلیم نے بظاہر طنز یہ لہجہ میں کہا۔

”بس اللہ کی قدرت کے مناظر دیکھتے جاؤ۔“

طاہر نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا اور چلا گیا۔ پھر اچانک وہ چلتے چلتے رک گیا۔

اب دور ہانسی ایریا کے عقب میں اس ورکشاپ کے نزدیک پہنچ گئے تھے جہاں بیواری کپ کے ڈیمیکو کی مرمت کی جاتی تھی۔

ورکشاپ کی دیوار کے ساتھ مرمت طلب جیپیں کھڑی تھیں۔ اچانک ہی سلیم کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہاں ایک کونے میں ایک موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ بالکل ایسے جیسے وہ ان دونوں ہی کی تھی۔

پہلی ہی نظر میں سلیم نے پہچان لیا کہ یہ کاشی اگر وال کی پرائیویٹ موٹر سائیکل ہے۔ یہاں قریباً ہر انٹرکونر نے اپنی موٹر سائیکل یا کار رکھی ہوئی تھی۔
”کیا خیال ہے؟“

طاہر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

”ویل ڈن۔“

بے ساختہ سلیم کے منہ سے نکلا۔

سلیم چیخے بیٹھا تھا۔ موٹر سائیکل طاہر نے سنبھالی اور وہ عاجز سفر ہوئے۔ تمام راستے جن پر طاہر موٹر سائیکل چلا رہا تھا سلیم کے لیے بالکل اجنبی تھے۔

○○○

موٹر سائیکل طاہر چلا رہا تھا اور اپنے بدن کے گرد بڑے سے اور کوٹ کو چادر کی طرح لپیٹ کر سلیم اس کے پیچھے بیٹھا تھا۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ بارش اب رک گئی تھی اور طاہر آسانی سے ڈرائیو تک کر سکتا تھا لیکن مخالف سمت سے آنے والی ٹھنڈی ہواؤں کے تھپڑے ان کے بدن کو بلینڈ کی طرح کاٹ رہے تھے اور آنکھوں پر عینک نہ ہونے کے سبب اسے بار بار آنکھیں بند کرنا پڑتی تھیں۔ جو راستہ طاہر نے اختیار کیا تھا وہ سلیم کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ قریباً تین کلومیٹر کا سفر کرنے کے بعد اس نے اچانک ہی موٹر سائیکل کیپے راستے پر اتار لی تھی۔ سلیم دم سادھے چپ چاپ اس کے پیچھے بیٹھا تھا۔ اسے طاہر کی کمان میں پہلی مرتبہ کام کرنے کا موقع ملا تھا اور وہ اس کی تجربہ کاری سے مستغرق ہو رہا تھا۔

طاہر نے بلاشبہ کاشی اگر وال کے ذریعے بہترین نتائج حاصل کئے تھے۔ ان حالات میں موٹر سائیکل ان کے ہاتھ لگانا بظاہر کسی معجزے سے کم دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

لیکن۔

سلیم جانتا تھا کہ یہ کاشی اگر وال کی طرف سے ان کے لیے بہترین نفلت تھا۔

جانے طاہر نے کاشی پر کیا جادو پھونکا تھا جو اس طرح دو اپنا سب کچھ بھول کر اس کی گردید ہوئی تھی اور ان کے لیے اتنی آسانی بھی پیدا کر دی تھی۔

ابھی تک اسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ کاشی ان کے ساتھ ہی یہاں سے فرار ہو چکی ہے۔ اس کےپے اور بھولنے والے پر موٹر سائیکل کو اس طرح بھگاتے پٹے جانا طاہر ہی کا کام تھا۔ سلیم جانتا تھا شاید اس کے لیے یہ ممکن نہ ہوتا۔

اسے اب احساس ہونے لگا تھا کہ کاشی اگر وال اور طاہر کی دوستی نے ان کے لیے کتنی آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔

یہ کاشی ہی تھی جس کے ساتھ روزانہ کپ کے باہر گھومنے سے طاہر کو ان راستوں کا علم ہو اور نہ تو یہاں سے فرار کے صرف دو ہی راستے انہیں سمجھائے گئے ہیں۔

کرل صاحب نے اس روز اپنی آخری بریفنگ میں کہا تھا۔

”ہمارے علم کی حد تک تمام معلومات جھیں مل چکی ہیں۔ فی الوقت فرار کے بھی دو راستے ہمارے علم میں ہیں۔ مگر اپنی ہمت سے تم کوئی تیسرا راستہ ڈھونڈ سکو تو ویل ڈن۔“

اور۔

انہوں نے تیسرا راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔

سلیم جانتا تھا کہ آگ جلد ہی بجھ جائے گی کیونکہ بارش جہاں ان کی مددگار تھی وہاں دشمن کے لیے بھی کار آمد تھی۔ اگر یہ آگ کسی عمارت کو لگی ہوئی تو شاید اب تک دشمن اس پر قابو بھی پا چکا ہوتا لیکن بارود کو لگی آگ تب بجھ سکتی تھی جب سارا بارود رکھنا بن جاتا۔

یہاں ایک سوچ انہیں اطمینان دلارہی تھی۔

وہ جانتے تھے کہ دشمن پہلے کپ کے حالات داخل کرے گا جس کے بعد ہی ان کے خلاف کارروائی شروع ہوگی۔

سلیم کے اندازے کے مطابق وہ لوگ اب کپ سے قریب افس بارہ کلومیٹر دور نکل آئے تھے۔

”ہوں۔ اس لیے کچھ باتیں ضرور کہوں گا۔“

یہ کہہ کر اس نے طاہر کو کچھ مکہر احتیاطی تاہیر بتائیں۔ ان میں سے کچھ تو طاہر کے ذہن میں پہلے ہی سے تھیں۔ کچھ باتیں البتہ اس کے لیے بھی نئی اور چونکا دینے والی تھیں جن میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس علاقے کے گرد اگر موجود قریبا تمام بڑے آشرم اور مندر ”نرا“ کی نظروں میں رہتے ہیں۔ جب کہ وہ خود یہاں کے سب سے آشرم میں پناہ لینے جا رہا تھا۔

”اچھا دوست خدا حافظ۔“

سلیم نے بھرائی ہوئی آواز میں اس سے بغل گیر ہوتے ہوئے کہا۔

”خدا حافظ۔“

دونوں ایک دوسرے سے لینے ایک دوسرے کے کہ ان میں قرآنی آیات کا ورد کر کے ایک دوسرے کے محفوظ رہنے کی دعائیں کر رہے تھے۔

سلیم نے ہمت کر کے پہلے اسے چھوڑا اور ”فی امان اللہ“ کہہ کر لمبے لمبے ڈک بھرتا سڑک کی طرف چل دیا۔

طاہر درختوں کی اوٹ سے اسے دیکھتا رہا سلیم کے سڑک پر پہنچنے کے بمشکل تین چار منٹ بعد ہی ایک بس اسے وہاں رکھی ہوئی دکھائی دی جس پر وہ سوار ہو گیا۔

○ ○ ○

بس کی روانگی پر ایک مرتبہ پھر اس نے دل ہی دل میں اس کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگیں اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

اس نے دوسرے ہی لمحے خود کو نابل کر لیا۔

حالات کی تنگی پر اس کی نظر تھی اور وہ کاشی اگر وال کے موٹر سائیکل کا ٹول بکس کھول رہا تھا۔

کاشی نے اس کی ہدایت کے عین مطابق ایک جعلی نمبر پلیٹ وہاں رکھی ہوئی تھی۔

اگلے چند منٹ میں اس نے موٹر سائیکل کی نمبر پلیٹ تبدیل کر دی۔ اصل نمبر پلیٹ اس نے وہیں ایک محفوظ جگہ پر چھپا دی اور موٹر سائیکل سٹارٹ کر کے وہ بھی سڑک پر آ گیا۔

اب تک انہوں نے قریبا ۳۵ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ طاہر نے پٹرول کی تنگی کا

دیکھ کر دیکھا اور مطمئن ہو کر سر ہلا دیا۔ اب بھی اچھا خاصا پٹرول اس میں موجود تھا۔ کم از کم وہ انہیں اگلی منزل تک بغیر کسی رکاوٹ کے پہنچا سکتا تھا۔

اس کی منزل یہاں سے بمشکل سات آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر اس کی منتظر تھی۔

یہ سات کلومیٹر کا فاصلہ اس نے برق رفتاری سے طے کیا۔

اس دوران اسے راستے میں بمشکل سات آٹھ بیس یا سوڑ سا نیکیلیں دکھائی دیں تھیں۔

یہ وہ لوگ تھے جو صبح اپنے کام پر جا رہے تھے اور سڑی کا یہ عالم تھا کہ سوائے سائے سڑک پر دیکھنے کے اور کسی طرف گردن گھما کر دیکھنے کے بھی روادار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ یوں بھی یہاں کسی کو ایک دوسرے کی شناخت جاننے کی کیا بڑی تھی۔

○○○

دُائے کلام

نیاب

طاہر چھ ماہ پہلے یہاں کسی کام سے آیا تھا اور آج پھر قسمت اسے یہاں لے آئی تھی۔ اس نے اپنے ذہن میں پہلے سے بنے نقشے کے مطابق موٹر سائیکل کا رخ شمال کی سمت مانی کا لگا کے مندر کو جانے والے راستے کی طرف کیا اور مندر سے بمشکل ڈیڑھ دو گلو میٹر کے فاصلے پر اس سرکاری سکول کی نو تعمیر عمارت کے نزدیک رک گیا جس کی تعمیر چھ ماہ پہلے ہی سرکاری پینڈا پڑنے سے بند ہو گئی تھی۔

اسے امید تھی کہ ابھی مزید دو سال تک یہاں کام نہیں ہوگا کیونکہ ٹھیکیدار مقامی انتظامیہ کی بلی بھگت سے اپنی ساری رقم ڈکارنے کے بعد کام ادھورا چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ بڑے اطمینان سے وہ موٹر سائیکل کا انجن بند کرنے کے بعد سکول کی عمارت میں داخل ہو گیا اور یہاں اپنے مطلب کی جگہ تلاش کرنے لگا۔ جلد ہی اسے ایک کمرے میں کاٹھ کپاڑا کا ڈھیر دکھائی دیا جس کے باہر ایک کنڈی میں چھوٹا سا تالا پینسا پایا ہوا تھا۔

اس نے تالے کا گہری نظروں سے جائزہ لیا اور موٹر سائیکل کا ٹول بکس کھولنے لگا۔ اگلے چند منٹ میں اس نے وہ تالا کھول لیا تھا اور موٹر سائیکل کو اس کاٹھ کپاڑے کے ڈھیر میں اس طرح کھڑا کیا تھا کہ وہ بھی اس کا ہی حصہ دکھائی دے۔

تالا اس نے دوبارہ اس طرح لگا کر اس پر لگا سرکاری کپڑا بمعدیل کے چڑھایا اور باہر نکل آیا اب وہ کالامندر کی طرف جارہا تھا۔

جیسے جیسے وہ مندر کے نزدیک ہو رہا تھا۔ وہاں لاؤڈ سپیکروں سے برآمد ہوتی بھجن اور ڈھول تاشوں کی آوازیں نمایاں ہونے لگی تھیں اب اسے مندر کی طرف جاتے یا تری بھی دکھائی دینے لگے تھے۔

مسوری ایک پہاڑی مقام تھا۔

گر میوں میں تو یہاں کی رونقیں بہت زیادہ بڑھ جایا کرتی ہیں۔

سردیوں میں زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں ہوتی تھی۔ البتہ کچھ من چلے بھارت کے مختلف شہروں سے ضرور ادھر کا رخ کیا کرتے تھے۔

ان میں زیادہ تعداد ان تو یہاں ہوتا جو اس پرستی منانے ادھر آ جایا کرتے تھے یا پھر سردیوں میں برف باری کا مزہ لینے والے سیاح ہوتے تھے۔

آنے والا کوئی بھی ہو خواہ مقامی یا غیر مقامی اگر وہ ہندو ہوتا تو مسوری آ کر مانی کا لگا کے مندر میں ضرور ”مٹھا کھینے“ آتا تھا۔ یہاں کی ”پوجا“ سارے بھارت میں مشہور تھی۔ یہی وجہ تھی کہ موسم کے تیور کیسے ہی نظر نہ پک کیوں نہ ہوں یہاں ”ماتا بھوانی کے بھگتوں“ کا آنا جانا لگا ہی رہتا تھا اور مندر میں چڑھاوا بھی سب سے زیادہ چڑھتا تھا۔ جس کی وجہ سے یہاں کے آشرم میں پجاریوں کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جاتی تھی اور یہاں مندر کی ”گوکھ“ (چندہ ڈالنے والی جگہ) تک رسائی حاصل کرنے کے لیے یہ پجاری ایک دوسرے کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔

طاہر اس مندر میں دو تین مرتبہ آ چکا تھا۔

لیکن۔

کاٹھ کپاڑا اگر وال ہندو ہونے کے باوجود یہاں نہیں آئی تھی۔

اور۔

اس کا سبب سوائے اس کی اپنے دھرم سے بیزاری کے اور کچھ نہیں تھا۔ وہ درجنوں مرتبہ یہاں سے گزری تھی۔ ڈیرہ دون جاتے ہوئے مسوری راستے میں آتا تھا لیکن کیا خیال جو اس

نے کبھی اس طرح کا رخ کیا ہو۔

صرف ایک مرتبہ جب اس کے پتا ہی اسے ملنے آئے تو وہ زبردستی کاشی کو اپنے ساتھ یہاں لے آئے تھے۔

یہاں آنے کے بعد کاشی نے دیوی ماما کی موتی کے سامنے صرف ایک ہی وعدہ کیا تھا کہ اب وہ دوبارہ یہاں کبھی نہیں آئے گی کیونکہ اس نے یہاں کے آشرم کے کمرہوں میں ماما کے جن سیواوروں اور داسیوں کو دیکھا اس کے بعد اسے یہ مندر کی بجائے کچھ اور دکھائی دینے لگا تھا۔

اتلی جس آئینہ ہونے کے ناطے اس کی جہاندیدہ نظروں نے ان داسیوں کے چہروں پر نظریں ڈالتے ہی ان کی اصلیت کا اندازہ لگا لیا تھا اور آشرم کے پجاریوں اور سیواوروں کی آنکھوں میں موجود شیطانیات کو کوئی قتل کا اندھا بھی بخوبی دیکھ سکتا تھا۔

اپنے پتا کی کے سامنے اس نے حسب عادت ایک لمبا لکیر اس مندر میں ہونے والی حرام کاریوں پر دے دیا تھا اور وہ اسے کاشی کے معمول کی باتیں جان کر سسکراتے رہتے تھے کیونکہ انہیں اس بات کا علم تھا کہ کاشی کو کبھی اپنا دھرم پسند نہیں آیا تھا۔

”بھگوان جانے تم نے ہمارے ہی یہاں جنم لیا۔ مجھے کبھی کسی یوں لگتا ہے جیسے تمہاری ماں جنہیں کسی مسلمان گھرانے سے اٹھا کر لے لائی ہے۔“

اس روز کاشی کے بابو نے اس کے لکیر کے ماتے پر کہا تھا۔

اس کے بابو نے غلط کہا تھا صحیح.....

اس سوال کا جواب تو کاشی کو کبھی نہیں مل سکا۔

لیکن.....

آج جب تقدیر اسے دوبارہ یہاں لائی تو اسے وہ گرا اپنے بابو کی آخری بات ضرور یاد آ رہی تھی۔ اور وہ سوچ رہی تھی کہ اس کی موسیٰ نے ایک مرتبہ کتنی سچ بات کی تھی۔

وہ بھی کوئی ایسا ہی موقع تھا شاید اس کی بہن کی۔ رگائی ہوئی تھی اور ان کے یہاں ”ہون“ ہو رہا تھا۔

شیطان کی چہرے والا ایک بیماری جس کا پیٹ اس کی کمر سے باہر نکل کر کسی بھی لمبے زمین پر گرنے والا تھا جب سامگری کو چلتے ہوئے کوٹلوں پر پھینکتا اور کچھ منتر کا اتاپ شاپ کرتا تو

جناح لائبریری و جلد سارا

0333
116358

کاشی کو خواہ مخواہ آ جاتا تھا۔

اسے اس بات کی سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ خود اپنے ہی دھرم کے نام پر ہی روانہ آ کر آگئی (آگ) کے بغیر مکمل کیوں نہیں ہوتے۔

اس کے بابو نے بتایا تھا کہ مندو دھرم میں آگ بہت پوتر ہے۔ ویدک (بہت پرانا) زمانے میں پرش (انسانوں) اور دیوتاؤں کے درمیان آگ ہی کیونکیشن کا ذریعہ تھی۔

قدیم آریہ سماج اپنی ہیئت اسی آگ کے ذریعے اپنے دیوتاؤں کو پہنچایا کرتے تھے اور پھر یہ سلسلہ یہاں تک چلا کر تیسری (مرنے والے) کو پرلوک (عقلی) چٹلوک (عالم ارواح) اور برہم لوک (لاہوت) پہنچانے کے لیے مذرا کش کیا جانے لگا۔

لیکن..... ہر خوشی کے موقع پر بھی آگ کا ”ہون کھنڈ“.....

اس نے اپنے بابو کی بات کاٹی۔

”تیری تو وحشی (عقل) بھرشت ہو گئی ہے۔“

معتب سے اسے موسیٰ کی آواز سنائی دی جو اسے بازو سے پکڑ کر دوسری طرف لے گئی کیونکہ یہاں موجود عورتوں میں سے اگر کسی کے کان میں بھی اس کے خیالات کی بھنگ پڑ جاتی تو سارا سماج اس کے گھر والوں کا پانی کاٹ کر دیتا۔

اس روز اس کی موسیٰ نے کہا تھا۔

”بٹی سنار میں سب کچھ ہم اپنے ارادے اور مرضی سے نہیں کرتے۔ بہت کچھ ہمیں مجبوراً بھی کرنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی کوئی چیز بہت بری لگتی ہے لیکن ہم اس کے حق میں بھی رہتے ہیں۔ بار بار اس کی طلب بھی کرتے ہیں۔ کیا کوئی اپنی مرضی سے ٹروی سکیں دو انہیں کھاتا ہے۔

نہیں تاں..... بس تو بھی اسی طرح دھرم کرم کرتی رہا کر خواہ تیرا دل مانے یا نہ مانے۔ ایک بات میرا من کہتا ہے جو اپنی زبان تک لاتے ہوئے ڈرتی ہوں۔ بٹی لگتا ہے تو کسی دن اچانک یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلی جائے گی۔ بھگوان کرے میں وہ دن دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہوں۔ کیونکہ مجھ سے یہ کچھ دیکھا نہیں جائے گا لیکن میرا من کہتا ہے کہ ایسا ہو گا ضرور۔“

اس روز موسیٰ نے یہ بات پہلی مرتبہ بہت شجیدگی سے کی تھی۔

لیکن.....

کامنی نے زوردار قہقہہ لگایا تھا اور موسیٰ کا بازو پکڑ کر ایک طرف لے گئی تھی۔
 "اپنے دامان پر زیادہ بوجھ نہ ڈالو۔ ورنہ پھر وہی ٹیکے لگوانے پڑیں گے۔"
 اس نے موسیٰ سے ہنستے ہوئے کہا۔

اور.....

اپنے کمرے میں آ کر کانوں پر بیڈ فون چڑھا کر اپنے پند کا میز تک سننے لگی کیونکہ یہی اس کے لیے نجات کی واحد راہ تھی۔ ورنہ تو کھربیں "پوچا" شروع ہوئی تھی اور زور زور سے ڈھول تاشول کے ساتھ اپنی بھری اور موٹی آوازوں میں مٹنے کی غورتوں نے بھی گانے شروع کر دیے تھے۔

کامنی نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ جس گورکھ دھندے میں وہ دھنسنے لگی ہے کبھی وہاں سے نہیں نکل پائے گی۔ اسے تو یوں لگتا تھا جیسے جیسے زندگی کا وہ سال آگے بڑھ رہی ہے وہ زندگی کی اس دلدل میں اور زیادہ گہری اثراتی چلی جا رہی ہے۔

لیکن.....

آج اچانک اسے اپنی موسیٰ یاد آ گئی۔

اس کی موسیٰ نے ساری زندگی بیاہ نہیں کیا تھا۔ ساری زندگی "بھگتی" میں گزار دی تھی۔ اپنی ساری جوانی بھگوان رشی کیش کی سیوا کی سمیت چڑھا دی تھی۔ دہلی کے نزدیک گوری گاؤں میں موجود ساھوؤں کے اس بھٹ پر اس کی موسیٰ کی جوانی اپنے بھگوان کی سیوا میں بیت گئی تھی۔

○ ○ ○

صبح سے رات گئے تک وہ اپنے ہمیشی درجنوں دوسری مہلاؤں کے ہمراہ اپنے بھگوان کی سیوا میں لگی رہتی تھی۔ بھٹ میں رہنے والے ساھوؤں کی سیوا سنبھال کرتی رہتی تھی اور ایک روز نجانے کس بات پر وہ ان کے ہاں ردھہ کر چلی آئی جس کے بعد پھر کبھی بھٹ پر واپس نہیں گئی تھی۔ اب ان کے محلے میں دھرم کرم کا کوئی بھی کام ہوتا لوگ اسی کو بلا کر لے جاتے تھے۔ اکثر گھروں میں "ہولی" دہی کروائی تھی۔ ہندو گھرانے اس سے مختلف مواقع پر ہونے والی رسومات کے متعلق دریافت کرتے اور اس پر عمل کیا کرتے تھے۔

"داہ موسیٰ..... واقعی تو نے بچ کہا تھا۔"

اس نے دل ہی دل میں اپنی موسیٰ کو یاد کیا۔ ایک پھینکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر تھی۔ کامنی کو اپنے شعور کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ اس تلخ حقیقت کا احساس اور علم تھا کہ اس نے اچانک ہی کتنا بڑا قدم اٹھالیا ہے۔ وہ اپنا گھر یا دین دھرم دیش، سکھی، سہیلیاں سب کچھ بھلا کر سب کو تیاگ کر اچانک ایک مسلمان نوجوان کے ساتھ بھاگ آئی تھی۔

اسے حیرانگی تھی کہ اب تک وہ سر کیوں نہیں گئی۔

اس جیسی نندار اور دیش دروہ کو تو اب تک مرجانا چاہیے تھا۔

لیکن.....

وہ زندہ تھی۔

اس کا خمیر بھی زندہ تھا۔

کوئی خلش اسے نہیں رلا پاتی تھی۔ کوئی پیچھے نہ اس کے دامن سے نہیں لپٹا تھا۔ وہ تو

بہت پرسکون تھی۔ بہت پرسکون۔

بالکل برآمد کے اس درخت کی طرح جو اس مندر کے شال میں اس ٹوٹی ہوئی پرانی عبادت گاہ پر سایہ کئے ہوئے تھا جہاں وہ کل رات سے چھپی بیٹھی تھی۔ جانے اس برآمد کے بیڑے نے کتنے سالوں سے دھوپ، گرمی، سردی، بارش، طوفان کی سختیاں برداشت کی ہیں اور اب تک پر سکون کھڑا ہے۔

کس لیے ایسا تو نہیں کیا اس کا خامشی سارا بھوت تھا۔

اس نے اپنے اوپر کوئی تلخ چڑھا رکھا تھا۔

اپنے گردے بنیاد نظریات کی ایسی دیواریں استوار کر لی تھیں۔ جو ظاہر کی محبت کے معمولی جھیز سے بھی برداشت نہ کر سکیں اور ایک ایک کر کے زمین بوس ہو گئیں۔

"تو پھر بچ کیا ہے؟"

اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

"بچ یہی ہے کامنی۔ جو تم دیکھ رہی ہو۔ جو تمہارے ساتھ ہو رہا ہے۔"

کسی ناہیدہ طاقت نے اس کے سوال کا جواب اس کے کانوں میں دیا۔

تمہیں اس بچ کی تلاش تھی۔ تم بچپن سے اسی تلاش کے سفر پر نکلے تھی۔ اپنی تلاش کے

سفر پر یہ منزل مبارک ہو گا مٹی اگر وال۔ مبارک ہو تم نے خود کو بلا خرکونج ہی لیا۔ خود کو بلا خر پائی لیا۔ تم فاتح ہو۔ تم جیت گئیں گا مٹی اگر وال۔

اس کے دل اور ضمیر نے اسے مبارکباد دی۔

اپنے فاتح ہونے کا فخر اس پر سردی طرح اتر گیا۔ اس کو اپنے تن بدن میں دو راند تک سرشاری کی ایک عجیب کیفیت کے اترنے کا احساس ہوا۔ وہ فتح کے نشے سے سرشار اب ظاہر کی خطر تھی!!

وہ زندگی میں آج دوسری مرتبہ کا کلا مندر آئی تھی۔

اپنے والد کے ساتھ بھی بادل غماز است اور اب بھی۔

اگر ظاہر نے کسی اور جگہ کا تعین کیا ہوتا تو شاید وہ یہاں نہ آئی اس کے ذہن میں کچھ اور جگہیں بھی محفوظ تھیں۔

لیکن

اس کی انٹیلی جنس کی تربیت نے اسے اپنی طرف سے ظاہر کو کوئی مشورہ دینے سے منع کیا تھا۔ وہ اس مرحلے پر ایک لمحے کے لیے بھی ظاہر کا اعتبار نہیں کھوتا چاہتی تھی۔

اس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ تو اچانک کیا تھا۔ لیکن اسے علم تھا کہ لا شعوری طور پر وہ طویل عرصے سے ایسے ہی کسی فیصلے کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی۔

○ ○ ○

اس روز بھی ظاہر نے اسے اپنا مکمل تعارف نہیں کروایا تھا جس روز اس نے پوسال کو جان سے مار ڈالا۔

اس پوسال کو جو موقعہ قیمت جان کر کا مٹی کو اپنی زندگی کا نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ کا مٹی کے لیے ظاہر کی اچانک آمد پوسال کا قتل اور اس کا فرار۔ قدرت کے تیار کردہ کسی کھیل کے تین مختلف ایکٹ تھے۔

ایک احساس جس نے ابھی تک اسے بہت حوصلہ دے رکھا تھا کہ اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس میں کا مٹی کی اپنی ہی نہیں پر ماتما کی مرضی بھی شامل ہے۔

حالات خود بخود بننے پڑنے جا رہے تھے اور وہ کاتب القدر کے اشاروں پر کچھ چٹکی کی

طرح عمل کرتی چلی جا رہی تھی۔

پوسال کے قتل کی رات وہ بری طرح سہم تھی۔

اسے علم تھا کہ پوسال کی لاش اگلے ایک دو روز میں بہر حال مل جائے گی۔ یہاں کے ندی نالے گو بہت تیز بہتے تھے لیکن راستے میں آنے والے کسی نہ کسی بڑے پتھر سے ٹکرا کر ان میں بہنے والی چیزیں کنارے لگ جایا کرتی ہیں۔

ان ندی نالوں کے بہاؤ کے ساتھ بہہ کر آنے والی لاشیں اب معمول کی بات بن چکی تھیں۔

لیکن

پوسال کی لاش معمول کی بات نہیں تھی۔

مقامی پولیس افسران اسے اچھی طرح پہچانتے تھے کیونکہ گزشتہ دو سال سے وہ بٹاری سنٹر میں خدمات انجام دے رہا تھا۔ اور مقامی انتظامیہ کے ساتھ اس کا کوئی نہ کوئی پھندا آئے روز پڑا لگا رہتا تھا۔

کا مٹی کو آج بھی یہ سوچ کر جھرجھری ہی آ جاتی تھی کہ اگر ظاہر بروقت وہاں نہ پہنچ جاتا تو اس کا انجام کیا ہوتا۔

شاید پوسال کی جگہ اس کی سخ شدہ لاش آبروریزی کے بعد کسی پتھر سے چکی ہوئی مل جاتی۔

اس کے علاوہ کچھ ممکن نہیں تھا۔

ووکپ واپسی پر ساری رات یہی سوچتی رہی تھی کہ اگر ظاہر نے اس کی مدد کیوں کی؟ وہ تو ایک زیر تربیت خزیب کا رہتا تھا۔

اس کی بلا سے پوسال اس کے سامنے کا مٹی کے جسم کے پڑے پڑے بھی کر دیتا تو بھی وہ اپنے ڈیپلن کے تحت دونوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں بھی پوسال بہر حال کا مٹی سے سینئر تھا۔

اسے حق حاصل تھا کہ اس کے ساتھ جو بھی سلوک کرے۔ لیکن اس نے کا مٹی کو بیچایا تھا اور اپنی جان کا ڈپر لگا کر پوسال سے ٹکرایا تھا۔

اس روز کا منی کو یقین ہو گیا کہ واقعی طاہر کو اس سے عشق تھا۔ صرف یہی ایک ایسا رشتہ تھا جو اسے اس حد تک کچھ کر گزرنے پر مجبور کر سکتا تھا۔

طاہر نے کا منی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ ہٹواری کپ سے فرار ہونے سے پہلے یہاں کیا کچھ کرنا چاہتا ہے۔

اس نے کا منی سے صرف یہی کہا تھا کہ وہ دونوں یہاں سے بھاگ جائیں گے۔ ابھی تک اس نے کا منی کو اپنی اصلیت نہیں بتائی تھی۔ ابھی تک وہ کا منی کے لیے ایک زیر تربیت غیر ملکی تجزیہ کار تھا۔

اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اگر وہ کا منی کو اپنے آئندہ عزائم اور اصلیت سے آگاہ بھی کر دے تب بھی کا منی اس کے خلاف کچھ نہیں کرے گی اور وہ اداکاری نہیں کر رہی تھی بلکہ دل و دماغ سے مکمل یکسوئی کے بعد اس نے طاہر کو اپنانے کے لیے سب کچھ تیار کر دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

طاہر جانتا تھا کہ صرف پولیس کی موت کا خوف کا منی کو اس کے ساتھ فرار پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تو کا منی کے اندر سے پیدا ہونے والی کوئی انتہائی تبدیلی تھی۔ جس نے اسے ایسی زندگی کا سب سے بڑا ہم اور خطرناک فیصلہ کرنے پر آمادہ کیا تھا۔

لیکن.....

ان تمام حقائق کا ادراک رکھنے سے باوجود ابھی تک اس نے نو کا منی کو اپنی اصلیت سے آگاہ کیا تھا نہ ہی اپنے عزائم بتائے تھے۔ یہی اس کی تربیت کا خاصہ تھا۔

اس بات میں کوئی شک باقی نہیں رہ گیا تھا کہ اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ اس بری طرح اپنے دل کے ہاتھوں بات کھائی تھی اور کا منی کے سامنے کم از کم دی گئی حد تک خود کو مکمل بے بس محسوس کرنے لگا تھا۔

لیکن.....

اس نے اس بات کو کبھی فراموش نہیں کیا تھا کہ وہ بول آخر ایک نظریاتی ملک کا پاسی ہے جسے اپنے ملک و قوم کی حفاظت کا فریضہ سونپا گیا ہے اور جس کے ایک لمحے کی غفلت سے کتنے تباہ کن نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔

کا منی نے اتوار کی شام معمول کے مطابق خود کو تیار کیا تھا۔

لیکن.....

آج اس نے اپنے پاس موجود ہر قابل ذکر چیز ایک ایک میں منتقل کر کے یہاں سے راہ فرار اختیار کی تھی۔

اس سے کسی نے یہ دریافت نہیں کرنا تھا کہ وہ بیک لے کر کہاں جا رہی ہے۔ کیونکہ یہاں موجود انسٹرکٹر اکثر ڈیرہ دون سے کچھ نہ کچھ خرید و فروخت کرتے رہتے تھے۔

○ ○ ○

ڈاٹ کام

بڑے اطمینان سے وہ اپنے کوارٹر سے باہر نکلی اور فرماں خراں چلتی سڑک تک آگئی۔ جہاں سے وہ ایک مسافر بس کے ذریعے پہلے مسوری کی مخالف سمت کی طرف نکلی پھر وہاں سے مزید دو تین بمبیں تبدیل کرنے کے بعد مسوری پہنچی تھی۔

اب کم از کم کسی بس والے سے اس کا سراغ ملنا ہرگز ممکن نہیں رہا تھا۔ کیونکہ اس نے اپنی دانست میں ایسا کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا۔

لیکن.....

آج خلاف معمول اس نے نہ صرف شوارٹس پیٹی ہوٹل تھی بلکہ اپنا ہمیشہ شائل بھی اب تک تین مرتبہ تبدیل کر چکی تھی۔

وہ چٹون پہنتے ہوئے اپنے بال ہمیشہ باندھ کر رکھتی تھی۔ کئی مرتبہ اس کے جی میں آیا کہ ان لمبے بالوں سے نجات حاصل کر لے۔ اب ان کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس نے ساری زندگی اگر یہی جھک مارتی ہے تو بالوں کا روگ کیوں پاتی پھرے۔

لیکن.....

ہر دفعہ کسی نادیدہ قوت نے اسے اس امر سے مائع رکھا۔

اسے اپنے بال بہت عزیز تھے۔

اس کی ہوجا سے کبھی معلوم نہ ہو سکی۔

آج اسے اپنے اس فیصلے پر بہت خوشی ہو رہی تھی کہ اس نے اپنے بال محفوظ رکھے

تھے۔ اب تک وہ ان بالوں کی مدد سے دو تین مختلف روپ دھار کر چار پانچ بمبیں تبدیل کرنے کے بعد مسوری رات دیر گئے پہنچی تھی۔

اسے اندازہ تھا کہ اگلے روز کالکائی کا سالانہ میلہ شروع ہونے والا ہے۔ شاید طاہر کو بھی اس بات کا علم تھا۔ جب ہی تو اس نے اسے شاندار وقت کا انتخاب کیا تھا۔ جس بس سے وہ اتری تھی اس میں موجود قریباً تمام مرد زن ملک کے مختلف کونوں سے یہاں مائی کالکا کے میلے پر ہی آئے تھے۔

شدید سردی کے باوجود "یاتریوں" کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔

کاشی نے بس سے اترتے ہی نزدیکی بازار کا رخ کیا وہاں سے اپنے لیے کمرے رنک کا ایک چوڑا اور کچھ مالا میس خرید کر چوڑا اپنے کپڑوں پر چھن لیا اور مالا میس گلے میں ڈال لیں۔

اب وہ کالکائی کی بھگت بن چکی تھی۔

طاہر کے لیے اس نے الگ سے "چیتا مبر" (زر پکڑا ہوا حق) خرید لیا تھا۔ کیونکہ یہاں انٹیں یہی روپ دھارتا تھا۔

یاتریوں کے ساتھ وہ بھی بادل خواستہ ناچتی گاتی مائی کالکا کے مندر تک پہنچی تھی۔ مندر میں جانے کی بجائے اس نے آشرم کا رخ کیا اور "ننگر خانے" میں آگئی جہاں "کارسیوا" (کھانا پکانا) ہو رہی تھی۔

وہ بھی باقی یاتریوں کی طرح ایک قطار میں تھالی اور گلاس اٹھا کر بیٹھ گئی۔ آشرم کی سیوا دار لڑکیاں جن کی جسمانی حالت ان کے کردار کی دخلی گھاری تھی۔ مسکراتی ہوئی تمام یاتریوں میں باری باری نظر تقسیم کر رہی تھیں۔

کاشی اگر وہاں نے بھی "بے ماتا بھوانی" کہہ کر نظر وصول کیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی دل کے ساتھ ایک پھلکا زہر مار کرنے لگی۔

اس نے کل سے آج تک سوائے کافی 'چائے' یا ایک آدھ منکٹ کے کچھ کھایا یا نہیں تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کے لئے اپنی توانائیاں بحال رکھنا ضروری ہے۔ اسے بہر حال خود کو تندرست رکھنا تھا۔

ابھی تو آغاز تھا۔

ابھی تو اس نے موت کی شاہراہ پر پہلا قدم رکھا تھا۔
نجانے ابھی اسے زندگی کے اس پہلے صراط پر کتنی مسافت پانی تھی۔

قسمت نے ابھی اسے کیا کچھ دکھانا تھا۔

اس کا دل ایک لمحہ کھانے کے لیے نہیں چاہتا تھا۔

لیکن.....

اس نے کسی نہ کسی طرح ہمارا پھلکا (روٹی) زہر مار کیا پھر چائے بھی اس لنگر سے پینے کے بعد طوعاً کرمانہ تک آگئی تھی۔

یہاں ڈھل تاشول اور کوس کی شکل میں بے شمار بھدی آوازوں نے اسے ایک لمحے کے لیے تو فوراً ہی اپنا راہ تبدیل کر کے واپس چلے جانے کے لئے کہا۔

لیکن.....

اپنی طبیعت پر جبر کر کے وہ رک گئی۔

اسے یہاں خاصا وقت گزارنا تھا کچھ سوچتے ہوئے وہ دوبارہ ملحقہ آشرم میں آئی اور اپنا بیگ یہاں ایک لاکر میں رکھ کر اسے تالا لگا کر واپس مندر میں لوٹ آئی۔ یہاں آشرم میں یاتریوں کے لیے بہت سے کمرے اور لاکر موجود تھے۔ جہاں دوسرے شہروں سے آنے والے مالی کا لاکہ کے بھگت اپنا سامان محفوظ رکھا کرتے تھے۔

مندر میں مل دھرنے کو کچھ نہیں تھی کسی نہ کسی طرح وہ ایک کونے میں بیٹھنے میں کامیاب ہو گئی۔ جہاں وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بے دم سی ہو کر بیٹھ رہی۔

بازو پر بندھی گھڑی دیکھ کر اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس اذیت ناک ماحول میں اسے ابھی تین گھنٹے گزارنے تھے۔

اس کے ساتھ موجود تین چار موٹی موٹی عورتیں جو کسی دوسرے شہر سے آئی تھیں باری باری اونگھنے لگیں۔ اونگھتے ہوئے جب ان میں سے کوئی خزانے لپٹے لپٹے تو اس کے ساتھ والی عورت اسے بازو سے جھنجھوڑ کر جگا دیتی۔

شاید صورتحال کی نزاکت کا احساس ان سب کو تھا۔

لیکن.....

نیندان کے بس میں نہیں تھی۔

کاشمی کے لیے یہ بڑا دلچسپ تماشا تھا۔ وہ پوچھا سے زیادہ ان میں الجھی رہی اور ان کی بے بسی سے محظوظ ہوتی رہی۔

جب بھی کوئی عورت اچانک ہڑا کر آنکھیں کھولتی تو اس کی طرف دیکھ کر ضرور کھانے انداز میں مسکرا دیتی تھی۔ شاید وہ کاشمی سے اپنی چوری کو چھپائے رکھنے کی درخواست کرتی تھی۔ کاشمی کی آنکھوں میں دردور تک نیند کا کا نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اسے حیرت اس بات پر تھی کہ وہ خوفزدہ کیوں نہیں ہے؟

حیرت انگیز طور پر وہ خود کو مطمئن اور محفوظ محسوس کر رہی تھی۔ شاید ظاہری محبت کی سرشاری نے اسے خوف سے بے نیاز کر دیا تھا۔

ایک لمحے کے لیے ابھی تک اس کے دل میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ غداری کی مرکب ہوئی ہے۔ مفرور ہے اور جیسے ہی اس کی فراری کا طم ہو۔ درجنوں ہرکارے شکاری کتوں کی طرح اس کے تعاقب میں نکلیں گے اور ایک مرتبہ اگر وہ ان کے قابو میں آگئی تو کاشمی کے جسم سے وہ ایک ایک پونی اتار لیں گے۔

ایک بات تو طے شدہ تھی۔

اس نے "پھلکا تا" سے رواں لگی بری یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آخری لمحے تک زندگی کی جنگ ضرور لڑے گی۔ لیکن زندہ کبھی "را" کے ہاتھ نہیں لگے گی۔

ابھی وہ تھی کہ جب سے اب تک اس نے اپنا سرورس ہمتول خود سے الگ نہیں کیا تھا۔ اب بھی اس نے گمروے رنگ کے اس چولے کے نیچے اپنے کیڑوں پر پہنی جینک میں اپنا ہتھول اس طرح چھپا کر رکھا تھا کہ چند سیکنڈ کی مہلت ملنے پر اسے استعمال میں لاسکتی تھی۔

یہاں ہونے والی "بھاشن" اور "کیرتن" میں اسے ذرا دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔

اپنی مرضی کے خلاف یہاں رہنے سے اسے اپنا بدن ٹوٹا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے بخار نے آ لیا ہو۔

یہ تصور ہی اسے خوفزدہ کرنے کے لیے کافی تھا کہ اسے بخار ہونے لگا ہے۔ اپنی جگہ

سے وہ ہمت کر کے اٹھی اور مندر سے باہر نکل آئی۔

○ ○ ○

آشرم کی دیوار کے ساتھ لگے شیو سینا کے میڈیکل کمپ سے اس نے دو گولیاں اپنے سر درمیں افاتے کے لیے لیں اور اس کے دو کمرہ کی ہوسناک نظروں سے خود کو بچاتی دوسری طرف چائے کے شال پر جلی گئی جہاں پہلے ہی بہت سی عورتیں اور مرد چائے پی رہے تھے۔

ایک گلاس میں چائے لینے کے بعد اس نے گولیاں زہر مار کیں اور دل ہی دل میں قدر سے مطمئن ہو کر ایک کونے میں بیٹھ رہی۔

یہاں ان یا تریوں نے جنہیں آشرم یا کسی ہوٹل میں رہنے کے لیے جگہ نہیں مل سکی تھی جا بجا آگ کے الاؤ روشن کر رکھے تھے۔

ایک ایسے ہی الاؤ کے پاس جس کے گرد چند رہائشی عورتیں بیٹے اور مرد بیٹھے تھے وہ بھی جا کر بیٹھ گئی۔

آگ کے گرد بیٹھنے سے اسے کچھ سکون ملا تھا اور اس پر نیند غلبہ کرنے لگی تھی۔ ایک دو مرتبہ تو اسے اچھی خاصی اونگھ بھی آئی۔ لیکن اس نے خود پر کنٹرول رکھا تھا۔

”نبی لیٹ جاؤ تم بہت جلدی ہوئی دکھائی دیتی ہو۔“
الاؤ کے گرد بیٹھے نبی لیٹ مبران میں سے ایک بزرگ نے کہا۔ جسے کاشمی کی حالت پر شاید ترس آ گیا تھا۔

”شما کیجئے۔ دراصل ہم لوگ سہارنپور سے جا گئے آ رہے ہیں۔ کل رات سے سفر میں ہیں۔ میرے بچے دیو (شوہر) نے مجھے زبردستی یہاں تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے بھیج دیا ہے۔ میں تو آنا نہیں چاہتی تھی لیکن.....“

اس نے بڑی گزستہ قسم کی چٹنی کی طرح گردن جھکا کر بات اور حوری چھوڑ دی۔

”نبی اسی لیے تو کہہ رہا ہوں تم لیٹ جاؤ۔ تھوڑا آرام کرلو۔ یہاں قدرے سردی کم ہے۔“

اس بزرگ نے کہا۔

”دھنوا دوسا جی..... اگر آپ کہتے ہیں تو۔“

اس نے دوبارہ اپنی بات نامکمل چھوڑ کر اب موسا جی کی چٹنی کی طرف دیکھا جو خود بھی اس کا ہمدردانہ نظروں سے جائزہ لے رہی تھی۔

”ہاں نبی..... کوئی بات نہیں یہاں سب اپنے ہیں۔ تمہارے ساتھ اور کوئی نہیں آیا۔ اس نے کاشمی کو قدرے مطمئن کرنے کے لئے کہا۔

”گھر میں ہم دونوں ہیں یا پھر ان کے چٹاشری (باپ) میری ساس بیاہیں۔ ان کی پراقتنا (دعا) کے لیے ہی یہاں آئے ہیں۔“

کاشمی نے بڑی سکھڑ ہو کر مظارہ کیا۔

”بھگوان تمہیں سکھ دے نبی۔ تم جیسی نیک بیٹیاں قسمت والوں کو ملی ہیں۔ جو اپنی ساس کی پراقتنا کے لئے آگئی ہو۔“

موسا جی نے اپنے پہلو میں بیٹھی ایک موٹی سی لڑکی کی طرف جو ان کی بہو تھی عجیب سی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

ان کی بہو نے ساس کے لہجے کی تخفیفی صورت حال کا اندازہ تو کر لیا تھا لیکن وہ بھی شاید سننے والی نہیں تھی۔

”ان کی ساس بیاہیں۔ شاید آپ نے سنا نہیں۔ آپ تو کاکا مالک کے آشیر وادے ابھی تک صحت مند ہی ہیں۔“

بہو نے دل کی ہنڈ اس نکال لی۔

”اچھا اچھا میرے منہ زلگنا۔ بھگوان کے لیے کہیں تو اپنی زبان بند کر لیا کر۔“

ساس کو غصہ آ گیا تھا۔

اس سے پہلے کہ ان میں باقاعدہ تو ٹکنا شروع ہو۔ کاشمی نے وہاں لیٹ جانے ہی میں خیریت سمجھی۔ کیونکہ اب موسا جی ان دونوں کو ڈانٹ رہے تھے۔

”اگر میری آنکھ لگ جائے تو یلہز مجھے پاؤں بجے سے پہلے ضرور چکا دینا۔ ورنہ میرے“

”بچی دیو پریشان ہوں گے۔“

اس نے اپنی آنکھیں پیٹ کی طرف سینے ہوئے وہاں تھوڑی سی خالی جگہ پر لیٹ جانا ہی مناسب سمجھا ورنہ مسلسل جاگتے سے وہ بیاہ رہی ہو سکتی تھی۔

کاشی کی آنکھ کب لگی؟

چار کب بنے؟

اس کو کچھ یاد نہیں تھا۔

وہ جب بڑا کر اُسی تو وہاں بننے والی آگ کب کی بجھ چکی تھی۔ شاید سردی کے احساس نے ہی اسے گہری نیند سے جگا دیا تھا۔

جس صف پر وہ لیٹی ہوئی تھی اس کے دوسرے کونے میں شاید بینگ کے نشے میں دھت کوئی ذمہ دار کا بھگت لینا کچھ بڑا بڑا رہا تھا۔

اس کے چاروں طرف یا تریوں کا جھوم بڑھنے لگا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی گھڑی ساڑھے چار بج رہی تھی۔

شاید اس فیملی کی ساس بہو کے جھڑے نے شدت اختیار کر لی تھی اور وہ کاشی کو سوتا چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے تھے۔

کاشی نے سب سے پہلے گھڑی اور اپنے بازو میں سونے کا کنگن محفوظ رہنے پر یقین مانا کا شکر ادا کیا۔ ابھی تک ان چیزوں کا محفوظ رہنا کسی بھڑے سے کم نہیں تھا۔ یہاں تو دو کنگن اتارنے کے لیے اس کا بازو کاٹنے سے بھی دریغ نہ کیا جاتا۔

وہ چونکہ جوتوں سے سوئی تھی اور جو تے بھی اس نے تسوں والے پہن رکھے تھے اس لیے ابھی تک وہ بھی اس کے پاؤں میں موجود تھے۔

کاشی دوسرے ہی لمحے اٹھ بیٹھی۔

اس نے سب سے پہلے اپنے حواس بحال کئے اور دوسرے ہی لمحے اٹھ کر گھڑی ہو گئی۔ اٹھتے ہوئے اسے یوں لگا جیسے وہ پکرا کر دوبارہ مرنے لگی ہو۔

لیکن.....

حیرت انگیز طور پر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ شاید اس کی جسمانی کسرت روزانہ کی تربیت کام آگئی تھی۔ یوں بھی وہ بڑے مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ کاشی پر جلد ہی انکشاف ہو گیا کہ اسے بخارا گیا ہے۔

پہلے تو اس نے دوبارہ شیوہ بناوٹ کے کپ پر جا کر دوالی لینے کا ارادہ کیا لیکن پھر جلد ہی

ارادہ بدل لیا۔

وہ کم از کم اب ان دردوں میں جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔

ایک مرتبہ پھر وہ ہمت کر کے اس چائے کے شال تک پہنچی۔ جہاں اب پہلے سے زیادہ بھیڑ لگی تھی۔

اس نے چائے کا گلاس دوبارہ لیا اور مندر کے شال کی سمت چلنا شروع کر دیا۔ ظاہر ہے اسے جس جگہ کی نشاندہی کی تھی وہ اس نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی لیکن ایک بات اس کے لیے ضرور باعث اطمینان تھی کہ اس راستہ پر زیادہ رش نہیں تھا شاید شال کی سمت جانے والا یہ واحد راستہ تھا جو کچھتوں اور کھنڈرات کی طرف چارہا تھا۔

پو پھٹ رہی تھی۔

اجالا اندھیرے پر غالب آ رہا تھا۔

کاشی اگر وال خود کو سنبھالتی بلا خرانی منزل کے نزدیک پہنچ گئی۔ اسے اندھیرے کی بھیگی سی چادر میں سے اس قدم مندر کے کھنڈرات دکھائی دینے لگے تھے جس کی نشاندہی ظاہر نے کی تھی۔ یہاں دور دور تک کسی ذی نفس کا نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اس نے دل ہی دل میں ظاہر کو خراج تحسین پیش کیا۔ شاید اسے ہندو ازم کی کمزوری کا بخوبی اندازہ تھا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ مندروں کے ان قدم کھنڈرات سے یہ لوگ بہت ڈرتے ہیں کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق وہاں بدرو میں بسوا کر لیتی ہیں۔ یا پھر یہ کھنڈرات بھوت پریت کے مسکن بن جاتے ہیں۔ اس لیے اس طرف رات کے اندھیرے میں تو کسی کے جانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

دن کے اجالے میں اس طرف کوئی ”جنگل پانی“ (خواجه ضروریہ سے) فراغت کے لیے بھی اس خوف سے نہیں جاتا تھا کہ مہاذا کسی بھوت پریت کے بیچے پر ان کا پاؤں آگیا یا کسی بدروح نے انہیں دیکھ لیا تو ناراض ہو کر کہیں ان کا ”سرداش“ ہی نہ کر ڈالے۔

ظاہر ہے جس طرح زمین پر کلیں ڈال کر اسے ان کھنڈرات کا نقشہ سمجھایا تھا بعینہ اسے سب کچھ دکھائی دیا۔

”کیا ظاہر کا یہاں آنا جانا لگتا ہے؟“

”کیا وہ ماضی میں بھی یہاں آیا تھا؟“

”اگر وہ یہاں آچکا ہے تو کس روپ میں؟ کیسے؟ کیسے ممکن ہے یہ سب کچھ؟“

اچانک ہی اس کے ذہن میں سوالات پیدا ہونے لگے۔

”کیا طاہر صرف ایک تخریب کار ہی ہے؟“

”کیا وہ صرف بھارتی اٹلی میس کا ایجنٹ ہی ہے؟“

نئے سوالات نے جنم لیا۔

”نہیں۔“

اس کے دل و دماغ نے ایک ہی جواب دیا۔

”تو پھر وہ کون ہے؟“

”یہاں کیا کرنے آیا ہے؟“

”کیا اس کا خیال صحیح تھا؟“

اسے یاد آ گیا۔ کبھی کبھی اچانک ہی اسے احساس ہوتا تھا کہ طاہر وہ نہیں ہے جو نظر

آنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس نے دو تین مرتبہ طاہر سے یہ بات کہی بھی تھی۔ پھر سوچا کرتی تھی کہ وہ اس سے

متعلق خونخوار کسی دہم کا شکار کیوں ہے۔

”کچھ بھی ہو.....؟“

اس نے اپنے آپ سے کہا۔

”وہ کچھ بھی ہو۔ اب میرا سب کچھ وہی ہے۔ میرا جینا مرنا اب اس کے ساتھ ہوگا۔“

قدرے مطمئن ہو کر اس نے اپنا بیگ جو وہ اس طرف آتے ہوئے آشرم کے لا کر میں

رکھ آئی تھی لا کر اسے ایک قدرے ہموار جگہ پر رکھا اور وہاں آتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ وہ جس جگہ

بیٹھی تھی وہ شاید اس شہر میں سب سے محفوظ جگہ تھی۔ اس کے سامنے کی ٹوٹی ہوئی دیوار سے اس

طرف آنے والے راستے پر درودور تک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ جب کس سامنے سے آنے

والے کو اس طرف کچھ دکھائی دینے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ کیونکہ وہاں دیواروں

سے نکلنے والے پتیل کے درختوں کی موٹی موٹی شاخوں سے نکلنے گئے چوں نے ساری عمارت کو

بالکل اس طرح چھپا دیا تھا جیسے فوجی اپنے سامان جنگ کو دشمن کی نظروں سے چھپانے کے لئے کیو

فلاج کر لیا کرتے ہیں۔

یہاں ٹیلے پر سب سے پہلے کا مٹی کو یہ احساس ہوا کہ اسے بخار نے آ لیا ہے اور وہ

قدرے بڑھ چکا ہے۔

یہ احساس بڑا پریشان کن تھا۔

بخار آنے کا مطلب اس کے لیے نئی مصیبت کھڑی ہوتا تھا۔

اسے ابھی تندرست رہنا تھا۔ اپنے حواس بحال رکھنے تھے۔ ابھی اسے ایک طویل

جنگ لڑنی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ طاہر کے فرار کا علم ہوتے ہی ایمر جنسی و فطیمہ ہو جائے گی اور جب

اگلے روز وہ بھی اپنی دیوٹی پر نہیں پہنچے گی تو اس کے متعلق بھی ”را“ کو چائی کا علم ہو جائے گا۔ جس

کے بعد چور سپاہی کا ایک طویل اور تھکا دینے والا کھیل شروع ہونے والا تھا۔

ان دونوں کو یہ اعصاب شکن جنگ ابھی لڑنی تھی۔

جنگ کے آغاز سے پہلے ہی وہ مکرور پڑ رہی تھی۔

اس کے نزدیک یہ کوئی نیک شگون نہیں تھا۔ اس طرح تو وہ طاہر کے لیے بھی مشکلات

پیدا کر سکتی تھی۔

لیکن میں.....

اس نے فوراً اس خیال کی نفی کر دی۔ اس نے اپنے آپ سے عزم کیا تھا کہ وہ جیسے بھی

ہو طاہر پر آج نہیں آنے دے گی۔

اسے اپنی ہی نہیں طاہر کی حفاظت بھی کرنی تھی۔

وہ طاہر کے پاؤں کی زنجیر نہیں بن سکتی تھی۔

وہ جو کوئی بھی تھا؟

اب اس کا اپنا تھا۔ طاہر نے اس کے لیے جان کی بازی لگائی تھی۔ پو سوال جیسے

دروغ سے اس کی عزت اور زندگی دونوں بچائی تھیں۔ اب وہ کبھی اس سے الگ ہونے کا تصور

نہیں کر سکتی تھی لیکن یہ بھی مگوارہ نہیں کر سکتی تھی کہ کوئی اس کی زندگی کے لیے خطرہ پیدا کرے۔ اس

کے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی تھی۔ اور وہ کسی بھی ایمر جنسی کی صورت میں اس ترکیب پر عمل پیرا

ہونے کا سوچ کر مطمئن ہو رہی تھی۔

صبح کے پانچ بج رہے تھے۔

کاشمی کو یہاں بیٹھے بمشکل پانچ سات منٹ ہی ہوئے تھے جب اسے کھنڈرات کی طرف آنے والا اس راستے پر ظاہر آتا دکھائی دیا۔

○ ○ ○

ظاہر کے خدو خال واضح نہیں تھے لیکن اس نے کاشمی کو کچھ "سیف سٹیل" بتا دیئے تھے۔ اس نے بتا دیا تھا کہ وہ کھنڈرات کی طرف آتے ہوئے ہاتھوں سے کچھ مخصوص اشارے کرے گا اور کسی طرح کی ورزش کرے گا۔

اس طرح ظاہر کی اور دیکھنے والے کو یہ تاثر ملا کہ وہ صبح کو یوگا کر رہا ہے اور رات کی تھکاوٹ اتارنے کے لیے ایسا کرنا ضروری بھی تھا۔

کاشمی اس پر نظریں گاڑ سنا پتی جگہ چوسک تھی مگر اسے یہ ثبوت مل چکا تھا کہ آنے والا ظاہر ہی ہے۔

لیکن.....

اس نے پھر بھی اپنی تربیت کو نہیں بھلایا تھا اور بطور احتیاط اپنا پستول بالکل فائرنگ پوزیشن میں رکھا ہوا تھا۔

کاشمی کا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ وہ خود اس کے دھڑکنے کی آواز سن سکتی تھی۔

اب ظاہر کے خدو خال بھی واضح ہونے لگے تھے۔ اس نے اپنے طے کردہ "سیف سٹیل" کے مطابق لیجن گانا شروع کر دیا تھا۔

"اوم ہے سچیت ہرے۔"

وہ چلتا ہوا اب ان ٹوٹی پھوٹی بیڑیوں کے نزدیک پہنچ گیا تھا جہاں سے چڑھ کر کاشمی اگر وال اوپر گئی تھی۔

اپنا بیک اس نے مقامی یا تریوں کی طرح کمرے کے پیچھے لٹکا رکھا تھا اور اب وہ بالکل کاشمی کے نزدیک آ گیا تھا۔

کاشمی اسے اپنے نزدیک پا کر اس اوٹ سے نکل کر اچانک سامنے آگئی تھی جہاں وہ

اب تک بیٹھی تھی۔

"کاشمی۔"

بے ساختہ ظاہر کے منہ سے اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی نکلا۔

"ظاہر۔"

کاشمی بے قرار ہو کر آگے بڑھی اور یوں اس سے لپٹ گئی۔

اچانک ہی اس کا دل بھرا یا تھا اور نجانے کب سے اس کی آنکھوں میں تھمے آنسو تمام بندشیں تو ذکر بہرہ نکلے تھے۔

اس کا بدن بید کی طرح لرز رہا تھا۔

"نہیں کاشمی۔ اب تم کبھی نہیں روؤ گی۔ تمہارا وہ تاجھے کمزور کر دے گا۔ کاشمی۔ ٹائل ہو جاؤ۔ سب کچھ بھول جاؤ۔ اب سلا متی ہے۔"

اس نے آہستہ سے کاشمی کو خود سے الگ کرتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ کاشمی کا ہاتھ بہت گرم ہے۔

"اوہ۔ تمہیں تو بخار آ رہا ہے۔"

اس نے کاشمی کے ساتھ ہی اس کی بچائی چادر پر بیٹھے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ بس ذرا جسم گرم ہے۔"

کاشمی جو خود کو سنیا لپٹتی تھی بولی۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ بے فکر ہو۔ میں تمہیں بنا نہیں ہونے دوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا بیک کھولا اور اس میں سے دودھ کا ایک چمک نکال کر اس کے

سامنے رکھا اور تین چار مختلف قسم کی گولیاں اور کپسول اپنی پھٹی پر ڈال کر اس کی طرف بڑھا

دیئے۔

"انہیں دودھ کے ساتھ نگل جاؤ۔"

اس نے کاشمی کی طرف مسکراتے ہوئے اس طرح دیکھا تو وہ بھی بے اختیار مسکرا دی۔

آنسوؤں سے بھیگی اس مسکراہٹ نے ایک لمحے کے لئے ظاہر کو بھی بہوت کر کے رکھ

دیا تھا۔

کامنی نے نہ چاہتے ہوئے بھی محض اس کے حکم کی قیبل میں گولیاں دودھ کے ساتھ نگل لیں اور باقی دودھ واپس رکھ دیا۔

”ارے بھئی اسے بھی پی لو۔“

طاہر نے کہا۔

”میں نہیں پی سکتی۔ میں دودھ کبھی نہیں پی سکتی۔“ یہ بھی بڑی مشکل ہے۔

اس نے کہتا جا ہا۔

”اچھا دو گھونٹ میرے لیے پی لو۔“

طاہر نے اس کی بات کاٹ کر ایسے لہجے میں کہا کہ کامنی نے بے اختیار ڈیبا اٹھا کر منہ سے لگایا۔

”بس اب اور نہ کہنا۔“

کامنی نے ڈیبا پس زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔

”نیک ہے تمہارا حصہ اتنا ہی تھا۔“

اس نے ڈبے کو ہلاتے ہوئے کہا۔

اور.....

اس کا اگلا قدم کامنی کو بہوت کرنے کے لیے کافی تھا جب طاہر نے باقی کا دودھ اپنے حلق میں داخل دیا۔

حیرت سے کامنی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

اس نے کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا کہ دنیا میں ایسے انسان بھی پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے کے برتن میں کھانا کھالیں یہاں تو معاملہ ہی اور تھا۔

”طاہر..... تم.....“

”کیا ہوا..... کوئی پریشانی والی بات ہے کیا؟“

”یہ چھوٹا دودھ.....“

”اوہ تو یہ بات ہے..... دیکھو کامنی اول تو ہمارے نزدیک سب انسان چونکہ برابر ہیں

اس لیے کسی کا جھوٹا کھانا پی لینے سے کوئی لچھ نہیں ہو جاتا۔ یہ سب فرسودہ باتیں ہیں پھر جس سے

محبت کی جائے اس کی ہر شے میں شیر کیا جاتا ہے۔

اس نے کامنی کی بات دوبارہ کاتے ہوئے کہا۔

اور.....

اپنے بیک میں سے کچھ بھل نکال لے گا۔

”یہ سب میں نے خاص طور سے تمہارے لیے خریدے تھے۔ میں جانتا ہوں تم شوق

سے کھاتی ہو۔ مجھے یہ بھی علم ہے کامنی کہ اس وقت تمہارا پی بالکل کچھ کھانے کے لیے نہیں چاہ رہا

ہو گا۔ لیکن میری درخواست ہے کہ تم کچھ نہ کچھ ضرور زہر مار کر لو۔ تمہارا تندرست رہنا بے حد

ضروری ہے۔ یہ میں کسی خوف کے تحت نہیں کہہ رہا۔ خدا نہ کرے اگر تم بیمار بھی ہو گئیں تو اس کا

مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں تمہیں اسکی چھوڑ دوں گا۔ اب جیتے جی کم از کم میں تمہارا ساتھ نہیں

چھوڑوں گا۔“

اس نے ایک ہاتھ سے سبب باقاعدہ چھیل کر اس کی طرف بڑھایا۔

کامنی نے کسی محرزہ معمول کی طرح آدھا سبب لے کر آدھا سے دے دیا۔

”میرے خیال سے تمہارے لیے بھی صحت کا خیال رکھنا اتنا ہی ضروری ہے۔“

اس نے کہا۔

”اوہ کیوں نہیں۔“

طاہر نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کے سامنے اپنا منہ کھول دیا۔

○○○

جنح لائبریری و جلدستان
0333
2116358
ارڈر بازار اوہ وصاب کھول

دونوں تین چار منٹ خاموشی سے کن اکبیلوں سے ایک دوسرے کا جائزہ لیتے رہے۔
ظاہر محسوس کر رہا تھا کہ کاٹنی کسی الجھن کا شکار ہے۔ لیکن وہ اس سے براہ راست کوئی سوال بھی نہیں
کرنا چاہتی تھی۔

”میرے خیال سے ہمیں پہلے کچھ باتیں کر لینی چاہئیں۔ کیونکہ وقت بہت کم ہے۔ جتنی
جلدی ہم یہاں سے نکل جائیں وہی ہمارے لیے بہتر ہوگا۔“
ظاہر نے لمبی سانس لے کر کہا۔

”کاٹنی۔ میں جانتا ہوں تم اس وقت کسی الجھن کا شکار ہو۔ چونکہ میرا تعلق بھی
تمہارے ہی پیشے سے ہے۔ جہاں بات بتانی نہیں چھپائی جاتی ہے لیکن کاٹنی میں پہلے مسلمان
اور انسان ہوں اس کے بعد کچھ اور..... میں تمہاری قربانی کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ تم کوئی
بھی ہو۔ تمہارا ماضی کچھ بھی ہو۔ تم میرے لیے اتنی ہی محترم ہو جتنی میرے دیس کی کوئی بھی حفت
ماب لڑکی۔ ہاں کاٹنی میں تمہاری الجھن ختم کر دوں۔ میرا تعلق تمہاری مخالف تنظیم سے ہے۔ اس
یکپ تک پہنچنے کے لیے میں نے تخریب کار کا روپ دھارنا تھا کیونکہ مجھے ہر صورت میں اس یکپ کو
تباہ کرنا تھا۔ تم جانتی ہو کاٹنی بنواری یکپ سے میرے ملک میں کس نوعیت کی تخریب کاری ہو رہی
تھی۔ کاٹنی تم نے ایک روز مجھے کہا تھا کہ بچوں کے اس قتل عام میں آخر میرے جیسے شخص کیسے حصہ
دار بن سکتا ہے۔ میں تمہارے قیافے کی داد دیتا ہوں۔ میں جانتا ہوں تمہیں اس سے پہلے میرے
متعلق صرف شک تھا لیکن کل سے تم سب کچھ جاننے لگی ہو۔ میں تمہاری اس جانکاری پر اپنے

اترار کی مہر ثبت کر رہا ہوں۔ کاٹنی مجھے بتاتا ہے کہ اب بنواری نام کا کوئی یکپ باقی نہیں رہا۔ کل
رات میں نے اپنے ساتھی کی مدد سے یکپ کو تباہ کر دیا ہے گو کہ اس سے اس دیس کو کوئی فرق نہیں
پڑنے والا نہیں ہے۔ یہاں ایسے درجنوں تخریب کاری کی تربیت دینے والے یکپ قائم ہیں۔ لیکن
اب دشمن ہمارے بچوں کو قتل کرنے سے پہلے ہمارے بے گناہ شہریوں کے خون سے ہونی کھیلنے
سے پہلے ہمارے بے بسائے شہر دوں کو آتش و آہن کی نذر کرنے سے پہلے ضرور یہ سوچے گا کہ ہم
اس سے ساز میں آٹھ گنا کم سہی لیکن اس کے دیگر مسایہ ممالک کی طرح ابھی اسے کمزور نہیں
ہوئے کہ اس کے ظلم و ستم اور زیادتیوں کے سامنے بھیڑیوں کی طرح اپنے سر غم کرتے چلے
جائیں۔ کاٹنی! تم نے ایک ہندو گھرانے میں جنم ضرور لیا ہے۔ لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ
قدرت تمہیں آج ہی کے دن کے لیے ایک لمبے عرصے سے تیار کرتی آ رہی تھی۔ کاٹنی تم بتاؤ خدا
کے لیے تم بتاؤ کہ ہمارا قصور کیا ہے؟ کیوں آخر یہ دشمن ہمیں تباہ کرنے پر علا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں
ہمارے دو کھڑے کر کے کیا اس کے حکمرانوں کا کچھ شخڑا نہیں ہوا۔ کاٹنی! میں اس ملک میں تین
سال سے گھوم رہا ہوں۔ مجھے بھارت کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سفر کرنے اور یہاں
بھانت بھانت کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا ہے۔ میرا دل یہاں کی خستہ حالت زار پر خون کے
آنسو روتا ہے جس ملک کی ساتھ فیصد آبادی بنیادی انسانی سہولتوں سے محروم ہو۔ وہاں کے حکمران
جو اپنے ملک کی صرف چھ فیصد آبادی کے گھرانے ہیں۔ دن رات قتل و غارت گری کے جنون
میں ہمارا رہتے ہیں۔ میرا ملک کی تیار کی پکڑیوں کو روپے لگانے والے اس دیس کو آخر کس سے
خطرہ ہے۔ بھارت ساز اور فوج کے اعتبار سے سب سے بڑا ملک ہے لیکن اس کے حکمران کس
جنون میں اندھے ہو کر اپنے ہمسایہ چھوٹے چھوٹے ممالک کو بڑپ کرنے پر تلے ہیں۔ ہمیں
لڑنے کا شوق نہیں۔ ہم جس دین کے پیروکار ہیں وہ تو سلامتی کا دین ہے۔ وہاں انسانی جان اپنی
جان سے زیادہ محترم سمجھی جاتی ہے۔ وہاں ذات پات، پیچیدہ بھاؤ کچھ نہیں سب برابر کے انسان
ہیں۔ ہمارا جی نہیں چاہتا کہ ہم تنہا باقی رہیں۔ ہم بھارت کے تخریب کار کیپیوں کو تباہ نہیں
کرنا چاہتے لیکن ہمیں مجبور کیا جا رہا ہے کہ ہم ایسا کریں۔ آخر اس ملک کے حکمرانوں کو اس بات کی
سمجھ کیوں نہیں آتی کہ ہم ان کے دوسرے غریب اور چھوٹے ہمسایہ دیسوں کی طرح اس کے غلام
بن کر رہنے سے مر جانا بہتر سمجھتے ہیں۔ اگر ہمارے ایسے ہی ارادے ہوتے تو لاکھوں جانوں اور

عصمتوں کی قربانیاں دے کر یہی ایک خطرہ زین حاصل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم ہندوستان میں صدیوں سے اکٹھے رہتے آ رہے تھے۔ کاشی! ہمیں جان بوجھ کر آگ میں دھکیلا جا رہا ہے۔ اس ملک کے حکمران ہم سے زیادہ ظلم اور زیادتی اپنے لوگوں کے ساتھ کر رہے ہیں۔ انہیں پینے کے لیے پانی نہیں دیتے۔ میزائل دے رہے ہیں۔ کیا ان میزائلوں سے غریب بھٹا کے پیٹ کی آگ بجھ جائے گی؟..... ہاں کاشی! میں بواؤری کھپ تیار کرنے آیا تھا۔ میں اپنا کیس تمہارے خیمہ کی مدد سے پیش کر رہا ہوں اور تم پر چھوڑتا ہوں۔ انصاف سے تم جو بھی فیصلہ کرو مجھے قبول ہے۔ کاشی تمہارے پاس اپنا سروس پستول موجود ہے۔ جس کسی کو تم مانتی ہو تمہیں اس کی قسم اور واسطہ دے کر کہہ رہا ہوں کہ اگر تمہارے نزدیک میں گناہگار ہوں تو ابھی مجھے گولی مار کر سرخرو ہو جاؤ۔ اس طرح نہ صرف تم ان لوگوں کو اپنی وفاداری کا یقین دلا سکتی بلکہ اور بھی بہت کچھ تمہیں مل جائے گا۔ اور جہاں تک میرا تعلق ہے میں خدا سے واحد کی قسم کرتا ہوں کہ میں تمہارے ہر فیصلے کو قبول کروں گا اور اس کے خلاف احتجاج نہیں کروں گا۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ تم ہندوؤں کی سے زیادہ انسان ہو اور انسانیت کے نامے تمہارے دل میں آدمیت کا احترام بھی ہو گا۔

Now Come on کاشی! میں تیار ہوں۔“

○ ○ ○

یہ کہہ کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کاشی کے سامنے دوڑاؤں ہو کر بیٹھ گیا۔ کاشی کو یوں لگا جیسے چانک کسی نے چھوڑ کر اسے گہری نیند سے جگا دیا ہو۔ وہ ابھی تک خود کو عالم ارواح میں محسوس کر رہی تھی۔ طاہر کا کہا ہوا ایک ایک لفظ نشتر کی طرح اس کے دل میں بہت گہرا اثر تو چلا جا رہا تھا۔

اس کے لفظوں میں موجود سچائی نے کاشی کو دم بخود کر دیا تھا۔

کاشی کا دل اس کے ایک ایک لفظ پر آ منامد تھا کہہ رہا تھا۔

جگ آ کر کسی طاقت کا نام تھا تو آج طاقت نے کاشی کو مسخر کر لیا تھا۔ وہ مغلوب ہو چکی تھی۔

جیسے جیسے طاہر بول رہا تھا۔ کاشی کے سامنے اس کی سابقہ زندگی کی فلم چل رہی تھی۔ گزشتہ دو سال سے وہ مختلف حزب کار کی ترقیاتی مراکز میں خدمات انجام دیتی آ رہی تھی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے سینکڑوں دہشت گرد بھارتی اٹلی جنس انجینیئروں نے تیار کرنے کے بعد آتش و آہن سے لیس کر کے پاکستانی سرحدوں میں دھکیلے تھے۔ ان میں کچھ پکڑے گئے کچھ مارے گئے اور کچھ کامیابی سے اپنا کام کر کے واپس آئے تھے۔

اس دفعہ نے اور زیادہ تباہ کن ہتھیاروں کے ساتھ ان تربیت یافتہ انسان نما درندوں کو میدان میں اتار جا رہا تھا۔

پاکستانی سپہ سالاروں فرینڈز، بیسوں اور بازاروں میں دھماکے کی اطلاع ملنے پر متعلقہ کیمپ میں جشن منایا جاتا تھا۔

شراب و کھاب کی خفیلں سجائی جاتی تھیں۔

اور.....

اسے کیا بتایا تھا ان لوگوں نے۔ اس نے کیا اسی لئے سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی کہ ایسے علم سے وہ بے گناہ حقوق کی تباہی کا سامان کرتی رہے۔ اسے اپنے ہاشی سے گھن آ رہی تھی۔

طاہر سچا تھا۔

وہ پائلٹ کپتان تھا۔

یہ لوگ اسی کے مستحق تھے۔ جو دوسروں کو تباہ کرتے ہیں۔ جو دوسروں کی تباہی کا سامان کرتے ہیں انہیں زندہ رہنے کا حق نہیں ملنا چاہیے۔

اسی طرح دنیا میں میزان عدل قائم ہو سکتی ہے۔

انسان اور جانور میں کچھ فرق تو ہونا چاہیے۔ کیا ضروری ہے کہ ہر بڑی مچھلی کی طرح ہو بڑا ملک چھوٹی مچھلی کو ہڑپ کر جائے۔

زندگی پر سب کا حق یکساں ہے۔

سب کو جینے کا حق ملنا چاہیے۔

اپنی مرضی سے اپنے اصولوں کے ساتھ جینے کا حق!!

آج اگر اسے طاہر نے منصف کی کرسی پر بیٹھایا دیا تھا تو اس کا انعام پستول کی گولی

نہیں کچھ اور تھا۔

اسے یاد آگیا اس کی موی کاٹنی کو مسلمان سہیلیوں کے گھروں میں زیادہ نہیں جانتے دیتی تھی۔

ان کے ہاں کسی مذہبی تقریب میں تو اسے جانے سے زبردستی روکا جاتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ جب کسی قابل ہوئی تو اس نے ان ساری باندیوں کو توڑ ڈالا۔

”موی آخر تم مجھے وہاں کیوں نہیں جانے دیتی۔“

اس نے ایک روز رات ہی موی سے پوچھا تھا۔

”ہرے رام..... ہرے رام..... ارے بیٹی تو ابھی بچی ہے۔ تو ان مسئلوں کو نہیں جانتی یہ جادوگر ہوتے ہیں جادوگر۔ یہ تمہیں مار ڈالیں گے۔ تم پر ایسا کھڑے پھونک دیں گے کہ پھر تم ہمارے لائق بھی نہیں رہ جاؤ گی۔“ اس کی موی نے کہا تھا۔

کاٹنی پر کسی نے کوئی ستر تو نہیں پھونکا۔ البتہ سچ کا جادو سر چڑھ کر ضرور بولا اور اس کی موی کی کئی بات سچ ثابت ہو گئی اب اسے سمجھ آ گئی کہ یہ جادو تو نہ وہ نہیں جو ان کے ”تاسو تک“ (جادو کرنے والے) کیا کرتے تھے۔ یہ سچ کا جادو تھا۔

جب اسے علم ہو گیا کہ سچ کیا ہے اس نے سر تسلیم خم کر دیا۔ اسے آج اس بات کا احساس ہوا کہ جس کو اس کی موی جادو کا نام دیتی رہی دراصل وہ دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ جب یہ سچائی کسی پر آشکار ہو جائے تو دنیا کے تمام رشتے اس کے سامنے سچ دکھائی دیتے ہیں۔ پھر سب سے بڑا رشتہ اور سب سے معتبر حوالہ یہی سچائی بن جایا کرتا ہے۔

اس نے بے اختیار اپنے دونوں ہاتھ طاہر کے کندھوں پر رکھ دیئے۔

○ ○ ○

طاہر نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں ہر سوطا نیت کا ایک گہرا سمندر دکھائی دے رہا تھا۔ یہ سمندر اب اس کی آنکھوں میں اتر آیا تھا اور تاحسوس انداز میں اس کی آنکھوں سے نچکنے والی موتیوں کی لڑیاں اس کے خوبصورت گالوں پر بہہ کر ٹوٹ رہی تھیں۔

”تم سچے ہو طاہر۔“

بیشکل اس کے حلق سے بھرائی ہوئی آواز برآ رہی ہوئی۔

اور.....

اس نے اپنا سر طاہر کے سینے پر نکال دیا۔

آنسو اس کی آنکھوں سے جھروں کی طرح پھوٹ رہے تھے۔ طاہر نے اسے فی الوقت دلاسہ دینا مناسب نہ جانتا وہ چاہتا تھا کہ کاٹنی کے اندر کی ساری سیاهی ان آنسوؤں میں بہہ جائے اور اس کے دل پر پڑا بھاری پتھر مٹ جائے اور وہ پرسکون ہو جائے۔

اور.....

ایسا ہی ہوا۔

کاٹنی نے تھوڑی دیر بعد خود کو نل کر لیا۔

اس مرتبہ جب طاہر نے اس کے آنسوؤں سے دھلے چہرے پر نظر ڈالی تو کاٹنی اسے پہلے سے بالکل مختلف دکھائی دیتی۔

بالکل معصوم اور شبنم سے دھلی ہوئی آنکھوں والی کاٹنی اگر وال کے چہرے پر سکون ہی سکون دکھائی پڑتا تھا۔

”کاٹنی۔ تمہارا شکر ہے۔ میرا دل کہتا تھا تمہارا فیصلہ یہی ہو گا لیکن تمہارا فیصلہ اس سے مختلف بھی ہوتا تو میں ضرور تسلیم کرتا۔ اب میری بات بہت دھیان سے سننا کاٹنی کیونکہ تمہاری اگلی ساری زندگی کا راز و مدار اس جواب اور فیصلے پر ہے جو تم کرنے جا رہی ہو۔“

کاٹنی..... تمہارے لیے تمام دروازے کھلے ہیں۔ اگر تم واپس لوٹنا چاہو تو میں یا میرا کوئی بھی جذبہ تمہارے پاؤں کی نذر نہیں بنے گا۔ ہاں تمہارے لیے ہر ممکن آسانیاں پیدا کی جائیں گی۔ اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ یہ سانچ اور دیں تمہارے لیے غیر محفوظ ہے تو تم جہاں چاہو دنیا کے جس ملک اور کونے میں چاہو بس وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں بشرط زندگی وہاں تک بغیر کسی رکاوٹ کے پہنچا دوں گا۔ اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہارے قابل ہوں تو میں دل و جان سے تمہیں قبول کرتا ہوں۔

میرا ملک میرا سانچ تمہارے لیے دیہہ و دل واکرے گا۔ وہاں ایک لمسے کے لیے بھی تمہائی محسوس نہیں ہوگی۔ تم پر کوئی دباؤ نہیں کاٹنی۔ کوئی دباؤ نہیں۔ تم جب چاہو آسانی سے کوئی بھی فیصلہ کر لینا۔ فی الوقت ہمیں یہاں سے فوراً اٹھنا ہوگا۔ کیونکہ یہاں اب ہم غیر محفوظ ہیں۔ تمہیں زیادہ بہتر انداز ہوگا۔“

کاٹنی نے اس کی بات بڑی توجہ سے سنی تھی۔

وہ تو بہت پہلے فیصلہ پر پہنچ چکی تھی۔

اب تو اسے اپنے دل و جان سے صرف اس فیصلے پر ہر تصدیق ہی مثبت کرتی تھی۔

اور.....

اس نے ایک لمحے جھجک کے بغیر اپنے دل و دماغ میں نئے کردہ فیصلے پر ہر تصدیق مثبت کر دی۔

”ظاہر اب جینا مرنا تمہارے ساتھ ہوگا۔ اسے میرا جذباتی فیصلہ نہ سمجھنا۔ میں نے یہ فیصلہ تو بہت پہلے ہی کر لیا تھا۔ آج میں صرف اس کا دل و جان سے اقرار کر رہی ہوں۔“

اس نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔

ظاہر نے ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں ایک عجیب سی چمک اتر آئی تھی۔ وہ زیادہ دیر تک اس کے چہرے پر نظر نہ نہکا۔

اس نے کاشی کو اب تک ”را“ کی اسٹرکچر کے روپ میں دیکھا تھا۔ کاشی کا یہ بدل ہوا روپ اس کے لیے چونکا دینے والا تھا۔

بے اختیار اس کی آنکھیں اس عقیم لڑکی کے احترام میں جھلک گئیں۔ جسے قدرت نے ایک بڑے انعام کے لیے منتخب کر لیا تھا۔

”کاشی ابھی تمہیں سوچنے مجھے کے اور مواقع بھی ملیں گے۔ میری صرف ایک ہی درخواست ہے کہ تم جو بھی فیصلہ کرو۔ مکمل آزادی اور اختیار کے ساتھ کرنا۔ بغیر کسی جھجک کے بغیر کسی دباؤ کے۔“

کاشی نے اس بات کا جواب صرف نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے پر اکتفا کرتے ہوئے دیا۔ شاید اس کی آنکھیں ظاہر سے پوچھ رہی تھیں کہ اسے ان میں کہیں جھوٹ دکھائی دے رہا ہے؟

”میرے خیال سے اب یہاں سے نکلنے کی فکر کریں۔ زیادہ وقت ضائع کرنا مناسب نہیں ہوگا۔“

کاشی نے کہا۔

”تمہاری موٹر سائیکل محفوظ ہے۔ میں نے نمبر پلیٹ بدل دی تھی۔“

ظاہر نے اپنی رائے پیش کی۔

”اس کا کبھی تصور بھی نہ کرنا۔ مسوری اور ذریہ دونوں میں ہمارا ”کاونٹر سسٹم“ بہت مضبوط ہے۔ یہاں سی۔ آئی (کاونٹر اٹیلی جنس کا اپنا راج) کرل موٹنگیا ہے۔ آج تک اس کی کریڈٹ پر کوئی نا کامی نہیں لکھی گئی کیونکہ یہاں سے بھاگنے والے قلم پہلے خزیب کا نہیں ہوا۔ ابھی تین ماہ پہلے ہی بنگلہ دیش کا ایک نوجوان کسی بات پر غیرت کھا کر فیڈ ایریا میں آدمی رات کو ایک مشق کے دوران کھسک گیا تھا۔ جسے موٹنگیا نے بیچ ہونے سے پہلے مسوری سے گرفتار کر لیا تھا۔“

کاشی نے اسے موٹر سائیکل کے استعمال سے منع کیا۔

”کون ہے یہ کرل موٹنگیا۔ میں نے نہیں دیکھا کیا؟“

ظاہر نے حیرانگی سے دریافت کیا۔ کیونکہ کپ کے قریب اتمام افسران کو اس نے دیکھا ہوا تھا۔

”تم نے اسے دیکھا ہے ظاہر۔ تم نے اس کے ساتھ دہلی سے یہاں تک کا سفر کیا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ پکڑوٹی کے روپ میں سڑک کے آیا تھا۔ معلوم نہیں اس نے تمہیں اپنا ریک کیپٹن بتایا ہو یا میجر۔ بہر حال وہی کرل موٹنگیا ہے۔“

کاشی کے انکشاف نے اسے حیران کر دیا۔

”اوہو! گاڈ تو یہ وہ ذات شریف ہیں۔“

اس نے حیرانگی سے کہا۔

”ہاں۔ اور تمہاری اطلاع کے لیے یہ بھی بتا دوں کرل موٹنگیا بھی ”میلینر“ ہے۔ اس نے بھی ”کے جی بی“ کے کمانڈوز کے ساتھ روس میں دو سال گزارے تھے۔ یہ شخص یہاں بے پناہ اختیارات کے ساتھ کام کر رہا ہے اور ہمارے وہم و گمان سے بڑھ کر چالاک ہے۔ جی دیکھ لو کہ اس نے تمہارے ساتھ دہلی سے یہاں تک کا سفر صرف تمہیں چپک کرنے کے لیے کیا تھا۔ ایسے ”سرپرائز“ وہ اکثر دیا کرتا ہے۔ وہ کسی پر اعتماد نہیں کرتا۔ اپنے آپ پر بھی نہیں اور یہی اس کی کامیابی کا راز ہے۔“

کاشی نے اسے خبردار کیا۔

”تمہارے خیال سے کیا ”ممکنہ اقدامات ہیں۔“

طاہر نے اٹلی جی کی زبان میں اس سے دریافت کیا۔
 کامنی نے اپنے ذہن پر زور دے کر اپنے علم کی حد تک اسے تمام ممکنہ اقدامات سے
 آگاہ کر دیا۔

”ہوں گا۔“

اس کی بات کے خاتمے پر ایک لمبی ہوں طاہر کے منہ سے برآمد ہوئی۔
 اب تک اس مندر میں درجنوں ایجنٹ بچے بچے ہوں گے۔ ہماری خوش قسمتی ہے یا پھر
 تمہاری ہوشیاری کہ تم نے ایسے موقع کا انتخاب کیا جب یہاں ہزاروں باتریوں کی بھیڑ جمع ہو چکی
 ہے۔ اب ہمیں اس بھیڑ میں راستہ بنانا ہے طاہر!
 کامنی نے اپنا ہاتھ بڑھا کر کیا۔
 ”ٹھیک ہے۔“

یہ کہہ کر طاہر اس کے سامنے اکڑوں بیٹھ گیا اور زمین پر ان کی مدد سے مختلف لکیریں لگا
 کر اسے سمجھنے لگا کہ کیا کیا راہ فرار ممکن ہے؟
 اس نے کامنی کے ساتھ تین آپشن Option رکھے تھے۔ لیکن کامنی نے تینوں
 نامنکور کر دیے۔

”پھر آخری راستہ یہی باقی بچتا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے کامنی کو بتانا شروع کیا کہ فی الوقت وہ ڈیرو دون کی طرف جانے کی
 بجائے دوسری سمت اختیار کریں گے۔

”تمہارا مطلب ہے ”پوننا صاحب“

کامنی نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”ٹھیک ہے۔“

کامنی نے صاف کیا۔

اب انہیں یہاں قریباً ۳۰ کلومیٹر پیدل سفر کرنا تھا۔ یہی ایک محفوظ راستہ تھا ورنہ تو جس
 طرح کے ”جوابی اقدامات“ سے متعلق کامنی اگر وہاں نہ بتایا تھا اس ”جال“ سے بچ لگانا ان کے

لیے ممکن ہی نہ تھا۔
 کرل مونگیا نے اس کی رانٹ میں اس امکان پر غور نہیں کیا ہو گا کہ وہ پیدل یہاں
 سے نکلیں گے۔

اور.....

یہیں ایک ایسا بظاہر ”میس پوائنٹ“ تھا جو ان کے حق میں جاتا تھا۔ طاہر جانتا تھا کہ
 کامنی بیمار ہو چکی ہے۔ مسلسل بھاگ دوڑنے سے اسے تھکا دیا ہے۔ اسے علم تھا کامنی گزشتہ دو راتوں
 سے سو نہیں پائی۔ بس یہی دو تین گھنٹے کی نیند قیمت تھی جو اس نے یہاں لی تھی۔ پھر بھی وہ صورتحال
 کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔
 ”چلو کامنی۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنا بیگ بھی کامنی کے بیگ میں رکھا اور اسے اپنے کندھے پر لٹکا لیا۔
 کامنی نے رات یہاں سے خریدی ہوئی ”پیتا مبر“ (پتلی چادریں) جن پر سنسکرت میں پریشک کی
 مٹی تصیں دکائیں۔ ایک چادر کھول کر اس کے کندھوں پر ڈال دی اور ایک پٹا اسے اپنے سر پر
 باندھنے کے لیے دے دی۔

اس نے ماتھے پر پتلی پٹا باندھتے ہوئے کہا۔

اب وہ واقعی ایک عمل بند اور ”بھوانی ماں“ کا بھاری دکھائی دے رہا تھا۔

کامنی نے اپنے بال کھول کر جب اپنے شانوں پر لہرائے اور ماتھے پر بڑا سا تھک لگا لیا
 تو سمیرو دی چلے میں لپٹی کامنی کی طرف دیکھ کر اسے ”میرا بانی“ یاد آ گئی!! اُس نے میرا بانی کو
 دیکھا تو نہیں تھا لیکن اس وقت جو روپ کامنی نے دھارنا تھا میرا بانی تصاویر میں بھی ایسی ہی دکھائی
 دیا کرتی تھی۔

رواگی سے پہلے طاہر نے کچھ قرآنی آیات کی تلاوت کی تو کامنی کو عجیب سی طمانیت کا
 احساس ہوا۔

”یہ کیا پڑھا تھا تم نے۔“

اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

”میں نے وہ آیات پڑھی ہیں جو میں کسی بھی سفر پر رواگی سے پہلے پڑھنے کی تلقین کی

گئی ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ اس کے بعد کوئی آفت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ کیونکہ اب اللہ تعالیٰ ہماری خود حفاظت فرمائے گا۔

”مجھے بھی پڑھاؤ۔“

کامنی نے یہ کہہ کر طاہر کو چونکا دیا۔

”تم۔“

طاہر نے حیرانگی اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے کہا۔

”ہاں میں..... مجھے پڑھاؤ طاہر“

کامنی نے خند کے لیے سے کہا۔

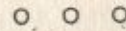
طاہر نے ایک ایک لفظ اس کے منہ سے ادا کروایا اور سرشاری کی عجیب سی کیفیت کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کیا۔

سورج ابھی مکمل طلوع نہیں ہوا تھا۔

اس علاقے میں یوں بھی پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے دھند زیادہ بھائی رہتی تھی اور سورج کچھ دیر سے ہی دکھائی دیا کرتا تھا۔

عموماً ایسی سردی میں لوگ گھروں سے ضروری کام کے لیے ہی باہر آیا کرتے تھے لیکن آج چونکہ ”مائی کاکا“ کے مندر میں سالانہ میلہ چل رہا تھا اس لیے یاتریوں کے جلوس ابھی سے نکلنے شروع ہو گئے تھے۔

یہ وہ لوگ تھے جو مختلف شہروں سے ٹولیوں کی شکل میں آتے اور یہاں سے نکلنے والے مختلف جلوسوں کا حصہ بن جاتے تھے۔



طاہر نے گزشتہ چار دنوں سے جان بوجھ کر شیو نہیں بنائی تھی اور چار دنوں میں اس کی داڑھی کے بالوں نے سارا چہرہ ڈھانپ لیا تھا۔ خدا جانے اس نے اپنے پاس وہ عقیدہ شیو والی عینک کب سے اس وقت کے لیے چھپا کر رکھی ہوئی تھی جو بظاہر نظر کی عینک دکھائی دیتی تھی۔ اس عینک کو لگانے اور اپنے سر میں درمیان سے چیر نکالنے کے بعد اس کی شناخت بڑی آسانی سے ممکن نہیں رہتی تھی۔

اپنی رانست میں کامنی نے بھی اپنی شناخت نامکن بنادی تھی۔ اسے تو باقاعدہ اس بات کی تربیت دی گئی تھی کہ اپنی شناخت کس طرح تبدیل کی جائے۔

روانگی پر جب کامنی نے اپنا ہسٹول طاہر کی طرف بڑھایا تو اس نے لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا۔

”نہیں کامنی۔ میرا کام اس کے بغیر بھی چل جائے گا تم اسے ضرور اپنے پاس رکھو۔ اگر خدا نخواستہ کہیں ایسا کوئی وقت آیا تو میں تم سے پہلے مردوں گا۔ یہ میرا اپنے آپ سے تم سے اور اپنے اللہ سے وعدہ ہے۔ اب تمہاری حفاظت میرا اولین فریضہ ہے۔ لیکن تمہارے لیے ایک بات ضرور کہوں گا کامنی کہ زندہ کسی ان لوگوں کو ہاتھ نہ لگنا۔“

”ایسا کبھی ممکن نہیں ہوگا۔“

کامنی نے وعدہ کی طرح کڑک کر کہا تھا۔

طاہر نے خود ہسٹول کو لوڈ ان لوڈ کر کے چیک کیا اور اس کی کارکردگی سے مطمئن ہونے کے بعد ہسٹول اس کی طرف بڑھا دیا۔

”Take it“

اس نے پرفیشنل لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے۔“

کہہ کر کامنی نے ہسٹول دوبارہ اس پوزیشن پر چھپایا جہاں سے وہ اسے آسانی سے نکال کر استعمال کر سکے۔

دونوں اگلے پندرہ منٹ بعد ایک بڑے جلوس کا حصہ بن چکے تھے!!

شہر کے آخری کونے تک انسانوں کی بھیڑ گئی تھی اور اس بھیڑ کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے نکل رہے تھے۔

طاہر کو کامنی کی صحت کا احساس تھا۔ اس نے تھک دہر تپ کامنی کو اپنے سہارے چلانے کی کوشش کی تھی حالانکہ کامنی اس پر اب ایک لمبے کے لیے بھی بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی۔

”طاہر مطمئن رہو۔ میں ٹھیک ہوں۔“

اس نے پلا خطاہر کے عندیہ کو بھانپتے ہوئے کہا۔

دونوں شہر سے باہر آ گئے تھے اور اب اس پہاڑی پکڑی پر سفر کر رہے تھے جو راستے میں آنے والے قریباً کیا رہ گیا تھا تو اس سے گزرنے کے بعد انہیں منزل مقصود پر پہنچا دیتی۔ جہاں سے وہ محفوظ سفر کے ذریعے پونٹا صاحب پہنچ جاتے جو کھسوں کا مقدس مقام تھا جہاں اس صوبے کا سب سے بڑا گوردوارہ بنا ہوا تھا۔

”مطمئن رہنا میں ان جنگلوں اور پہاڑی سلسلوں میں بڑی جگہ ماری ہے۔ کچھ آئیڈیا مجھے بھی ہے۔“

کاشی جانتی تھی طاہر اس کے متعلق پریشان ہے۔ شاید اس لیے اس نے یہ فقرہ کہا تھا۔

”میں جانتا ہوں کاشی۔“

طاہر نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

دونوں قریباً دو گھنٹے ایک دوسرے سے باتیں کرتے اس پہاڑی سلسلے میں چلتے چلے گئے۔ اس درمیان طاہر نے تین چار مرتبہ اپنی گھڑی میں نصب کپاس کے ذریعے اپنی دست چھ ہونے کی تصدیق کر لی تھی۔ اب تک کاشی صرف اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر چلتی چلی آ رہی تھی۔

○ ○ ○

سورج نکل آیا تھا جس سے سردی کا زور کچھ کم پڑ گیا تھا۔

کاشی نے اپنا چلا اس سلسلے میں داخل ہوئی اس اتار کر طاہر کے کندھے سے لٹکے ایک میں شوش دیا تھا اور طاہر نے بھی نیکی گل دہرایا تھا۔

دونوں ابھی تک ایک سرشاری کے عالم میں چلتے چلے جا رہے تھے۔ اس دوران کاشی نے دو تین مرتبہ ایک دو گھونٹ پانی اس بوتل سے اپنے حلق میں اٹھایا تھا جو انہوں نے سفر کے آغاز پر سسوری سے خریدی تھی۔

طاہر محسوس کر رہا تھا کہ کاشی کی توانائیاں کم پڑنے لگی ہیں۔

انہیں سفر کرتے قریباً چار گھنٹے ہو رہے تھے جب اچانک اس نے کاشی کو لڑکھڑاتے

دیکھا۔

”کاشی۔“

اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور اس نے دیوانہ وار لپک کر اسے زمین پر گرنے سے

پہلے تھام لیا تھا۔

سہارا دے کر وہ کاشی کو پہاڑی کی اوٹ میں لے آیا۔ یہاں سوائے کسی جنگلی جانور کے اور کوئی خوف نہیں تھا۔

طاہر نے اس کا بازو پکڑا تو اسے احساس ہوا کہ کاشی نے مسلسل پیدل چل کر اپنے ساتھ کسی زیادتی کی تھی۔

وہ بخار میں پھنک رہی تھی۔

طاہر نے بیک سے چادر نکال کر اسے اچادہ پر بٹھادیا۔

”معاف کرنا ذرا پکڑ آ گیا تھا۔“

کاشی نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اسے اس بات کا افسوس ہو رہا ہو کہ ایسا کیوں ہوا

ہے؟

طاہر کا دل بھر آیا۔

لیکن اس نے کمال ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔

”پو آ کر گریٹ کاشی۔“

اس نے بیک کی زنجیر کھولنے ہوئے کہا۔

بیک سے اس نے کچھ اوراد پڑاتے اور دو دھکا پکٹ نکال کر کاشی کی طرف بڑھایا۔

”کاشی تم اچھا سمجھو یا۔ اس مرتبہ تمہارا سارا دودھ چٹا پڑے گا۔“

”یہ تمہارا حکم ہے کیا؟“

کاشی نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”جی سمجھ لو۔“

طاہر نے اندازہ کر لیا تھا کہ کاشی صرف اسے مطمئن کرنے کے لئے مسکرا رہی ہے ورنہ

اس کا آج ایک دور دراز تھا۔

”او۔۔۔“

کہہ کر کاشی نے اس کی دی ہوئی گولیاں دودھ کے ساتھ گھل لیں اور ایک ایک گھونٹ

کر کے خاصا دودھ بھی پی لیا باقی پکٹ پہلے کی طرح اس نے خالی کر دیا تھا۔

”کاشی سونے کی کوشش کرو۔“

طاہر نے اسے زبردستی چادر پر لٹا دے ہوئے کہا۔

”طاہر مجھے خینڈ نہیں آئے گی۔“

”کیوں نہیں آئے گی۔ اس میں ایک خواب آور گولی بھی موجود تھی۔“

طاہر نے اپنے زانو کو سر بٹانے کا اس کا سر وہاں رکھ دیا تھا۔

کاشی نے اس کی طرف جگر پاش نظروں سے دیکھا اور آنکھیں موند لیں۔ طاہر نے

اسے کوئی خواب آور گولی تو نہیں دی تھی لیکن کاشی پر تھکاوٹ اس بری طرح سوار تھی کہ موقع ملے

ہی اسے گہری خینڈ نے آلیا۔

جب طاہر کو یقین ہو گیا کہ وہ گہری خینڈ سو گئی ہے تو اس نے طہیستان سے اس کا سر اپنے

زانوں سے اتار کر اپنی بیٹ سے بتائے سر ہانے پر رکھ دیا اور خود اٹھ کھڑا ہوا۔

گو کہ اس نے کھانے پینے کا کچھ ذخیرہ کر لیا تھا لیکن اسے کاشی کی صحت کی فکر تھی

جس کے لیے خوراک کا بندوبست کرنا ضروری تھا۔ سواری کا جو نقشہ اس کے ذہن میں تھا اس کے

مطابق یہاں زیادہ سے زیادہ ڈیزل ڈیوٹو میٹر کے پریامیٹروں کی گاؤں ہونا چاہیے تھا۔

○ ○ ○

کاشی کو سوچا چھوڑ کر وہ پہاڑی کی چوٹی پر آ گیا۔ اس کا اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ یہاں

سے بمشکل ڈیزل ڈیوٹو میٹر کے فاسٹلے پر درختوں کے جھنڈ میں گھرے اس کو کچھ گھر نظر آ رہے تھے۔

اپنی جیب سے کانڈ کا ایک ٹکڑا نکال کر اس نے کچھ لکھا اور اسے کاشی کے نزدیک

دوسرے بیک کے نیچے رکھ کر بے قدموں چلتا پہاڑی کے دوسرے طرف اتر گیا۔

اگلے بمشکل چندرہ منٹ بعد وہ ایک درخت کی اوٹ سے گاؤں کا جائزہ لے رہا تھا۔

جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ گاؤں نہیں کوئی سرکاری قصبہ یا ریٹ ہاؤس ہے جس کے ساتھ کچھ

چھوٹے چھوٹے گھر بنائے گئے ہیں۔ شاید یہ کوئی ”پک ٹک ٹکس“ تھی۔

اس نے کچھ سوچے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور یہ اندازہ لگانے کے بعد کہ کون سی

سمت زیادہ محفوظ رہے گی اس طرف سے آگے بڑھنے لگا۔ اب وہ ایک بڑے ریٹ ہاؤس کے

مقبب میں پہنچا جس کی چھٹی سے نکلے والے دھوکے اور کھلی کھڑکی سے برآمد ہوتی تازہ کھانے کی

خوشبو نے اسے احساس دلایا تھا کہ اس کا اندازہ بالکل صحیح ہے اور اس کی ہم کامیاب رہی۔

یہ ریٹ ہاؤس شاید انگریزوں نے بنوایا تھا اور وہی آخری سرجہ اس کے مقبب میں

موجود جھڑپوں کی صفائی کر کے گئے تھے کیونکہ اب وہاں گھاس کا ایک جنگل سا دکھائی دے رہا تھا

چونکہ یہ راستہ زیر استعمال نہیں تھا اس لیے شاید اس طرف کسی نے صفائی کا دھیان بھی نہیں دیا تھا۔

بجلی کی سی بھرتی سے اگلے چند منٹ بعد وہ اس کھلی کھڑکی کے نیچے پہنچ گیا تھا جس سے

اشتعال انگیز خوشبو آ رہی تھی اور پکٹے والے کھانوں کی بھاپ باہر نکالنے کے لیے شاید یہ کھڑکی

کھلی تھی۔

کھڑکی اس کے سر سے بمشکل تین چار فٹ بلند تھی۔

اجمل کر طاہر نے اس پر ہاتھ جمائے اور ہاتھوں کے بل پر اپنا جسم کسرت کرنے کے

انداز میں اوپر اٹھایا۔ اندر ایک سفید پوش پیراٹھالی پر کھانا سجا رہا تھا جس سے اس نے اندازہ لگایا

کہ پیرہ دوسرے کمرے میں موجود ”صاحب لوگوں“ کے لیے کھانا لے جا رہا ہے۔ چونکہ پیرہ کی

پشت اس کی طرف تھی اس لیے وہ آرام سے اندر کا نظارہ کرتا رہا۔

اس نے دیکھا کہ پیرہ نے ایک عجیب سی حرکت کی۔ ٹرائی پر کئی شیپن کی بوتل سے

اس نے اپنے لیے پہلے ایک پیگ تیار کیا اور اسے طلق میں اثر پینے کے بعد دو اور پیگ تیار کر کے

ٹرائی پر رکھے۔

اب وہ اپنا منہ صاف کرنے کے بعد اندر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

طاہر لچکی سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

جیسے ہی پیرہ وہاں سے نکلا اور اس کے مقبب میں دروازہ بند ہوا دوسرے ہی لمحے طاہر

بازوؤں پر اچھل کر اندر آ گیا۔

اس نے سامنے موجود فرنج سے ڈبل روٹی، ٹکھن، پیر اور سامنے چولہے کے نزدیک

دھری ہنڈیا سے پیرہ کا تیار کردہ پکچن اور دوسرا اٹلم یہاں دھریے ایک سٹیل کے بڑے سے

برتن میں ڈالا۔ اس نے اس سارے سامان کو کھڑکی پر رکھ کر باہر منتقل کرنے اور وہاں سے فرار ہو کر

درختوں کے جھنڈ میں غائب ہونے تک بمشکل تین منٹ کا وقت بھی نہیں لگایا تھا۔

کاشی کو سونے ہوئے دو گھنٹے ہونے کو آ رہے تھے جب اس کی آنکھ کھلی۔ پیرہ سے

اس کا جسم اس طرح بیگم رہا تھا جیسے وہ پانی کے لب میں بیٹھی ہو۔

لیکن.....

جسم کے سارے سامان کھلنے سے وہ بہت بہتر محسوس کر رہی تھی شاید بخارا تر گیا تھا۔ کیونکہ اسے اب بھوک لگی ہوئی تھی۔

گردن گھما کر اس نے دیکھا ظاہر عائب تھا اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے سامنے دھڑے بیک کے پیچھے رکھے کاغذ کو نکال کر اس نے بے چینی سے نظریں دوڑائیں اور مطمئن ہو کر گہری سانس لے کر بیٹھ رہی۔ کاغذ پر لکھا تھا۔

”میزم گھبرا نہیں۔ آپ کے کچ کا بندہ دست کرنے گیا ہوں۔“

ایک ڈی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پک گئی۔ اسے اپنے فیصلے پر اب خیر ہونے لگا تھا۔

سامنے دھری بول سے دو گھونٹ پانی اس نے حلق میں اندر بالا جو خشک ہو رہا تھا اور ابھی بول نہ کھ کر ایک سے ایک لگائی تھی جب عقب سے ظاہر نمودار ہوا۔

”کھانا حاضر ہے میڈم“

اس نے مودب ہیروں کی طرح چکن ڈیل روٹی کھین چیز سب کچھ ایک ایک کر کے اس کے سامنے رکھ دیا۔

”اوہ مائی گاڈ! تم کہاں گئے تھے ظاہر کہاں سے لائے یہ سب کچھ۔“

”بے اختیار وہ ظاہر سے لپٹ گئی۔“

”پہلے کھانا کھربا تیں۔“

ظاہر نے اسے خود سے آہستگی سے الگ کیا۔

اور.....

اس کے بعد دونوں ایک ہی برتن میں کھانے لگے کاشی کے لیے یہ بھی زندگی کا پہلا اور روح کی گہرائیوں تک اتر جانے والا تجربہ تھا۔ گرم گرم چکن نے اس کی ساری توانائیاں واپس لوٹا دیں۔ کھانے کے دوران ظاہر اسے اپنے اس کارنامے کی تعصبات سے مزے لے لے کر آگاہ کر رہا تھا۔

”اب اس سے پہلے کہ ہوش میں آنے کے بعد میرے صاحب اپنے برتن کی تلاش شروع کریں۔ ہمیں یہاں سے رفق چکر ہونا چاہیے۔“

کھانے کے خاتمے پر اس نے ڈیل روٹی اور باقی چیزیں سمیٹے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ اب میں بالکل تیار ہوں۔ صبح تک تمہارے ساتھ چل سکتی ہوں۔ تم پر کوئی بوجھ ڈالے بغیر۔“

کاشی نے بڑے اعتماد سے کہا۔

اور.....

دونوں عازم سفر ہوئے۔

انہوں نے بچا کھپا کھانا برتن سمیت اس طرح ٹھکانے لگایا تھا کہ اس طرف سے گزرنے والے کسی شخص کو دکھائی نہ دے۔

یوں بھی اس راستے پر کسی انسان کا گزر کم ہی رہا ہوگا۔ کاشی اب خود کو مکمل ف محسوس کر رہی تھی۔

شام ڈھلنے تک ان کا سفر جاری رہا۔

اس دوران ظاہر نے تمام نمازیں ادا کی تھیں۔ کاشی دلچسپی سے اسے نماز پڑھتے دیکھتی اور ہر نماز کے بعد اس کے فرائض اور دیگر عبادات سے متعلق دریافت کرتی۔

مسوری سے روانگی اور اگلے روز چو پہنچنے پر اس سڑک تک پہنچنے کے بعد جواہرین پوٹا صاحب کی طرف لے جاتی کاشی نے اس سے صرف اسلام پر باتیں کی تھیں۔ وہ کہہ کر یہ کہ اس سے مختلف سوالات کرتی آئی تھی۔

ان سوالات میں اس کے لاشعوری گہریلے تربیت کی بنیاد پر جنم لینے والے بہت سے ٹھوک و شبہات اور تجسس کا پہلو نمایاں تھا۔

سیرت طیبہ ﷺ کے ابتدائی واقعات سے وہ بے پناہ متاثر دکھائی دے رہی تھی اور اسے اب تک ارکان اسلام سے متعلق بھی آگاہی ہو چکی تھی۔ اب اس نے اپنا مضمون ظاہر کا ملک بنالیا تھا۔

”مجھے ذرا سانس لینے دو اور کچھ سوچنے کا موقعہ دو۔“

طاہر نے سڑک کے نزدیک پہنچنے پر کہا۔
کامنی خاموش رہ گئی۔

دونوں نے اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق یہاں سے گزرتی ایک ٹیکسی کار کو روکا
اور نوپا بتائیاں بیوی کی حیثیت سے سفر کرتے ہوئے صاحب سے کچھ فاصلے پر ہی اتر گئے جہاں پوننا
صاحب تک پہنچنے کے لیے انہوں نے جان بوجھ کر تین چار بیس تبدیل کی تھیں۔

دوپہر کے بعد وہ یہاں پہنچ گئے تھے۔

اب طاہر گولی بانڈھ کر ترسیم نگاہ اور کامنی اس کی سنگھنی بن چکی تھی جو اپنی منت
اتارنے سہار پور سے یہاں آئے تھے۔

گوردوارے کے لشکر سے انہوں نے ”پر شاہ“ کہا یا اور ”سراسے“ کے ایک کمرے میں
الہیتان سے بیٹھ گئے۔ طاہر جو گزشتہ ۴۰ کھٹے سے مسلسل سفر میں تھا وہ خود کو پہلی مرتبہ قدرے
پرسکون محسوس کر رہا تھا۔ اسے الہیتان اس بات کا بھی تھا کہ دوبارہ کامنی کا ٹیپر چکر نہیں بڑھا تھا۔
البتہ ایک پریشانی تھی کہ ابھی تک انہیں کوئی ڈھنگ کا کمرہ نہیں ملا تھا۔ گوردوارے کے آشرم میں
کوئی کمرہ خالی نہیں تھا۔

○○○

کرل بھائیہ اس وقت ڈیرہ دون میں اپنے بٹائین کے سالانہ دور بار کی تقریبات میں
شرکت کرنے آیا تھا۔ تقریبات کا آغاز اگلے روز ہونے جا رہا تھا اور اسے بطور خاص مدعو کیا گیا
تھا۔ حالانکہ گزشتہ ڈیڑھ سال سے وہ مختلف نوعیت سے فرائض کی ادائیگی کی وجہ سے اپنی بٹین سے
باہر ”ڈیوٹیشن“ پر تھا۔

وہ شام ڈھلے شدہ بارش میں یہاں پہنچا تھا۔

پھر اتنے سے یہاں تک مسلسل اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ ایک لمبے کے لئے اگر
اس کی جیب کا ڈرائیور روٹھ سکریں پر چلنے والے پر کو روکتا تو دونوں اندھے ہو جاتے۔ موسلا دھار بارش
کا چھاجوں پانی ان کے چاروں طرف شیشوں پر بہہ رہا تھا۔

بھگوان کا شکر تھا کہ جیب میں بیٹر لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے سامنے روٹھ سکریں قدرے
صاف ہو جاتی اور انہیں کچھ دور کا منظر دکھائی دینے لگتا تھا۔

جیب کی رفتار قدرے کم تھی۔۔۔۔۔

یہ احتیاط کا تقاضا تھا۔۔۔۔۔

تیز بارش اور برقی ہوائے باہر کے سارے ماحول کو خمد کر کے رکھ دیا تھا اور جیب کی
طاقتور ہیڈ لائٹس جن کے ساتھ اس علاقے کے موسمی تقاضوں کے پیش نظر بطور خاص اضافی لائٹس
لگائی گئی تھیں، بھی زیادہ درجہ کا منظر واضح کرنے میں ناکام دکھائی دے رہی تھیں۔

ایک تو اس سڑک پر سڑیٹ لائٹس نہیں تھیں اور اوپر سے موسم کی بلاغی نے سارے

ماحول کو بکتر رکھا تھا۔

وہ راستہ جو معمول کے مطابق ایک گھنٹے میں طے ہو جایا کرتا تھا۔ اس وقت گھنٹوں پر پھیل چلا جا رہا تھا۔ خدا خدا کر کے وہ بلا آخر آفیسر زمیں تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ اگر وہ مزید دس منٹ لیٹ ہو جاتا تو شاید اس شاعر ڈرنے سے محروم رہ جاتا جو اس کی پلٹن کا ”روایتی ڈنر“ تھا جس کا انتظار سارا سال بٹالین کے جوئیر افسران کیا کرتے تھے۔

آج انہیں بطور خاص ڈرنے سے پہلے کالج پیش کی گئی تھی!

کرنل بھائی نے آفیسر زمیں کے ہال میں گھسے ہی آتشدان کے نزدیک کرسی سنبھال لی تھی اور اب ایک مودب پیراس کے سامنے کالج سے بنا جام پیش کر رہا تھا۔

اس کا ذرا نیورا بھی تک جپ میں ایدھنی ڈیوٹی پر تھا۔

یہ اس کا فرض تھا کہ جب تک کرنل صاحب جپ سے باہر وہیں وہ جپ کے اندر موجود ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے کرنل نے اس کی حالت پر دم کھاتے ہوئے اسے نظر سے جانے پینے اور کھانا کھانے کی رخصت ضرور دے دی تھی۔

یہ الگ بات ہے کہ یہ رخصت آدھے گھنٹے سے دو ڈھائی گھنٹے پر محیط ہو گئی تھی۔ کیونکہ اس کے ڈرائیور کو دوسروں کی طرح بہت سردی لگ رہی تھی اور وہ دوسرے جوانوں کے ساتھ ”زم“ پینے میں مشغول ہو گیا تھا۔

جب وہ شراب پینے اور کھانا کھانے کے بعد تندرے کے بعد تھل آنگھوں کے ساتھ جپ تک پہنچا تو جپ کا وائرلیس مسلسل جج کر خاموش ہو چکا تھا۔

قریباً ایک گھنٹہ سے کرنل بھائی کی جپ میں موجود وائرلیس پر اس کا سیکٹر ان کماڈر میجر وکرم سوداس کے ساتھ رابطے کی کوشش کر رہا تھا تا کہ اسے یہاں گزرنے والی قیامت سے باخبر کر سکے۔

لیکن.....

جپ پر اس کی مسلسل ”ہیلو کماڈر“ ہیلو کماڈر کو جواب سوائے دوسری طرف سے ہونے والی شوشوں کے اور کچھ نہیں آرہا تھا۔

اب پریشان ہو کر میجر سوداس ج رہا تھا کہ کرنل بھائی کو اس کے بٹالین ہیڈ کوارٹر کے

ذریعے ہی مطلع کر دے کیونکہ اس کے پاس سوا اس کے اور چارہ کاری کوئی نہیں رہ گیا تھا۔ میجر وکرم سوداس نے چند روز پہلے ہی ”ہنواری کمپ“ رپورٹ کی تھی۔ وہ سیا جن سے بڑی سفارشوں اور زور آزمائی کے بعد یہاں آیا تھا اور یہاں آنے کے اگلے ہی روز اس نے اپنے گھر والوں کو کہا تھا کہ وہ دیوی ماں کا ہون کھنڈ کر دوائیں کیونکہ اس کے گلے سے بلا ٹلی ہے۔

اگر وہ مزید ایک ہفتہ سیا جن میں رہ جاتا تو شاید زندگی بھر اپنے گھر والوں کو نہ مل سکتا کیونکہ پھر اس کا ٹھکانہ ہسپتال یا پاگل خانہ ہوتا۔ سیا جن کے محاذ پر پوسٹک سے پہلے اس نے یہاں سے متعلق حیثیت ناک کہانیاں ضرور سن رکھی تھیں۔

لیکن..... بھارتی ڈائنٹین ڈیوٹن کے ایک جوئیر افسر کی حیثیت سے وہ اس سے پہلے بیٹا اور لداخ میں قیام کر چکا تھا۔ اس لئے اسے امید تھی کہ وہ دوسرے بھارتی جوانوں کی طرح اتنی جلدی گھبرانے والا نہیں.....

اس کی تو تربیت ہی موسمی شدائد کا مقابلہ کرتے ہوئے ہر قیامت کی رکھشا کرنے کے لئے کی گئی تھی.....

جس روز اسے سیا جن پہنچنے کا حکم ملا میجر سوداس کے علاوہ کبھی کے ہر جوان کا چہرہ لنگ گیا جبکہ میجر سودا ایک ایک جوان کے پاس جا کر اس کا حوصلہ بڑھاتا رہا وہ انہیں بار بار کہہ رہا تھا کہ ان کا تعلق پہاڑی ڈیوٹن سے ہے اور انہیں کم از کم بھارتی آری کی ایک مثال بن کر رہنا ہے۔

لیکن..... اس کے جوان جانتے تھے کہ میجر صاحب کو حالات کی گنگنی کا احساس نہیں اور ان کی ساری دلیں متعلق کا بھوت سیا جن پہنچنے کے اگلے ہی روز اتر جائے گا.....

اور.....

ایسا ہی ہوا.....

واقعی جب وہ اپنے کپتانی کے دس جوانوں کے ایک سیکشن کے ساتھ ایک کماڈر پوسٹ پر ٹیلی کا پٹر کے ذریعے اترتا تو اسے یوں لگا جیسے کسی نے اسے برف کے جہنم میں دھکیل دیا ہو۔

سامبر یا کی سردی اس کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔

پہلے سے تیار کردہ خصوصی گرم فوجی یونیفارم پہنے ہوئے میجر سوداس کے جوانوں کو سردی اپنی ہڈیوں میں سرایت کرتی محسوس ہو رہی تھی کہ ان کے جسم کا ایک بال بھی بچا نہیں تھا۔

ہاتھوں میں دستانے اور آنکھوں پر بینک لگائے جس کے شیشوں سے بظاہر ہوا کے آنکھوں تک جانے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے وہ سب اپنے کندھوں سے ہمیں لٹکائے جب بلی کا خیر سے باہر نکلے تو پوسٹ ان سے بمثل پچاس گز دور تھی۔

شاید ہی ایک جگہ ایسی تھی جہاں بلی کا پٹر لینڈ کر سکتا تھا۔ انہیں اب ایک دوسرے کے جسم سے رسی باندھ کر اپنی پوسٹ تک پہنچانا تھا جو یہاں سے قریب آجیاس گڑ دور اور قدرے اونچائی پر بنی ہوئی تھی۔۔۔۔۔

مہجر سود کے اندازے کے مطابق ابھی صبح کے دس بجے تھے..... لیکن سردی سے یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں غرغمد ہشتی کی کوئی رات ہو رہی ہو.....

سب سے آگے دوہ خود چل رہا تھا.....

اسے اپنا ایک ایک قدم ہزاروں میں بوجھل محسوس ہو رہا تھا۔ بڑے بڑے کیلوں والی خصوصی بوٹ پہنے ہو جب برف کے فرش پر ایک قدم رکھتے تو دوسرا قدم زمین پر گر جاتا زمین سے قدم نکالنے پر انہیں خاصا زور لگانا پڑتا۔

ان کی پوسٹ والوں نے شاید ان کے استقبال کے لئے اور اپنی اس ہرف کے جہنم سے رہائی کی خوشی میں کچھ ہوائی فائر کے تھے کیونکہ وہاں موجود جوانوں کو ایسی جیلی کا پٹر پر سوار واپس جانا تھا جو انہیں یہاں لے آتا تھا۔

کمانڈر پوسٹ پر ایک ماہ تک فرائض انجام دینا ایک جہنم کے برابر اذیت برداشت کرنے سے کچھ زیادہ ہی تھا۔

مردی کا یہ عالم تھا کہ یہاں پہلی کاپڑ کے انجن بن گئے جاتے تھے مبادا وہ دوبارہ
سٹارٹ ہی نہ ہو سکے ابھی پائلٹ پہلی کاپڑی میں موجود اور مستعد تھا..... اسے علم تھا کہ
دونوں مکاشروں کو ایک دوسرے کو چارج سوچنے میں پندرہ بیس منٹ لگ جائیں گے جس کے بعد
ہاں موجود جوان اس تک پہنچے میں مزید دس پندرہ منٹ لگا دیں گے۔

بیلی کا پتھر کے میٹر پوری رفتار سے چل رہے تھے اور اندر کا ماحول خاصا آرام دہ ہو رہا تھا۔

کمانڈر پوسٹ کی طرف سے کئے گئے "استقبالی فائر" کا دوسری طرف کچھ اور ہی

مطلب لیا گیا یا پھر دوسری طرف موجود دشمن نے نئے آنے والوں کو ”ویل کم“ کرنے کے لئے ان کی سمت احاطہ ہی کو لے جانے شروع کر دیئے۔

دوئوں پشتوں کے درمیان بمشکل سوز کا قاصد رہا ہوگا اور دوئوں طرف سے ایک دوسرے کی کوئی حرکت پوشیدہ نہیں رہتی تھی۔ دوسری طرف سے آنے والے قاتل نے سمجھ سوا اور اس کے بہادر جوانوں کو بھٹکا کر رکھ دیا وہ دوسرے کی لحد زمین بس ہو گئے!

میر محمد سود کے لئے یہ بڑی پریشان کن صورت حال تھی.....
یہ کوئی اچھا شگون نہیں تھا۔

انہیں یہاں ایک ماہ گزارنا تھا اور ان کی آج کے ساتھ ہی یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ زمین پر لیٹے لیٹے اس نے زوردار آواز میں اپنے کاٹھ پوسٹ والے ساتھیوں کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ جن کے ”استقبالی فائر“ کا دشمن نے غلط مطلب سمجھ کر ان کی طرف قاتلنگ شروع کر دی تھیں۔

ہوسٹ کا ٹرکے لئے بھی یہ صورتحال پریشان کن تھی۔

اس نے فوراً اپنے جوانوں کو فائرنگ روکنے کا حکم دیا اور انہیں گالیاں بکتے ہوئے پشٹ کے صندوق کوٹنے سے سفید جمنا لہر کا دوسری طرف دشمن سے فائر روکنے کی درخواست کرنے لگا۔

دشمن کو شاید ان پر ترس آگیا کیونکہ پانچ مہینے کے بعد حقیقی فائرنگ رک گئی۔
میجر سونے زمین سے اٹھ کر اپنے جوانوں کا جائزہ لیا اور جنگجوؤں کا شکرا ادا کیا کہ وہ
سب محفوظ تھے۔

تھیں۔
کمانڈر پوسٹ والوں کی کبھی آگئی تھی کیونکہ قازم کا آغاز ہونے ہی پہلے کا پڑ کر اس
بائلٹ بھاگے رہا تھا۔

اسے یہی احکامات ملے تھے۔ یہاں سب سے اہم چیز یہی کا پڑ گئی۔ جس کے سائے انسانی جان کو بھی اہمیت نہیں تھی کیونکہ رابلے کا یہی واحد طریقہ تھا

پوسٹ کمانڈر نے اپنا سر پھٹ لیا.....

مجرسودا سے اور وہ اپنے جانوں کو گنا گنا دے رہا تھا۔ بمشکل وہ پوسٹ تک پہنچے اور بادل خواہ سے ایک دوسرے کو خوش آمدید کہا۔

مجرسودا کے لئے اس کی آمد کے ساتھ ہی مصائب کا آغاز ہو گیا تھا۔ انہیں دور رتیں دا جانوں کے لئے موجودا ہی پست پر ۲۰ جانوں کے ساتھ گزارا پڑیں جن میں سے تین بیمار تھے۔ دو دن تک ہیلی کاپٹر انہیں لینے نہیں آیا کیونکہ ابھی تک انہیں دوسری طرف سے ”سیف سگنل“ نہیں ملا تھا۔

پوسٹ کا ڈر کی منت ساجت کے بعد خدا کر کے تیسرے روز ہیلی کاپٹر آیا اور پوسٹ کا ڈر اپنے بیمار اور ڈھی جانوں کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوا تو وہ مسٹر استعمال کرنے کے قابل ہوئے ورنہ تو انہیں گزشتہ ۲۸ گھنٹوں میں بمشکل ۵ گھنٹے سونا نصیب ہوا۔



یہ آغاز تھا.....!

مجرسودا کو اس علاقے میں تین ماہ گزارا۔ یہ تصوری اس کے لئے جان لیوا تھا اس نے جیسے جیسے روتے جیتے یہاں ایک ماہ گزارا اور وہاں ہی کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ میجر جنرل سالگ رام کا داماد تھا۔

جنرل ہیڈ کوارٹر میں موجود اس کے سر نے اپنی تمام تر ساعی بروئے کار لا کر اسے قریب دو ماہ بعد برف کے اس جہنم سے نجات دلائی تھیں۔ میجرسودا کی خوش قسمتی کہ ماضی قریب میں اس نے جوا علی جنس اور کما ڈو کورس کئے تھے وہ اس کے کام آگئے اور وہ یہاں ہوا ہی ایک کپ میں ڈیپوشن پر آ گیا۔

بڑی سوچ بچار کے بعد اس نے کرل بھائیہ کے لئے ایمر جنسی سگنل دیا تھا.....!

کرل بھائیہ اس وقت ٹائلیٹ سنٹر کے بوئے ہال کمرے میں اس آرکسٹرا پر ایک لڑکی کے ساتھ ڈانس کر رہا تھا جو بطور خاص آج کی اہم تقریب کے لئے بلایا گیا تھا۔

کھانے کے بعد تپے گانے کا دور چلا تھا.....

یہاں تمام افسران کی یکیات اور دوسری خواتین بطور خاص مدعو کی جاتی تھیں۔ ان بلائی جانے والی خواتین میں سے ایک کے ساتھ وہ بھی آرکسٹرا کی بھائی دھنوں پر تاج رہا تھا۔ ہال میں

چاروں طرف رنگ ہی رنگ نکھرے پڑے تھے۔

شراب کے نشے میں دھت تمام چھوٹے بڑے افسران اپنی یکیات اور مہمان خواتین کے ساتھ مدھوشی کے عالم میں تاج رہے تھے جب مجمع کو جی تا ایک نوجوان کرل بھائیہ تک پہنچا۔

”سر.....سر.....“

اس نے دو تین مرتبہ کرل بھائیہ کو مخاطب کرنا چاہا۔

لیکن.....

کرل بھائیہ تو اس وقت ہوا میں اڑ رہا تھا۔ اس نے کیپٹن کی طرف دیکھنے کا تکلف بھی نہیں کیا۔ اس کے ساتھ تپنے والی کی حالت بھی کرل بھائیہ سے کچھ مختلف نہیں تھیں۔

کیپٹن کچھ چڑسا گیا.....!

اس نے آگے بڑھ کر کرل بھائیہ کا کندھا چھپتا کر اسے اپنی طرف مخاطب کیا۔ نوجوان کیپٹن کی اس حرکت پر کرل بھائیہ نے اس کی طرف پھاڑ کھانے والی نظروں سے دیکھا اور اس سے پہلے کہ اس کے منہ سے مفکرات کا طوفان اٹھے۔ نوجوان کیپٹن جو اتفاق سے نشے کی حالت میں نہیں تھا فوراً گویا ہوا۔

”ایمر جنسی سرا“

”وٹ.....What“

کرل نے قدرے جیتے ہوئے کہا کیونکہ آرکسٹرا اب پورے زور و شور سے دھنیں نکھیرنے لگا تھا۔ نوجوان کیپٹن کو بھانے میجرسودا نے صورتحال کی عین کاتنا زیادہ احساس دلادیا تھا کہ اس نے تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر اپنا منہ اس کے کان سے نزدیک لے جا کر کہا۔

”سر! ہوا ہی ایک پست سے ایمر جنسی سگنل ہے۔ میجرسودا ان لائن۔“

کرل بھائیہ کو زوردار جھٹکا لگا۔

”کم آن.....“

اس نے نوجوان کیپٹن کو باہر آنے کے لئے کہا۔

اور کیپٹن کے تعاقب میں چٹاہ دوسرے ہی لمحے ہال سے باہر تھا۔

دس دے سر! This way Sir!

کیپٹن نے وائلیس روم کی طرف اشارہ کیا۔

یٹالین ہیز کو افری دوسری منزل پر واقع وائلیس روم تک بیڑیاں اس نے قریباً بھاگتے ہوئے طے کی تھیں اور اب دونوں ایک کمرے میں کھڑے تھے۔

”بٹواری کیسپ ملادو۔“

وائلیس آپریٹر کو جو ان کیپٹن نے ہدایت کی جو انہیں دیکھتے ہی استراٹا کھڑا ہو گیا تھا۔

”لیس سر۔“

کہہ کر آپریٹر نے اگلے ہی لمحے لائن ملا دی۔ دوسری طرف میجر سودھی بے چینی سے اس کا انتظار تھا۔

اس نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر بٹواری کیسپ میں گزرنے والی قیامت سے اسے مختصراً آگاہ کرتے ہوئے اگلی ہدایات طلب کیں۔

”ڈیم اٹ۔“

کرٹل بھائی اتنی زور سے فون پر چلایا کہ کیپٹن اور آپریٹر سہم کر رہ گئے دوسری طرف میجر سودھی بھی شاید یہی حال ہو گئی ہوگی۔

لیکن.....

اس کا خون ایک لمحے کے لئے ضرور کرٹل بھائی کے اس لہجے پر کھول اٹھا۔ اس صورتحال کا ذمہ دار وہ نہیں تھا۔ اسے تو ڈیوٹی سنبھالے مشکل چار پانچ دن ہوئے تھے۔ اگر یہاں تحزیب کا کرکسپ میں بھی دشمن اٹھلی جنس کی کوئی تحریک کاروباری ہو رہی تھی تو اس کا وہ ذمہ دار نہیں تھا۔ بہر حال یہ ذمہ داری کرٹل بھائی پر عائد ہوتی تھی یا پھر میجر چوہان پر جس سے اس نے چارج لیا تھا۔

تین چار دن میں تو یہ سب کچھ ہونے سے رہا.....!!

بٹواری کیسپ کی تباہی کی خبر نے کرٹل بھائی کا سارا نشہ ہرن کر دیا تھا اور وہ قدرے پریشان بھی دکھائی دینے لگا تھا۔

شاید اسے یہ بھی احساس ہو گیا تھا کہ اس نے میجر سودھ کو بے خبری میں ڈانٹ پلا دی ہے

جو خود میجر جنرل کا داماد تھا اور سفارتی میں بھی قریباً اس کے برابر ہی تھا۔ اگلے دو تین ماہ وہ لیفٹیننٹ کرٹل بننے والا تھا۔

بیک وقت کئی سوچیں اس کے دماغ میں جنم لے رہی تھیں جواب بیدار ہو چکا تھا۔

”میں آ رہا ہوں۔“

اس نے مختصر سے پیغام دے کر کرٹل سے بچہ رکھ دیا۔

”ایچی پرائلم سر..... Any Problem Sir“

نہ چاہتے ہوئے بھی نو جوان کیپٹن کے منہ سے یہ بات نکل گئی۔

”نو پرائلم۔“

کرٹل نے اس کی طرف مڑ کر خالی خالی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور لمبے لمبے ڈگ

بھرتا کرے سے باہر آ گیا۔

کیپٹن اس کے تعاقب میں باہر آیا تھا۔

○○○

ڈاٹ کام

”کہیں بریگیڈ تیرملہوترو نے تو اس کا دھڑن جتے نہیں کروادیا.....؟“
اچانک ہی ایک سوچ اس کے دماغ میں پیدا ہوئی۔

اور.....

اس کے فکری ذہن نے اس کے حق میں دلائل بھی تلاش کر لئے۔
ہواری کیمپ کے سیکورٹی سسٹم میں غلطی سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہاں کسی ایسی واردات کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میجر سودی و ماغی حالت اگر صحیح تھی تو اس کی اطلاع کے مطابق اسلئے کا ذخیرہ تیار ہو چکا تھا۔ فون سنتے ہوئے کرنل بھادیہ کو دھماکوں اور چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

ابھی تک اس نے کسی خراب کاری کے گمان پر تو غور کرنا مناسب نہیں جانتا تھا۔

اس کے دہم و گمان میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ ایس ایس لی کے اس اہم ترین تربیتی کیمپ تک دشمن کی رسائی ممکن ہوگی۔ یہاں کے فول پروف نظام میں کسی کا گھس جانا کارے دارو تھا۔ یہاں تو وہ خراب کار تربیت کے لئے لائے جاتے تھے جنہوں نے پہلے دوسرے کیمپوں میں تربیت حاصل کی ہو اور جو بھارتی اٹلی جنس ایجنسیوں کے نزدیک قابل اہم ہوں۔ اگر کوئی نیا لڑکا براہ راست یہاں آتا تھا تو کڑی چھان بین کے مراحل سے گزر کر اسے یہاں آنا پڑتا تھا۔

کرنل جو یہاں کے سکیرٹری سسٹم کا ذمہ دار تھا بڑا احتیاط اور کایاں آدمی تھا۔ وہ ہر نئے آنے والے ایجنٹ کے ساتھ ایک طویل سفر کر کے اس کی مکمل چھان بین کر کے اور خود مطمئن

ہونے کے بعد ہی اسے ہواری کیمپ میں داخل ہونے کی اجازت دیا کرتا تھا۔ ایسی درجنوں مثالیں موجود تھیں کہ ”را“ کی طرف سے خصوصی تربیت کے لئے بھیجے گئے خراب کاروں میں سے اکثر کو کرنل نے راستے ہی میں چھٹی کرادی تھی۔ اس پر اکثر ایجنسیوں سے ان کی تو توش میں بھی ہوتی رہتی تھی لیکن حتیٰ فیصلہ بہر حال انہی کا مانا جاتا تھا کیونکہ کسی بھی اٹلی جنس ایجنسیوں کا کوئی بھی ایجنٹ اپنے کسی بھی ایجنٹ سے متعلق کوئی بھی ضمانت دینے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ ان حالات میں کسی ذیل ایجنٹ کا گمان بھی ممکن نہیں تھا۔

کرنل بھادیہ جانتا تھا کہ کرنل موگیا نے کسی پر اعتبار کرنا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ ہر کمرے میں اپنا ایک جاسوس ضرور رکھا کرتا تھا۔

ہر نئے گروپ میں ایک دوسرے کے علم میں لائے بغیر وہ ایک دوسرے کی جاسوسی پر ایجنٹوں کو لگا دیا کرتا تھا۔

انسٹرکٹروں کی روزانہ رپورٹس کا وہ خود جائزہ لیتا تھا۔ کیا خیال جو اس نے کسی کیمپ سے متعلق ذیلی رپورٹ نہ پڑنے کی کوٹاہی کی ہو۔ ہر ایجنٹ پر اس کی نظر ہوا کرتی تھی اور وہ اچانک ہی کسی ایجنٹ کو اپنے کمرے میں بلا کر اس کا مکمل نفسیاتی تجزیہ کر لیا کرتا تھا۔ معمولی سا شک گزرنے پر کسی کو مراد دینا یا مار دینا اس کے لئے معمولی بات تھی۔

ایسی بہت کم مثالیں ملتی تھیں کہ اس کیمپ میں تربیت کے لئے آنے والے گروپ کے خراب کار تربیت مکمل کرنے کے بعد پوری تعداد کے ساتھ باہر نکلے ہوں۔ عموماً ان میں سے ایک دو کم ہی ہوتے تھے۔

یہ وہ بد قسمت تھے جنہیں معمولی شک پر کرنل موگیا کے حکم پر مار دیا جاتا تھا۔ ان میں سے اکثر کو باقی ایجنٹوں میں خوف و ہراس پیدا کر کے انہیں اپنے قابو میں رکھنے کے لئے عموماً ان کے ساتھیوں کے سامنے بڑی آہستہ دینے کے بعد ہلاک کیا جاتا تھا۔

کبھی کبھی خوف و ہراس کی فضا بنانے کے رکھنے کے لئے ایک ایجنٹ کی جلی چڑھا دی جاتی تھی ان حالات میں اس خراب کاری کے کیا امکانات رہ جاتے تھے؟

اسی سوچ نے اسے گرا کر دیا تھا۔ لے دے کے اس کے ذہن میں ایک ہی نام بار بار گردش کر رہا تھا۔..... یہ ضرور بریگیڈ تیرملہوترو کا کیا دھرا ہے کیونکہ اب وہ ملہوترو کے لئے

لینے کے لیے ہدایت کی تھی اور حکم دیا تھا کہ جب تک اعلان نہ کیا جائے کوئی اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلے گا۔ بصورت دیگر اس کے جواں باہر آنے والے کو بغیر کسی وارنٹک کے کوئی سے اڑا دیں گے۔

تمام خرب کار کھم کرا پنے بستروں میں دبک گئے تھے۔

ایکسٹرنل کا نظام تو قلیل ہو چکا تھا البتہ انتظامیہ نے ایمر جنسی طور پر اپنے جزیروں سے کچھ نہ کچھ بندوبست کر لیا تھا۔

○ ○ ○

صبح ہو رہی تھی جب یہ ہنگامہ فرو ہوا.....

اسی دوران بریگیڈیئر ملہوترا سمیت ڈیڑھ دو دن سے فوج کی دو تریہ کپنیاں یہاں پہنچ چکی تھیں۔ کرنل بھالیہ کو بریگیڈیئر ملہوترا کے عجب و غریب سوالوں کے جوابات دیتے ہوئے یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی اس کا دماغ فیسے سے پھٹ جائے گا اس کے لئے اپنے آپ پر قابو رکھنا ناممکن ہو رہا تھا۔

پہلے تو ملہوترا کی شکل پر نظر پڑتے ہی اس کا پارہ چڑھ گیا تھا کیونکہ ملہوترا نے اس کا گرجوٹی سے مصافحہ کرتے ہوئے تین چار طرہ پر فقرے اس انداز میں اس کی طرف اچالے تھے جیسے وہ اظہین آری کا تالافق ترین آفیسر ہے اور یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا ہے اور اگر وہ یہاں ہوتا تو شاید اس حادثے سے بچ جاتے۔

کرنل بھالیہ خاموشی سے سر جھکا کر اس کا طرہ برداشت کر رہا تھا جب اردلی نے میجر سودی کی اطلاع دی۔

”بلاؤ۔“

کرنل بھالیہ نہ کہا۔

”خرب کاری ہوئی ہے سر۔“

میجر وکرم سود نے اندر داخل ہونے پر دونوں ایڈیاں بجا کر انہیں احترام دینے کے فوراً بعد ان کی طرف سے کوئی سوال کیے بغیر کہا۔

”.....What.....“

بریگیڈیئر ملہوترا نے قریباً چپختے ہوئے کہا تھا۔

”کیا کہہ رہے ہو وکرم۔“

کرنل بھالیہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”سر..... میں نے دونوں بیروں کی گنتی کی ہے..... کمرہ نمبر ۸ سے دونوں لڑکے سلم

اور طاہر عاقب ہیں جبکہ ان کا تیسرا ساتھی شائق مردہ حالت میں وہاں موجود ہے..... شاید دونوں

نے فرار ہونے سے پہلے اسے گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔“

میجر وکرم سود نے مختصر رپورٹ پیش کی۔

”ڈیم اٹ۔“

ملہوترا کو اس کی بات سن کر اچانک قصداً گیا تھا اس نے اپنے ہاتھ میں پگڑی چھڑی

بڑے زور سے اپنے دانسنے دھری میجر پر ماری تھی.....

”اوہ بھگوان.....؟؟“

بے ساختہ کرنل بھالیہ کے منہ سے نکلا۔

”کسم آن۔“

ملہوترا نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کرنل بھالیہ کو پھاڑ کھانے والے لہجے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

دونوں وکرم کے عاقب میں قریباً بھاگتے ہوئے بیرک کے کمرہ نمبر ۸ تک پہنچے تھے

جہاں ایک چار پائی پر شائق کی دھشت اور لذت سے پھٹی مردہ آنکھیں ان کا منہ چڑھاری تھیں.....

دونوں نے باری باری جبکہ کراس کا جائزہ لیا۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اس کی

موت دم گھٹنے سے واقع ہوئی ہے۔

”لوگوں کے لئے فوراً بریک فاسٹ کا بندوبست کرو..... خبردار ان سے کوئی

بدتمیزی نہ ہونے پائے..... کسی لڑکے سے کوئی انکوائری نہیں کرے گا۔ یہ معاملہ کیچ روٹی والے

خود ہی دیکھیں گے۔ کرنل موٹنگیا تھوڑی دیر تک پہنچ جائیں گے۔ تم خود لوگوں کا خیال رکھو..... لیکن

انہیں یہ بتانا کہ بجلی کے سرکٹ شارت ہونے سے یہ حادثہ ہوا ہے اور ہاں..... کوئی خود سے جان لے

تو الگ بات ہے تم کسی کو نہیں بتاؤ گے کہ یہاں کیا ہوا ہے مشتاق کی موت کی خبر یا دونوں لڑکوں کے غائب ہونے کی خبر کسی کو نہیں ملنی چاہیے۔ میری بات سمجھ گئے ناں..... کسی کو بھی نہیں۔“

اس نے میجر سوڈو کو براہ راست ہدایت دیں۔

کرل بھائیہ پر سکتے کی کیفیت طاری تھی.....

ابھی تک ملہوترہ نے اس کی طرف دیکھنے کا بھی کلف نہیں کیا تھا۔

”ایویٹنس منگواؤ..... اور مشتاق کی لاش یہاں سے لے جاؤ..... مجھے اس

کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کل صبح تک بہر صورت مل جانی چاہیے۔“

اس نے اپنے ساتھ موجود ٹیلیفون سے کہا۔

اور.....

کچھ حریف ہدایات دینے کے بعد وہ ڈیوڑھی کی طرف واپس لوٹ گیا۔ کرل بھائیہ سر

جھکائے اس کے تعاقب میں آ رہا تھا.....

”آئی ایم سوری کرل لیکن میں ڈپلن کو ایک لمبے کے لئے نظر انداز نہیں کر

سکتا..... انکوائری رپورٹ آنے تک تم اپنے آپ کو Suspend سسپنڈ سمجھو.....

البتہ تم انکوائری مکمل ہونے تک دیر وہ دن سے باہر نہیں جا سکتے۔“

آفس میں پہنچتے ہی اس نے کرل بھائیہ کے سر پر تانم کم چلا دیا۔

کرل بھائیہ کو یوں لگا جیسے کسی نے پھلتا ہوا سیسہ اس کے کانوں میں اڑیل دیا

ہو.....

اس کے سارے خواب پکنا چور ہو گئے تھے.....

آج زندگی میں پہلی مرتبہ اسے اپنی ہزیمت کا اتنی شدت سے احساس ہوا تھا۔

”راہب سر.....“

اس نے سنبھل کر ایڑیاں جوڑتے ہوئے ملہوترہ کے حکم پر صاف کیا۔

○ ○ ○

بریگیڈیئر ملہوترہ کو مصروف حال سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں ہوئی اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ

سب کچھ ان دو لوہڑیوں کا کیا دھرا ہے جو کرل بھائیہ کی خصوصی پیشکش تھے.....

اور..... جب کرل بھائیہ کو اس بات کا علم ہوا کہ یہ سارا کیا دھرا طاهر اور سلیم کا ہے تو اس کے بے اختیار اپنا سر پیٹ لیا۔

اس نے اپنی فوجی زندگی کی سب سے بڑی غلطی طاهر کو بنواری کپ میں بلا کر کی تھی۔

یہ کچھ اس نے Out of the way کیا تھا۔

آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اس کپ میں براہ راست کسی سمت سے کوئی ایجنٹ

بھرتی کر کے بھیج دیا جائے۔ یہاں آنے والے عمو نا اس سے پہلے ایک دو کپوں کی یا ترا کر کے

آتے تھے.....

یہ تو اس کا جنون تھا.....

یا پھر..... بریگیڈیئر ملہوترہ کو نچا دکھانے کی ضد جس نے اسے تھاکر کے رکھ دیا۔

اب اس کے پاس سوائے کچھ تھاکر کے اور کچھ نہیں تھا۔

اس نے ساری زندگی بے داغ نگہ رازی تھی.....

لیکن.....

یہ داغ جو اس کے دامن پر لگا تھا اس کی سیاہی اب بریگیڈیئر ملہوترہ اس کے منہ پر لٹنے

جارہا تھا.....

کاش اس نے بنواری کپ کے پروٹوکول ہی کا خیال رکھا ہوتا۔ یہاں کے طے شدہ

اصول و ضوابط ہی کی پابندی کر لی ہوتی۔

اسے ملنے والی رپورٹس کے مطابق سلیم اور طاهر نے فرار ہونے سے پہلے اپنے ساتھی

مشتاق کو لگدبا کر مار ڈالا تھا۔

کرل بھائیہ جانتا تھا کہ مشتاق کو انہوں نے اپنے ”سورس“ کی حیثیت سے ان کے

کمرے میں رکھا ہوا تھا اور کمال کی بات تو یہ تھی کہ وہ دونوں اس حقیقت سے آگاہ تھے.....

ان کی تو بات ہی الگ تھی۔ ان کے کسی اٹلی بیض کو بھی مشتاق کی اصلیت کا علم تھا جس

کے ذریعے انہوں نے اپنے ایجنٹ اپنے ڈسٹن کے ”فیٹ ورک“ میں داخل کئے تھے۔

دل ہی دل میں بے اختیار اس نے اپنے دشمنوں کی منصوبہ بندی پر انہیں خراج تحسین

پیش کیا اور اس سوچ نے اسے لرزہ کر رکھ دیا کہ تنہا ان کے کتنے ایسے ایجنٹ ہیں جو بے نقاب ہو

چکے ہیں اور جن کو بے خبر رکھ کر دشمن اپنی جہتی استعمال کر رہی ہے۔

اچانک اس کے ذہن میں ایک اور خدشے نے سر اٹھایا۔

”کہیں کا مٹی اگر واول کو ان لوگوں نے قابو نہیں کر لیا؟“

ابھی تک اس کی ملاقات کا مٹی سے نہیں ہوئی تھی حالانکہ اسے اس وقت کیمپ میں ہونا

چاہیے تھا۔ مین ممکن تھا کہ وہ ڈیرہ دون چلی گئی ہو۔

اسے یاد آ گیا کہ آج چھٹی کا دن تھا اور کا مٹی حسب معمول ایک روز پہلے ہی شام کو

یہاں سے کہیں اور چلی جایا کرتی تھی۔

یہاں کے بیشتر انسٹرکٹرز کا یہ معمول تھا کہ وہ چھٹی کا دن مزدو کی شہر میں اپنے عزیزوں

کے پاس بسر کیا کرتے تھے وہ اس بات کے پابند تھے کہ اپنی آمد و رفت سے آفس کو مطلع رکھیں

کیونکہ کسی بھی وقت ان سے رابطہ کی ضرورت پیش آ سکتی تھی۔

”کیا کا مٹی معمول کے مطابق اپنی اگلی منزل تک نہ ٹھکانے اور ٹیلی فون نمبر دے کر گئی

ہے۔“ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

اور..... بہت سوچنے کے بعد ہی اسے یاد نہ آیا کہ اگلے روز اس نے کسی بھی رجسٹر

میں کا مٹی سے متعلق کچھ پڑھا ہو۔

ممکن ہے کہ اس نے میجر سوڈا کو اس میں لے کر دیا ہو! کیونکہ وہ کرنل بھائیہ کی جہتی

ہے اور اس کی طرف سے ایک خاص مشن پر کام کر رہی تھی۔

پروٹوکول کے خلاف کرنل بھائیہ نے اس کی ہر ممکن معاضت کی تھی اور اس کی اکثر

مودمنت (Movement) آف دی ریکارڈ ہی رکھی جاتی تھی۔

اچانک ہی ایک دوسرے نے اسے لرزاکر رکھ دیا۔

”کہیں کا مٹی اگر واول تو اس کیل کا حصہ نہیں بن گئی۔“

اگر ایسا ہو گیا ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے کورٹ مارشل سے نہیں بچا سکتی کیونکہ

اس نے پو سوال کی مخالفت کے باوجود کا مٹی اگر واول کو ظاہر کے ”پیش کس“ پر لگا دیا تھا۔

اسے یاد آ گیا کہ جب کا مٹی اگر واول کے پیش کس سے متعلق خبر پو سوال کو ملی تو اس

نے اس پر سخت دلی انکیت (React) کیا تھا اور کرٹل بھائیہ کی طرف سے قائم رہنے کے بعد اپنا احتجاج ریکارڈ پر لانے کے لئے اس کی فائل پر دیر پا کس دیئے تھے۔

کرٹل بھائیہ یہاں کے اصول و ضوابط کے مطابق اس بات کا پابند تھا کہ وہ پولس کے احتجاج کو ریکارڈ پر لانے کی اجازت دیتا۔ اس کی خدمات کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی۔

اپنے پریشان خیالوں میں مگر آدھ آفس کے دوسرے کمرے میں بیٹھا تھا جب اچانک سامنے کا دروازہ کھلا اور بریگیڈیئر ملہو ترہ سیکورٹی کے تین جوانوں کے ساتھ اندر کھس آیا۔

"Your are under arrest"..... (اپنے آپ کو گرفتار سمجھو)

اس نے اندر داخل ہوتے ہی حکمانہ لہجے میں کہا۔

"What کیا؟"

کرٹل بھائیہ نے بڑے عجب سے لہجے میں دریافت کیا۔

"میں کرٹل بھائیہ..... بد قسمتی سے تم گردن تک پھنس چکے ہو..... گردن تک

تمہاری یعنی بنواری کپ سے گل تک کے کپ کا ڈھری اطلاع کے لئے عرض کر دوں گا

کہ کاغذی اگر دال ان دونوں کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔ ایسا سوچا جا رہا ہے کیونکہ وہ بغیر اطلاع کے

غائب ہے اور سب سے بڑی بات کرٹل بھائیہ کو ابھی چند منٹ پہلے اس علاقے میں کل رات سے

مشق پر آنے والی ایس ایس جی (کمانڈو) کے ایک سیکشن کو ایک لاش ملی ہے..... لاش چونکہ کسی

قوی آفیسر کی نظر آ رہی تھی انہوں نے ہمیں اطلاع دینا ضروری سمجھا اور یہاں سے جانے والے

تمہارے ساتھیوں نے لاش کو پہچان لیا ہے۔ جانتے ہو وہ کسی کی لاش ہے؟"

اس نے کرٹل بھائیہ کی آنکھوں میں براہ راست بھاٹکا۔

"بھائیہ حیرانگی سے اس کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا....."

"یکٹیشن پولس کی..... سنا تم نے یکٹیشن پولس کی لاش اور اس کی موت کا کارن ہے

گردن کی ٹوٹی ہوئی ہڈی..... جسم پر تھوڑے کئی نشان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی موت

کس طرح ہوئی ہے..... تم سن رہے ہو نا....."

اس نے اسے نفرت اور غصے سے کھولتے ہوئے کہا۔

اور..... کرٹل بھائیہ کو سانپ موٹھ گیا۔

ملہو ترہ کا کہا ایک ایک لفظ تھوڑے کی طرح مسلسل اس کے سر پر ضرب لگا رہا تھا اسے اپنے سر کے ساتھ ہی سارے وجود کے ترختے کا احساس ہوا۔

یہ احساس عداوت تھا یا احساس شکست..... جو کچھ بھی تھا۔ اس کے لئے بڑی جان لیوا کیفیت بن رہی تھی۔

اسے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔

بریگیڈیئر ملہو ترہ کی آواز دور کی کنویں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

"ڈیم اٹ....."

ملہو ترہ نے غصے سے بھرے ہوئے حسب عادت اپنی پھنری کے سامنے دھری میز پر

زور سے ماری کرٹل بھائیہ کو یوں لگا پیسے کسی نے اس کے دماغ پر تھوڑے سے ضرب لگائی ہو۔

"Arrest him..... مگر قہر کر لیا ہے۔"

اس نے اپنے گارڈ کو حکم دیا۔

اور.....

باہر نکل گیا۔

○ ○ ○

کرٹل بھائیہ نے کسی طرح اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر اپنا سرکاری پستول ان کے

حوالے کیا اور کن قدموں سے چل کر باہر کھڑی جپ تک پہنچا اسے کچھ احساس نہیں ہو رہا تھا۔

بھگوان جانے اس کے بدن میں اتنی جتنی کہاں سے آگئی تھی جس نے اسے اٹھا کر کھڑا

رکھا اور اپنے قدموں پر چلا بھی دیا..... ورنہ کرٹل بھائیہ تو بھی سمجھ رہا تھا کہ اب وہ شاید ساری

زندگی کے لئے اس کرسی سے اٹھ کر اپنے قدموں پر نہیں کھڑا ہو سکے گا۔

اپنے دماغ کے ساتھ ساتھ کرٹل بھائیہ کو اپنے وجود کے مطلوب ہونے کا بھی احساس

ہونے لگا تھا اور وہ یہیں سمجھا تھا کہ شاید اسے اب ہارٹ ایک ہی ہو جائے۔

کسی عرصہ معمول کی طرح چلتا وہ سامنے کھڑی ملٹری پولیس کی جپ میں اگلی سیٹ پر

بیٹھ گیا۔

اس کے ساتھیوں نے بہر حال اس کے احترام کو ملحوظ خاطر رکھا تھا۔

جیپ میں بیٹھنے کے بعد اس نے سوچا کہ جو کچھ بھی ہوا بہت برا تھا لیکن اس میں وہ کسی طرح شامل سمجھا جا رہا ہے؟ پوچھنا کی موت! کائناتی گروہاں کا غائب ہونا! ان سب باتوں سے آخر اس کا کیا تعلق ہے۔؟

اس نے کوئی جرم نہیں کیا۔

اپنے علم کی حد تک اس نے اپنی ذیوائی سے کوتاہی نہیں کی۔

اس کا خمیر مطمئن تھا۔

لیکن..... لمبوترہ نے اسے گرفتار کر دیا۔

اچانک ہی اس کا خون کھولنے لگا۔

اس نے دل ہی دل میں اپنے کینے دشمن کو گالیوں سے نوازا۔ اس سوچ نے سے خاصا حوصلہ دیا تھا۔ اس کا خمیر مطمئن تھا اور یہ سوچ کہ لمبوترہ نے اپنی دشمنی میں آدمی کی عزت کو بھی داؤ پر لگا دیا اسے مضبوط کرنے کے لئے کافی تھی۔

”دیکھو گا..... دیکھو گا تمہیں لمبوترہ..... بنا لو مجھ پر کورٹ مارشل اگر تمہیں دیکھ کر دیا تو میرا نام کرل بھائیہ نہیں ہوگا.....“

اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

شاید اس کی آواز کچھ بلند ہو گئی تھی کیونکہ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے لفٹیننٹ نے کہا تھا۔

”اٹنی پرابلم سر..... Any Problem Sir“

”شٹ اپ“

کرل بھائیہ نے پورے جلال سے کہا اور لفٹیننٹ خاموش ہو رہا۔

○ ○ ○

کرل موٹ گیا یہاں ڈاکٹر پہنچا تھا۔

اس نے گزشتہ سات ماہ سے کوئی چھٹی نہیں کی تھی۔ اپنی چھٹی والے دن بھی وہ ذیوائی پر موجود رہتا کیونکہ وہ یہاں کا سکیورٹی انسپراج تھا اور اپنی خصوصی تربیت اور مزاج کی وجہ سے اس مسئلے پر وہ بہت حساس بھی واقع ہوا تھا۔

آج تک اس کمپ میں ایک بھی ایسا ایجنٹ نہیں آیا تھا جسے سرحد سے وصول کرنے کے

لیج وہ خود یہاں تک نہ لایا ہو۔

وہ ہر ایجنٹ کے ساتھ طویل سفر کیٹین چکروٹی کی حیثیت سے طے کیا کرتا تھا۔

اس کے تجربے نے اسے بتایا تھا کہ سفر کا ساتھ اپنے ہم سفر کی بہت سی خوبیوں اور خامیوں کا آشکار کر دیا کرتا تھا۔

اور..... ایسا ہی ہوا۔

اس نے یہاں موجود ہرزہ زور بیت تحریب کا دکھل ہائیڈرٹا اپنے کمپیوٹر میں ریکارڈ کیا ہوا تھا۔

یہ اس کی عادت تھی کہ ایجنٹ کو حاصل کردہ مقام سے کمپ میں پہنچانے کے بعد وہ اپنے ٹیل بوتے پر اس سے حاصل کردے معلومات کی بنیاد پر اس سے متعلق اپنے تمام تر ریمارکس اس کی فائل کے ساتھ اپنے کمپیوٹر کی یادداشت کو منتقل کر دیا کرتا تھا۔

حیرت کی بات تو یہ تھی کہ ان دونوں لڑکوں سے متعلق ابھی تک اسے کوئی شک بھی نہیں ہوا تھا۔

اسے بتایا گیا تھا کہ طاہر براہ راست اس کمپ میں آ رہا ہے اور ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا لیکن وہ طاہر سے متعلق مطمئن تھا۔

اگر وہ منفی رپورٹ لکھ دیتا تو طاہر کو یہاں مٹھنے سے پہلے گولی مار دی جاتی کیونکہ یہاں یہ سمجھا جاتا تھا کہ ہزاری کسی کی دیواروں میں ہوا اور دھوپ بھی کرل مونیکا کی مرضی کے بغیر داخل نہیں کی گئی۔

روزانہ انسٹرکٹرز کی طرف سے اپنے اپنے زیر تربیت تحریب کار سے متعلق کھجے جانے والے ریمارکس کا وہ بغور جائزہ لینے کے بعد اپنے مطلب کا ہر ریمارکس متعلقہ ایجنٹ سے متعلق اپنے پاس کمپیوٹر میں موجود معلومات میں شامل کر لیا کرتا تھا۔

اس کی بد قسمتی تھی کہ وہ اگلے روز تقریباً چھ ماہ بعد سہارنپور گیا کیونکہ اس کے چاتے بغیر ایک خاندانی مسئلہ کسی مل نہ ہو پاتا۔

سہارنپور اس نے رات بمشکل قیام کیا تھا اور ایک فوجی پہلی کاپڑ میں جوڑے دو دن آ رہا تھا صبح سات بجے تک پہنچ گیا تھا۔

اس کا تعلق آری ایوایشن سے تھا اس لئے بیلی کا پٹر کی سہولت اسے حاصل رہتی تھی۔ یہاں سے اس نے جیب کے ذریعے واپس جانا تھا جو وہ اگلے روز یہاں چھوڑ گیا تھا کیونکہ بیواری کیپ سے متعلق خبر اسے یہاں ڈیرہ دون میں ملی تھی جب اسے علم ہوا کہ رات کرل بھائیہ کو بھی افزا تفری میں واپس جانا پڑا اور..... بریگیڈئیر ملہوترا کے اس سے متعلق سٹینڈنگ آرڈرز بھی ہیں کہ جیسے ہی وہ وہاں پہنچے فوراً رابطہ قائم کرے۔

شاید ان لوگوں کا سہارا یہی تھا کہ رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔

کرل مونگیا نے دل ہی دل میں ایک سوئی سی گالی سہارنپور ٹیلی فون آپیکسنگ کو دی جس کی مہربانی سے آکٹر اس کی بہن کے کمر کا فون خراب رہتا تھا اور اسی فون پر ان لوگوں نے رابطہ کی کوشش کی ہوگی۔

ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس نے بریگیڈئیر ملہوترا سے رابطہ کیا۔ اسے حیرانی بھی ہو رہی تھی کہ ملہوترا کہاں سے آگیا وہ تو رخصت پر تھا۔

”معاملہ خاصا سیریس لگتا ہے۔“

یہی سوچ کر اس نے لائن ملائی تو دوسری طرف رابطہ ہونے پر ملہوترا نے مختصر الفاظ میں یہاں لوٹنے والی قیامت کا احوال سنایا۔

”اور مائی گاڈ“

فون پر بمشکل یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلے تھے۔

”am coming اسر!“

اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

جیب وہ خود چلا رہا تھا ڈرامیور کو اس نے جھپٹی سیٹ پر بٹھا رکھا تھا اور سارے راستے ڈرامیور ”ہنومان چالیسیہ“ (خوف کی حالت میں بڑے جانے والے آشوک) پڑھتا آیا تھا۔

یہاں پہنچتے پر اسے بمشکل یقین آیا تھا کہ وہ زندہ ہے ورنہ تو ہر لمحے اسے موت کا دھڑکا لگا رہا تھا۔ وہ خود بڑا سارٹ ڈرامیور تھا اگر عام قسم کا ہوتا تو کرل مونگیا اس کی جانے کب کی چھٹی کروا چکا ہوتا۔

لیکن..... رام رام..... اس نے کان چھوتے ہوئے کہا۔

ایسی خطرناک ڈرامیونگ اس نے انگریزی فلموں میں نہیں دیکھی تھی۔ اس سے پہلے تو وہ فلموں کی اس ڈرامیونگ کو کیسے کرکمال ہی سمجھا کرتا تھا۔

لیکن..... آج اسے یقین آگیا تھا کہ واقعی ایسا ہوتا بھی ہوگا۔

بریگیڈئیر ملہوترا سے ساری صورت حال کی بریٹنگ لینے میں اسے بمشکل چندرہ میں منٹ گئے تھے اور دس منٹ اس نے کسپ کی تباہ کن حالت کا جائزہ لینے میں گزارے تھے۔

اب وہ اگلے اقدام کی تیاری کر رہا تھا۔

قریباً آدھا گھنٹہ بعد وہ اپنے پانچ بہترین اور قابل اعتماد ساتھیوں کے ساتھ جو سیولین لباس میں تھے۔ وہ گاڑیوں میں کسپ سے باہر جا رہا تھا۔

ڈیرہ دون سے باہر جانے والی سڑک کے اسی سنگ میل پر جہاں سے دوسڑکیں متضاد سمتوں پر بھڑکی تھیں وہ روک گئے۔

اپنے پانچوں ساتھیوں کو اس نے ایک گاڑی میں خصوصی ہدایات کے تحت مسوری روانہ کر دیا اور خود وہیں کھڑا رہا۔

جیسے ہی کار اس کی نظروں سے اوجھل ہوئی دوسری کار میں وہ ”پونٹا صاحب“ کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس کی منزل نامعلوم تھی۔

اس کے ساتھیوں اور افسران کو یہیں علم تھا کہ وہ مسوری جا رہا ہے لیکن ”پونٹا صاحب“ کی طرف جانے کا فیصلہ اس نے بیواری پر ہی کر لیا تھا۔

یہ الگ بات کہ اسے آخری لمحے تک اسے خفیہ رکھنا تھا۔

یہ اس کی تربیت تھی۔

وہ تمام حالات میں کسی پر اعتبار یا اعتمادہ قائل نہیں تھا یہ تو خصوصی حالات تھے۔

○ ○ ○

پونٹا صاحب سکھوں کا بڑا گورو درہ اور بڑی ہی لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ یہاں بھارت کے کوئے کوئے سے سکھ پاتری آیا کرتے تھے اس لئے سارا سال ہی یہاں میلے کا سماں رہتا تھا۔

دونوں کا رخ گردوارے کی طرف تھا۔

کاشمی نے اس دوران بخوبی اندازہ کر لیا تھا کہ دراصل بخارا سے نہیں بلکہ طاہر کو چڑھا ہے۔ جب تک کاشمی کا شیر پتھر نازل نہیں ہو گیا وہ پریشان رہا۔ خدا جانے اس نے کون سی اپنی بانیوں کے کھائے تھے جنہوں نے کاشمی کی بخارا سے جان چھڑا دی تھی۔

لیکن..... کمزوری خود کرائی تھی۔

”میرا نام ترمیم سنگھ ہے..... اور تم میری نو بیاہتا چچی کاشمی.....“

اس نے چلتے چلتے کاشمی کے کان میں سرگوشی کی۔

کاشمی نے ٹھٹھک کر اس کی طرف دیکھا اور بے اختیار مسکرا دی۔

اس کی اداس اور جان لیوا مسکراہٹ نے ایک مرتبہ تو طاہر کو ہلا کر رکھ دیا تھا وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ اس وقت کاشمی کس ان دیکھی آگ کا اندھن بنی ہوئی ہے۔ اس کے اندر کون سی جنگ جاری ہے اور کس شدت کی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے وہ.....!!

اس کا جی چاہتا تھا کاشمی کی اداسی ختم ہو جائے.....

وہ چاہتا تھا کہ کاشمی کے اندر پھونسنے والا درد اس کے ساتھ شیر کرے.....

لیکن..... بہت کچھ چاہنے کے باوجود وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا.....

اس نے اب تک کاشمی سے کتنی ہی مرتبہ پوچھ لیا تھا۔

”کاشمی تمہارے دل پر کوئی بوجھ تو نہیں!.....“

”تمہارا خیر نہیں ملامت تو نہیں کر رہا!.....“

”کہیں ایسا تو نہیں کہ تم صرف میرے لئے یہ سب کچھ کر رہی ہو..... تمہاری اپنی مرضی

اس میں شامل نہیں ہے.....“

لیکن.....

کاشمی نے ہمیشہ اس کی بات ٹال دی۔

اس نے طاہر سے تھوڑی دیر پہلے ہی کہا تھا۔

”طاہر..... میں غلامی پسند نہیں کرتی۔ خلاف فطرت کوئی شے مجھ پر اثر انداز ہو ہی

نہیں سکتی۔ میں اپنی نیچر میں ایسی ہوں کہ زبردستی کوئی کام نہ میں کر سکتی ہوں نہ کوئی مجھ سے کروا سکتا

ہے..... مجھ پر کچھ لاگو یا نافذ نہیں کیا جاسکتا..... تم اسے میری کمزوری ہی سمجھ لو..... لیکن یہ حقیقت ہے..... مجھے تو آج تک اس بات کی سمجھ نہیں آ رہی کہ میں نے تین سال تک یہ نوکری کس طرح کی..... بس میرے لاشعور میں بچپن ہی سے اپنے دھرم اور تہذیبی رواج کے متعلق جو بات بیٹھ گئی تھی..... ہمیشہ ٹھہری رہی..... میں نے بھی اپنے دھرم کو اپنے سماج کو..... اس کے رنجی رواج کو دل سے قبول ہی نہیں کیا..... میرے پاس کوئی ایسا پناہ تو نہیں ہے جس میں ٹاپ تول کر تم میری بات کا یقین کر سکو..... لیکن یہ خیال بھی کبھی دل میں نہ لانا کہ میں معاشرتی مذہبی یا کسی اور قسم کے دباؤ کے تحت تمہارے ساتھ جا رہی ہوں..... ایسا میں نے اپنی مرضی سے اور بہت سوچ بچار کے بعد کیا ہے..... اگر کبھی یہ کچھ ثابت کرنے کا وقت آ گیا تو میں تمہیں یہ ثابت کر کے دکھا دوں گی.....“

○ ○ ○

طاہر کو کاشمی کی ان باتوں سے بہت حوصلہ ہوتا تھا۔ وہ یہ جاننے لگا تھا کہ قدرت شاید ابھی تک اس کے سیریز کا امتحان لے رہی تھی کہ اس کے اندر سچائی کے لئے پیدا ہونے والی طلب کہیں وقتی تو نہیں.....

اور..... جب وہ اپنے امتحان میں پوری اتاری تو قدرت نے اسے طاہر سے کرا

دیا.....

”میرے خیال سے ہمیں اب اپنا حلیہ تبدیل کر لینا چاہیے.....“

اس نے طاہر سے کہا۔

”اوہ ہاں.....“

طاہر کہیں اور سوچوں میں گم تھا۔

دونوں نے اپنے کیروی لباسوں سے نجات حاصل اور اگلے چند منٹ بعد طاہر نے اس کی

مدد سے اپنے سر پر بستری رنگ کی کپڑی اس صفائی سے باندھی تھی جیسے وہ نسل در نسل سرداروں کی اولاد رہا

ہو.....

کاشمی اس کی طرف دیکھ کر بے اختیار مسکرائی۔

بڑھی ہوئی داڑھی اور کپڑی کے ساتھ اب وہ مکمل سکھ کے روپ میں اس کے سامنے

موجود تھا۔

خوبیوں کا مالک بھی تھا۔ یقیناً اس نے بھی طاہر کے فرار کو اپنے لئے خلیج بنالیا ہوگا۔
 کا منی اگر وہاں اعزاز کر سکتی تھی کہ طاہر کے ساتھ اس کی موجودگی کا کیا مطلب لیا
 جائے گا؟ اور یہ کوارڈر کو جب زیرِ پتختی ہوگی تو ہاں کیا قیامت نہیں آگئی ہوگی۔
 وہ خود پتختی اچھی طرح نہیں بول سکتی تھی۔ لیکن سمجھ سکتی تھی جبکہ طاہر کو پتختی بولنے
 دیکھ کر اسے یوں لگا جیسے وہ ان ہی میں سے کوئی ہو۔ اس سے پہلے وہ دونوں آپس میں ہندی اور
 انگریزی بولتے آئے تھے جب وہ طاہر کو بولی کا باشندہ سمجھ رہی تھی۔
 دل ہی دل میں اس نے طاہر کی تربیت کرنے والوں کو داد دی وہ خود کو بہترین پروفیشنل
 ثابت کرتے آ رہا تھا۔

دونوں بہت سے دوسرے یا تریوں کی بھیڑ سے گزر رہے تھے جب اچانک ہی ان کے ساتھ چلتی ہوئی ایک بوڑھی عورت لڑکھرائی۔

ہیسن..... اس سے پہلے کہ وہ زمین پر گر کر تباہ ہونے سے اپنے بازوؤں میں تمام لڑکھرائی ایکشن میں بھیڑ سے نکال کر ایک کونے میں بڑے سے درخت کے نیچے لے آیا۔

بوڑھی عورت کا جوان بیٹا بھی اس کے ساتھ ہی چلا آیا تھا۔

ظاہر ہے عورت کو فرش پر لٹا دیا۔ وہ ہوش میں ہی تھی تو دھن لے لے سانس لے کر ابھی بیٹھی۔

”دھنوادویری“

اس کے تعاقب میں آنے والے نوجوان نے کہا۔

”کیا ہوا تھا ماں جی کو“

ظاہر نے سوال کیا۔

”بس چکر سا آ گیا تھا..... میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔“

یوڑھی عورت نے کہا۔

نوجوان جو اس کا بیٹا تھا اس نے اپنا تعارف نوجوت سنگھ کے نام سے کروایا طاہر نے اسے اپنا نام ترسیم سنگھ بتایا تھا۔

نوجوان اپنی ماں کے لئے کولڈ ڈرنکس لینے چلا گیا تھا اسی اثناء میں بوڑھی عورت نے

”اگر تم اپنی داڑھی نہ منڈواؤ اور چوڑی باندھے رکھو تو شاید میرے لئے بھی تمہاری سچائی مشکل ہو جائے۔“

کامنی نے کہا۔

“واقعی”

ظاہر نے اس کی طرف دوپٹہ اور چادر بڑھاتے ہوئے کہا کیونکہ اسے بھی اب ایک سکھ عورت کے روپ میں سڑ کر رہا تھا۔

اب دونوں نو بیاہتا حکم میاں بیوی کے روپ میں گردوارے کی طرف جا رہے تھے۔ جہاں پہلے ہی سے سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں ملک کے مختلف کونوں سے آئے ہوئے مسکلم موجود تھے۔

گمروارے کی سرائے میں کمرہ حاصل کرنا کاردار دقہا کیونکہ یہاں کے کمرے عموماً بیکر رہتے تھے اور یا تری بھی ہوٹوں کے بجائے یہاں ٹھہرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ ”بہت رش ہے یہاں۔ کمرے کا حصول مسئلہ بن جائے گا اور ہوٹل میں ٹھہرنا مناسب نہیں۔۔۔“

علت علیہ طاہر نے عندیہ ظاہر کیا۔

”فکر نہیں..... کچھ بندوبست ہو جائے گا۔“

کامنی نے پر یقین لہجے میں جواب دیا۔

وہ جانتی تھی ان کا یہاں ایک دور و زہر مہاجر دوری تھا۔ طاہر کی طرح وہ خود بھی اٹلی میں
 کی تربیت یافتہ تھی۔ وہ جانتی تھی طاہر نے فرار کا سب سے خطرناک حربہ
 Deception (دھوکہ) استعمال کیا ہے۔

”را“ کا ”کلائنر سیل“ جب ان کے نقاب میں ارد گرد کے شہروں کی خاک چھان رہا
 دگاتو وہ یہاں ”را“ کی مین ہاک کے نیچے محفوظ بیٹھے تھے۔

یہاں..... اس کے نتائج مختلف بھی نکل سکتے تھے۔

بہر حال یہ دعوے کی چال تھی جو ظاہر اب تک کامیابی سے چل رہا تھا۔ اب اس کا دور نزل کا مقابلہ تھا جو "ایس ایس جی" کے اسی کپ کا سیکورٹی انچارج ہی نہیں بہت سے دیگر اضافی

جس کے چہرے پر بزرگی کے ساتھ ساتھ ایک عجیب طرح کا نور اور بے بسی بھی موجود تھی ان دونوں سے ہاتھ شروع کر دیں۔

ظاہر نے اسے پہلے سے تیار شدہ Cover Story سنا دی اور بتایا کہ اس کا والد امرتسر کا رہنے والا اور ماں بھی پنجاب کی ہے جبکہ وہ سہارنپور (یو پی) میں پیدا ہوا اور ایک بزنس میں ہے۔

کاشی اگر وال کا تعارف اس نے اپنی جتنی (بیوی) کی حیثیت سے کروایا تھا اور بتایا تھا کہ دونوں کی چونکہ محبت کی شادی ہے اور رستم سنگھ نے منت مان رکھی تھی کہ اگر ان کی شادی ہوگی تو وہ "پوٹا صاحب" اپنی جتنی کے ساتھ جا کر "مٹھائیے" گا اور اب وہ اپنی منت ہی پوری کرنے آئے تھے۔

بوزی عورت نے اپنا نام سردار اس بتایا تھا۔ اور ظاہر نے ان تھا کہ اس نے اپنے نام کے ساتھ "کوڑ" کا لفظ کیوں نہیں لگا جو تمام سکھ عورتیں لگاتی ہیں پھر وہ خود ہی یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ جیسے کاشی اگر وال کا تعلق کھتری گھرانے سے ہے اور وہ اسی کی بیوی بن چکی ہے ممکن ہے اصر بھی کوئی ایسا ہی مسئلہ رہا ہو۔

لیکن اس کا تجسس بڑھنے لگا تھا۔

اسی اثناء میں فوجت سنگھ چھ سات ٹن سوٹ ڈرنکس کے لے آیا تھا اور اس نے دونوں کے انکار کرنے کے باوجود ایک ایک ڈینا نہیں تمنا دیا تھا۔

"ماں جی اپنی بات کی بڑی بچی ہیں..... میں نے کہا تھا کہ صحت ٹھیک ہو لے پھر چلیں گے لیکن....."

اس نے اپنی بات ادھر ہی چھوڑ دی۔

"بیٹا اس کا باپ دو ماہ پہلے سورمہاں ہو گیا..... کاش وہ زندہ ہوتا تم اسے ملے تو..... اس کی خواہش تھی پوٹا صاحب آنے کی..... میرا سن اس کے بعد سے نکلا نہیں....."

اب آگئی ہوں اس طرح اس کی آتما کو شانتی تو مل جائے گی.....

اس نے اپنی بات کے خاتمے پر ایک لمبی آہ بھری۔

فوجت سنگھ بھی کچھ اداس ہو گیا تھا۔

"یہ میرا سب سے چھوٹا بچہ ہے..... دو اور وہاں اپنے بزنس میں مصروف رہتے ہیں۔ اسے کالج سے چھٹیاں کروا کے لائی ہوں..... تین چار دن کی بات ہے..... ہم نے اس کے باپ کا "اکھنڈ صاحب کا بھوس" رکھنا ہے پھر ملے جائیں گے....."

اس نے کاشی اور ظاہر سے کہا۔

ظاہر نے محسوس کیا تھا کہ اس بوزی عورت میں ضرور کوئی ایسی بات ہے جس کی وجہ سے اس کی چھٹی حس بار بار اسے چونکا رہی تھی.....

"آئیے سرائے میں چلتے ہیں۔"

فوجت سنگھ نے کہا۔

"لیکن ہمارے پاس تو دیرینی کر رہی نہیں ہے..... ہم کہاں رہیں گے۔"

کاشی اگر وال نے فوجت سے کہا۔

"کوئی بات نہیں بچہ..... ہمارے پاس ہے..... ہم نے کل ہی بک کر دیا ہے۔ رب بیڑہ غرق کرے ان جھوٹے سیداروں کا داگورو کے گھر میں بھی رشوت لے کے کام کرتے ہیں..... مجھے تو پتہ نہیں تھا وہ تو اس فوجت نے جانے انہیں کتنے پیسے دے کر کر لیا ہے۔"

بوزی عورت نے کہا۔

"اوہ ماں جی..... آپ کو کتنی مرتبہ کہا ہے چٹانہ کیا کریں۔ یہ بھارت دیش ہے یہاں پیسے سے بھگوان بھی مل جاتا ہے..... آپ کمرے کی کیا بات کرتے ہیں....."

فوجت سنگھ نے اپنی اس کا بازو پکڑ کر کہا پھر وہ ان سے مخاطب ہوا۔

"آپ چٹانہ کریں دیرینی..... ہمارے کمرے میں نوں آ دی رہ سکتے ہیں..... چار پانچ میٹرز وہاں فالو رکھو لے تھے میں نے..... کوئی اپنا یا ربیلی مل جاتا ہے ہاں..... دیکھئے داگورو نے آپ کو ملا دیا۔"

○ ○ ○

دونوں نے دل ہی دل میں اللہ کا لاکھ شکر ادا کیا اور اب دونوں ماں بیٹے کے ساتھ چلتے سرائے میں ان کے کمرے تک آ گئے۔

واقعی یہ سرائے کے بہترین کمروں میں سے ایک تھا۔ انچہ ہاتھ روم کے ساتھ بالکل کسی

وہ تو اپنی تربیت کے مطابق آئندہ کے لئے بھی اونٹ کی طرح اپنے معدے میں اناج بند کر رہا تھا جن حالات سے وہ گزر رہے تھے ان میں جانے دو بارہ کیا کھانا نصیب ہوگا جبکہ کاٹنی بددلی سے اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

”کھاپتر..... تو کیوں نہیں کھاتی۔“

سردار ان نے بھی شاید اسے نوٹ کیا تھا۔

”کھاؤ بھر جانی جی..... کھاؤ..... بے فکر رہنا یہاں اپنا ہی راج ہے۔“

نوجوت سنگھ نے جو طاہر کے مقابلے پر ڈچا ہوا تھا اپنی ماں کی ہاں میں ہاں ملائی۔

کاٹنی مسکرا کر رہ گئی۔

اس کی اداس مسکراہٹ نے طاہر کو ایک مرتبہ پھر کاٹ کر رکھ دیا تھا۔

”دراصل اس کی طبیعت رات سے کچھ خراب ہے..... آپ فکر نہ کریں۔“

o o o

تھوڑی دیر بعد وہ گوردوارے میں جانے کی تیاری کر رہے تھے..... !!

طاہر نے احتیاطاً کاٹنی اگر وال کا ٹیپر پچر دیکھنا چاہا تھا اور وہ یہ جان کر پھر پریشان ہو گیا

تھا کہ کاٹنی کو بخارا رہا تھا..... اس حالت میں اسے گوردوارے میں لے جانا خطرے سے خالی

نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی دانست میں فرار کا وہ راست اختیار کیا تھا جس پر کسی کی نظر کم ہی جاتی لیکن

یہ بھی تو ممکن تھا کہ وہ لوگ اس امکان پر ہی نظر رکھے ہوئے ہوں.....

”ماں جی میری جتنی طبیعت خراب ہو رہی ہے..... اسے یہیں چھوڑنا پڑے گا۔“

یا پھر نوجوت تو ذرا ہمت کر لے پہلے مجھے یہ دو انیمال تو لا دے۔“

اس نے ایک کانڈ پر کچھ گولیاں اور انجکشن گتھ کر دیئے۔

”دیر جی آپ کیا ڈاکٹر بھی ہو.....“

اس نے سنے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”تھوڑا بہت..... میں نے ایم بی بی ایس کے دو سال مکمل کر لئے تھے..... لیکن

پھر پڑھائی کی وجہ سے شادی ہو گئی۔“

طاہر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کمال کی بات ہے..... میں ابھی لایا.....“

اس نے طاہر کے اپنی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کیا جس میں موسو کے تین

نوٹ موجود تھے..... اور طاہر کے پکارنے پر کان دھرے بغیر باہر چلا گیا۔

”آپ پریشان نہ ہوں..... میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔“

کاٹنی اگر وال کو طاہر کی پریشانی کھائے جا رہی تھی۔

”جہیں ٹھیک ہوتا ہوگا کاٹنی..... میں تمہیں خراب ہونے ہی نہیں دوں گا۔“

اس نے کاٹنی کے سر اپنے زانو پر رکھتے ہوئے اسے دباؤ شروع کر دیا۔

”تم بہت قسمت والی ہو بیٹی..... ایسا جی دا گورو سب کو دے۔“

یو جی عورت طاہر کے جذبہ خدمت سے بہت متاثر دکھائی دے رہی تھی۔

”میں قسمت والی ہوں ناں ماں جی.....“

کاٹنی اگر وال نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

اور..... طاہر کو یوں لگا جیسے کسی نے پوری قوت سے اس کے دل پر گھونسا مار دیا ہو۔

یو جی عورت نے آگے بڑھ کر کاٹنی کے بدن پر ہاتھ پھیرا اور طاہر حیران رہ گیا۔

وہ قرآنی آیات پڑھ رہی تھی۔

کاٹنی کی حیرانی طاہر سے بھی دو چاند تھی۔

آہستہ آہستہ کچھ قرآنی آیات پڑھ کر اس نے کاٹنی پر پھونک ماری اور کہا۔

”رب نے چاہا تو میں تو تھوڑی دیر بعد ہی ٹھیک ہو جائی گی۔“

دونوں حیرانگی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دونوں نے نوٹ کیا کہ جب وہ قرآنی

آیات پڑھی رہی تھی تو ایک خاص قسم کی چمک اس کی آنکھوں میں اتر آئی تھی۔

”ماں جی آپ کیا پڑھ رہی تھیں؟“

طاہر نے نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ لیا۔

”یشیا رب کا کلام پڑھ رہی تھی..... اس کی ”بانی“ (کلام) کسی بھی زبان میں پڑھو

اپنا اثر تو ضرور دکھائی ہے؟.....“

سردار ان نے بڑے اطمینان سے کہا۔

دونوں ابھی تک حیرانگی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ طاہر کو کچھ کچھ سمجھ آ رہی تھی اور کاشی کو واقعی قدرے اطمینان سے محسوس ہونے لگا تھا۔

ابھی وہ کوئی گلاسوال کرنے ہی والے تھے جب نوجوت سنگھ دوائیوں کا لفاظی لیے اندر داخل ہوا۔

”آپ شاید میری بات کو عجیب سمجھیں کیونکہ آپ پڑھے لکھے گئے ہیں لیکن میں اس سے اگر دم کروا لو تو ضرور آرام آ جائے گا۔۔۔۔۔ ہمارے تو سارے گاؤں میں میں اس جی کا دم مشہور ہے۔۔۔۔۔ قرآن شریف پڑھ کر دم کرتی ہیں اور بیماری بھاگ جاتی ہے۔“

اس نے دونوں کی کوئی بات سننے سے پہلے ہی کہا۔

”ہیں علم ہے۔۔۔۔۔“

کاشی نے آہستہ سے کہا۔

دونوں کے دیکھتے دیکھتے طاہر نے پہلے ایک آنکھیں تیار کیا اور اتنی مہارت سے کاشی کو لگایا کہ اسے ایک لمبے کے لئے بھی تکلیف کا احساس نہیں ہوا۔۔۔۔۔

کاشی کو ہر قدم پر طاہر کا نیا روپ دیکھنے کو مل رہا تھا۔

نہیں گولیاں اس نے اب تک اس قسم کی کاشی کو کھلا نہیں اور اسے آرام کرنے کی تلقین کرتے ہوئے لٹا دیا حالانکہ کاشی ساتھ جانے کو ہنستی۔

”بھئی ٹھیک کہتا ہے تیرم۔ تم آرام کرو۔ میں بھی یہاں ہوں تمہارے پاس۔ شام کو سکھ مٹی (سکھوں کی مقدس کتاب گورو گرنتھ صاحب کے ایک اشلوک کا نام ہے) (صاحب کا ہاتھ (ملاوت) کرتا ہے۔ شام کو ارداس (دعا) کر لینا۔۔۔۔۔“

سرور راں نے کہا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔“

کاشی نے طاہر کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تم دونوں چلو۔ ابھی رول“ (مسلل اشلوک پڑھنے کو کہتے ہیں) ہو رہا ہو گا۔

میں ۱۱ بجے تک ارداس میں آ جاؤں گی۔۔۔۔۔“

بوڑھی عورت نے کہا دونوں سے کہا۔

”اجھا ماں جی“

نوجوت سنگھ نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

”Take care۔۔۔۔۔ اپنا خیال رکھنا۔“

طاہر کو اپنی پشت پر کاشی کی آواز سنائی دی۔

○ ○ ○

دونوں ایک دوسرے سے بے تکلفی سے باتیں کرتے گورو دوارے کی طرف جا رہے تھے۔ گورو دوارے کی بڑے دروازے پر انہوں نے اپنی جوتیاں اتار کر ٹوکن حاصل کیا اور سنگھے پاؤں اندر آ گئے۔۔۔۔۔

پوٹنا صاحب گورو دوارے کے محن میں دونوں پانی کے تالاب کے مین درمیان بنے اس راستے پر چل رہے تھے جو سنگ مرمر کے پتھروں سے سجایا گیا تھا۔۔۔۔۔ یہاں سینکڑوں یا تری آ جا رہے تھے۔ ان میں سکھوں کے ساتھ ساتھ دوسرے دھرم کے لوگ بھی شامل تھے۔

گورو دوارے میں داخل ہونے پر سب سے پہلے نوجوت سنگھ نے نشان صاحب (سکھوں کا مقدس جینڈا) کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔

وہ چونکہ طاہر کے آگے آگے چل رہا تھا اس لیے طاہر بار بار اس کی طرح پرنام کرنے سے محفوظ رہا۔ البتہ گورو دوارے کے مین ہال میں اسے بھی نوجوت سنگھ کی طرح گورو گرنتھ صاحب کے سامنے کچھ پیچھے ہٹ کر ”مٹا کھینا“ پڑا کر دوالاں کے چارہ نہیں تھا۔۔۔۔۔

دونوں اب بڑے ہال میں پہلے سے موجود بڑاڑوں یا تریوں کے درمیان جگہ بنا کر بیٹھ گئے۔

مرگتھی باری باری اشلوک پڑھ رہے تھے۔ اور طاہر کا ذہن مسلسل نوجوت سنگھ کی بوڑھی ماں میں اٹکا ہوا تھا۔ اس نے قرآن کی جو آیات پڑھیں تھیں۔ تلاوت کا لہجہ تیار ہوا تھا کہ وہ سکھ عورت نہیں۔۔۔۔۔

پھر وہ کون ہے؟

شاید ان بدقسمت مسلمان عورتوں میں سے ایک جو تقسیم ہند پر غور کر لی گئی تھیں۔

اسے فی الوقت اپنے سوال کا ایک ہی جواب مل رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے ذہن سے یہ

خیال جھٹک دیا اب وہ کامنی اگر وال سے متعلق سوچنے لگا تھا۔ اس نے اپنی دانست میں تو کامنی کو بہترین ڈونڈی تھی اور امید بھی تھی کہ اب وہ صحت مند ہو جائے گی۔

لیکن..... ایک سوچ بار بار اسے کچھ کے دے رہی تھی کہ کامنی اگر وال کے ساتھ کہیں وہ کسی زیادتی کا مرتکب تو نہیں ہو رہا..... پھر وہ اسے کامنی کی گفتگو اور اس کا لہجہ یاد آتا تو اپنے اس خیال پر شرمندگی ہوتی کہ اس نے اس عظیم لڑکی سے متعلق ایسا سوچا ہی کیوں ہے؟ وہ تو اس کی سوچ سے بھی زیادہ عظیم تھی.....

بات کچھ بھی رہی ہو..... اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اپنی مستقبل کی پلاننگ میں وہ اپنے اس منہ بولی ماں کو شامل کر سکتا ہے اسے امید تھی کہ شاید وہ اس کی کچھ مدد کر سکے۔

یہاں ہر نوادہ پہلے سے ہی قطار میں کھڑا ہو جاتا تھا اور اپنی باری آنے پر ”گورو گرنتھ صاحب“ کو ”سین فوائے“ (سر جھکانے) کے بعد پھر کسی مناسب جگہ بیٹھ کر کیڑن سننے لگا..... کیڑن شروع ہو گیا تھا.....

اپنی پرسوز آوازوں میں ہارمونیسم بجاتے ہوئے سردار صاحبان اپنے نمبر ہی گیت گارہے تھے۔

دونوں ایسی جگہ بیٹھے تھے جہاں سے ”گورو گرنتھ صاحب“ کی پا لکی دکھائی دے رہی تھی۔

ظاہر کبھی کبھی سننے آنے والوں کو گورو گرنتھ صاحب کے سامنے سر جھکا دینے لگتا۔ اس وقت بھی اس نے غیر ارادی طور پر گردن گھمائی تھی جب اسے ایک سکھ کے پیچھے قطار میں سر پر بسنتی رنگ کا بڑا سا درمال باندھے ٹیپٹن پکڑتی کھڑا دکھائی دیا۔

اس نے دو تین مرتبہ آنکھیں جھپکا کر شاید یہ تصدیق کرنا چاہی تھی کہ کہیں وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا؟

لیکن..... جلد ہی اسے تصدیق مل گئی کہ یہ خواب نہیں بلکہ آج کی سب سے تلخ سچائی تھی کہ وہ پکڑوتی کے ساتھ زیادہ نہیں رہا تھا لیکن وہ زندگی میں ایک مرتبہ اپنے ساتھ ملنے والی کسی بھی اہم شخصیت کی شناخت پر مشکل ہی سے دھوکہ کھاتا تھا۔

”تو تم بلا غریباں بھی آہی گئے۔“

اس نے لمبی سانس لے کر دل ہی دل میں کہا اور اٹھ کھڑا ہوا کیونکہ ”ارواس“ شروع ہونے والی تھی۔

گر تھی کی آواز گورو دارے کے بڑے ہال میں گونج رہی تھی اور چاروں طرف مکمل سکوت طاری تھا پھر اس کی آواز سے آواز ملا کہ سب نے گانا شروع کر دیا۔ طاہر کو یہ سب کچھ تو زبانی حلقہ نہیں تھا لیکن پھر بھی بہت کچھ یاد ضرور تھا۔

اس نے فوجت سنگھ کو ایک لمحے کے لئے بھی احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ ان رسومات سے انہی ہے.....

اس دوران اس کی انٹریں بے چینی سے پکڑتی کے تعاقب میں لگی رہیں لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر جاری نہ رہا کیونکہ پکڑوتی اب بھیڑ کا حصہ بن چکا تھا۔ اس ہال میں ہزاروں لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔

ایک کونے میں کچھ گورتیں بیٹھی تھیں جبکہ مردارے گورو دارے میں بیٹھے ہوئے تھے اور رش کا یہ عالم تھا کہ یہاں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔

دونوں نے ارواس کے خاتمے پر بڑی زوردار آواز میں ”جے کارہ“ بلند کیا تھا۔

اب بھیڑ میں کچھ بے چینی کے آثار دکھائی دینے لگے تھے شاید ”کر پر شاد“ تقسیم کیا جا رہا تھا۔

بڑے بڑے لوہے کے ڈول جو دیسی گھی کے طلوعے سے بھرے تھے کچھ نو جوان سیوا دار لے کے جھوم میں چل رہے تھے۔

اپنے سامنے گزرنے والے کے دونوں پھیلے ہوئے ہاتھوں پر وہ مٹھی بھر کر گولے کی طرح بنا ہوا طلحہ رکھ دیتے جو بڑی عقیدت سے ہر کوئی کھا رہا تھا۔ یہ لوگ اپنی انگلیوں اور ہتھیلیوں سے چنا گیا اپنا زہانہ سے چاٹ لیتے تھے کیا جال جو ایک قطرہ بھی زہن پر گرے۔

ان دونوں نے بھی کچھ مل دہرایا اور ایک دوسرے کے تعاقب میں باہر آ گئے۔ اس دوران طاہر بے چینی سے مجمع کا جائزہ لیتا رہا لیکن پکڑوتی اسے کہیں نظر نہیں آیا۔

اس نے دل ہی دل میں سمکت ملی بھی تیار کر نی شروع کر دی تھی.....

اب ایک سوال کا جواب چاہے تھا کہ کیا پکڑوتی یہاں اکیلا ہے؟

ایسا بظاہر تو ممکن تھا لیکن ایسا ہو سکتا تھا کہ اس نے اپنے ساتھیوں کو سوری اور ڈیرہ دونوں کی طرف روانہ کر دیا ہو اور خود کسی ممکنہ امکان کو ذہن میں رکھ کر ادھر آ گیا ہو..... پھر اس نے سوچا پھر دقتی کے اکیلے ہونے سے کیا فرق پڑے گا؟

○ ○ ○

”را“ کا اپنا ایک ”نیٹ درک“ تھا اور وہ لوگ کسی پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ ایسا ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اپنے ایک ہونہار آفسر کو اس طرح کسی غیر ملکی ایجنٹ کے ہاتھوں اغوا ہو کر سرحد پار کر جانے دیں.....

ظاہر جانتا تھا اب یہ ان کی پریکٹس سے زیادہ غیرت کا مسئلہ بن چکا تھا جس پر وہ لوگ کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتے تھے.....

”را“ نے اپنے ملک کے چپے چپے پر پھیلے نیٹ درک کو اب تک ان سے متعلق تمام اطلاعات پہنچا دی ہوں گی اور وہ خود ان کے خستہ ہوں گے.....

ایک بات اس کے لئے باعث اطمینان ضرور تھی کہ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ سلیم بینک محفوظ ہاتھوں میں پہنچ چکا ہوگا.....

اسے گمان گزر رہا تھا کہ سلیم نے یہاں سے فرار کا آسان راستہ تلاش کیا ہوگا اور نیپال کی سرحد عبور کر لی ہوگی۔ اگر وہ سلیم کے ساتھ فرار ہو گیا ہوتا تو اب تک وہ بھی محفوظ ہاتھوں میں پہنچ چکا ہوتا.....

لیکن..... وہ ایسا کر نہیں سکتا تھا.....

اس کے لئے ظاہر یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی.....

کاشی اگر وال ساری زندگی سوری میں اس کی خستہ رہتی اور وہ اپنے ملک پہنچ چکا ہوتا.....

اس کی تربیت بھی یہی تھی.....

اسے تو اپنے کام سے مطلب تھا.....

اس کی طرف سے باقی سب کچھ جنم میں جاتا۔ اس کا کام ہونا چاہیے تھا جو ان دونوں

نے کامیابی سے کر لیا تھا.....

لیکن..... بات اس سے آگے چلی گئی تھی.....

اگر کاشی اگر وال اور اس کے درمیان کوئی جنسی رشتہ قائم ہوتا تو وہ ایک لمبے کے لئے بھی اس سے متعلق کچھ نہ پوچھتا۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا..... قدرت نے حالات نے ان دونوں کے بیچ جنسانی سے زیادہ ایمانی رشتہ قائم کر دیا تھا.....

ظاہر جانتا تھا کہ وہ مسلمان کے گھر جنم لینے کی وجہ سے مسلمان ہے لیکن کاشی ہندو گھرانے میں جنم لینے کے باوجود ہندو نہیں تھی.....

اس کے اندر ہمیشہ سچائی کو پالنے کی جستجو ہمیشہ موجود رہی تھی اور جب اسے موقع ملا اس نے اس سچائی پر لبیک کہا.....

ظاہر نے سوچا تھا ہماگ جائے! لیکن کسی نا دیدہ طاقت نے اسے روک دیا کیونکہ اس کی ایمانی غیرت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ ان حالات میں کاشی اگر وال کو دھوکہ نہ دے.....

اس نے یہ بات سلیم سے کہی تھی..... اس سے پوچھا تھا کہ وہ کیا لائحہ عمل اختیار کرے؟ اور اس کی طرح پروفیشنل ایجنٹ سلیم نے ایک لمحہ توقف کے بغیر کہا تھا.....

”ظاہر زندگی میں سب کچھ پیشہ وارانہ نقطہ نظر ہی سے نہیں کیا جاتا..... بعض چیزیں اور معاملات ان سے بلند ہوتے ہیں۔ ہماری سوچ سے بھی بلند..... بس ہمیں اپنی وہ شناخت یاد رکھنی چاہیے جو ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا فخر ہے..... کیا تم یہ چاہو گے کہ یہ فخر تم سے چھین جائے؟“

”نہی.....“

ظاہر نے مضبوط اور دونوں لمبے میں کہا تھا.....

”پھر جاؤ اور آخری لمبے تک کاشی کے اعتماد پر پورا اترنے کی کوشش کرو..... اللہ تمہارا حامی رہا ضرور ہو.....“

سلیم نے دم رخصت کہا تھا.....

اور..... اس نے ایسا ہی کیا.....

○○○

”نوجوت یہاں..... یار تمہاری بھابی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اس کے لئے تو لنگر کمرے ہی میں لے آنا۔“

اس نے باہر نکلے ہوئے کہا۔

”ویریجی بے فکر ہو جاؤ۔“

نوجوت نے حسب سابق گردن پھلائی۔

دوپہر ہو چکی تھی جب وہ اوداس کر کے باہر نکلے اب انہیں اپنے کمرے کی طرف جانا تھا جہاں نوجوت سنگھ کی ماں بھی اوداس سے واپس آ چکی تھی۔

اس درمیان کاٹھی کھری نیند سوئی رہی۔ طاہر نے اسے دوامیں خیند آدر گولی بھی دے دی تھی وہ جانتا تھا کہ کاٹھی کے لئے تین چار گھنٹے کی نیند کتنی ضروری تھی۔

جب دونوں کمرے میں پہنچے تو کاٹھی کی بیدار ہوئے بمشکل چند منٹ گزرے تھے ابھی تک سرداراں واپس نہیں لوٹی تھی۔

کاٹھی پر غور کی اچانک ہی طاری ہوئی تھی اب آنکھ کھلنے پر اسے احساس ہوا کہ طاہر نے جان بوجھ کر اسے خواب آدر وادی تھی تاکہ وہ تھوڑی دیر کے لئے سو سکے۔ کاٹھی بیدار ہوئی تو اس کا بدن پیٹنے سے شرابور تھا اور بخار کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ اس مرتبہ طاہر کی دی ہوئی ڈوز بالکل کامیاب رہی تھی اس نے اندازہ لگا کہ طاہر واقعی مکمل ڈاکٹر تھا۔ اس سے پہلے اگر اسے مکمل شفا نہیں ہوئی تھی تو اس میں طاہر کا کوئی قصور نہیں تھا دراصل بے آرمی اور مستقل بھاگ دوڑنے دو آگاہنا مکمل

اثر نہیں دکھانے دیا تھا۔

طاہر اور نوجوت کمرے میں داخل ہوئے تو وہ نہانے اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اپنے بال سکھا رہی تھی۔ بال اس کے شانوں پر دھرے تو لیے پر کھڑے ہوئے تھے ایک لمحے کے لئے تو طاہر کے ساتھ نوجوت سنگھ بھی ششدر رہ گیا۔

کاٹھی اگر وال انہیں کسی قدیم مندر کی دیو داسی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے اندر موجود سچائی جسے اب تک جھوٹے بہروپ نے دبا رکھا تھا اب اس کے چہرے پر جگمگی تھی جس سے اس کا حسن دو چند ہو گیا تھا۔ دونوں پر اس کی آنکھوں نے ایک جیسا جنوں پھونک دیا تھا۔

”ست سری اکال۔“

نوجوت سنگھ نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر اسے پرنام کیا اس کا پرنام کرنے کا اندازہ بالکل پھیاریوں جیسا تھا۔

کاٹھی نے بھی جواب میں ”ست سری اکال“ کہا تھا۔

”میں ماں بی کو دیکھتا ہوں اور لنگر کا بندوبست بھی کروں۔“

اس کے جلوہ حسن کی تاب نہ لا کر شاید نوجوان نوجوت سنگھ نے وہاں سے ہٹ جانا ہی مناسب جانا تھا۔

”کبھی طبیعت ہے اب۔“

سحر زدہ طاہر نے دریافت کیا۔

”بے فکر ہو..... اب شاید تمہیں مزید ٹھکلا مزدورینے کی ضرورت پیش نہ آئے۔“

کاٹھی نے بالوں پر لگے پانی کے قطرہوں کو جھکاتے کر گراتے ہوئے کہا۔

”سوری کاٹھی..... لیکن یہ ضروری تھا۔“

طاہر بھی مسکرا دیا۔

”اور خورتم..... تمہیں کیا نیند کی ضرورت نہیں۔ تم بھی تو گذشتہ دوراتوں سے

ممیبت میں پڑے ہو..... میں جانتی ہوں تم کتنا سوئے ہو.....“

کاٹھی نے گدے پر دھری چادر کو ٹھیک کرتے ہوئے اس کے پیٹنے کی جگہ بتائی۔

”راج شام ڈھلنے پر ہمیں یہاں..... نکل جانا چاہیے۔“

اس نے اچانک ہی کاشی سے کہا لیکن کرل مہنگیا کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔

”کیوں..... اگر کوئی ایر معنی نہیں تو رات یہاں ٹھہر جاتے ہیں۔ طاہر میری بیماری تو قابلِ برداشت ہے خدا خواست مستقل بھاگ دوڑ نے تمہیں بیمار کر دیا تو میں کیا کروں گی..... مجھے تو تمہارے جتنی دواؤں کا بھی علم نہیں۔“

کاشی نے کہا۔

”بے فکر رہو..... میں بیمار نہیں ہوں گا۔ اور ہوا بھی تو اپنی دوا کا خود بندوبست کر لوں گا۔“

طاہر نے اس کی بات کو مٹی میں اڑا دیا۔

لیکن..... ایک چھانسی کاشی کے دل میں اٹک گئی۔ وہ اٹلی جنس آفسر تھی اور جانتی تھی کہ طاہر نے اچانک جو پروگرام بدل لیا ہے تو خسرو اس کی کوئی بچہ رہی ہوگی۔

اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی بات کرے سردار اس اندر آ گئی۔

”پاؤں پڑتی ہوں ماں جی۔“

کاشی نے سکھڑ کیوں کی طرح آگے بڑھ کر سردار اس کے پاؤں چھوئے۔

”جھتی رہو..... جو انیاں مانے..... رب تجھے شاد رکھے..... کیا حال ہے تیری صحت کا..... معاف کرنا پڑی..... میں تجھے سوئی چھوڑ کر چلی گئی تھی۔“

سردار اس نے ممتا بھرے لہجے میں کہا۔

”پر امانے بڑی کر پا کر دی ماں جی..... ٹھیک ہوں۔“

کاشی نے کہا اس کے ساتھ ہی دروازہ کھلا اور اس مرتبہ فوج ٹھیک ایک اور سیوار کے ساتھ اندر داخل ہوا تھا۔

”لو ماں جی..... بھر جائی جی..... ویرجی لنگر آ گیا۔“

اس نے بڑے مودب و میٹر کی طرح کورٹس بجالاتے ہوئے کہا۔

سیوار نے اندر داخل ہوتے ہی انہیں ”فتح“ پائی تھی جواب میں طاہر نے خاصی بلند آواز سے کہا تھا۔

”واہے گورو جی کا خالہ..... واہے گورو جی کی فتح۔“

”باباجی مگنڈ کے بعد برتن لے جانا۔“

نوجوت سنگھ نے سیوار کی مٹھی گرم کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے مہاراج۔“

سیوار آواز دے کر باہر نکل گیا۔

سب نے اکٹھے لنگر کھایا تھا..... جس کے بعد وہ وہیں لیٹ گئے۔ مسلسل بھاگ دوڑ

سے طاہر پر جلد ہی غنودگی غالب آ گئی اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کاشی اور ماں جی کے احرا کرنے پر سو گیا.....

طاہر کی آنکھ کھلی تو سورج ڈھل رہا تھا۔ نوجوت سنگھ تائب تھا اور کاشی ماں جی کے

ساتھ کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی اخبار کا مطالعہ کر رہی تھی جو شاید نوجوت سنگھ نے اسے لا کر دیا تھا.....

طاہر قدرے گھبرا کر اٹھا کیونکہ وہ تین گھنٹے مسلسل سوتا رہا تھا۔ ایسا کاشی کی وجہ سے ہی

ممکن ہوا تھا کیونکہ وہ جانتی رہی تھی.....

ماں جی کو ”فتح“ بلا کر اس نے ہاتھ روم کا رخ کیا اور دوبارہ کپڑے بدل کر دوسری

پکڑی باندھ لی اور پھر اس نے کاشی کو آنکھ سے مخصوص اشارہ کیا جس کا مطلب سمجھ کاشی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اور..... ذہن میں طے شدہ پلان کے مطابق اس نے ایک مرتبہ پھر کاشی کا ٹیپر بچر

چیک کرنا چاہا۔

”اوہ ماں جی کا.....“

اس نے ٹیپر بچر کی طرف دیکھتے ہوئے بظاہر پریشانی سے کہا۔

”کیا ہوا پتھر؟“

سردار اس نے بے چینی سے پوچھا۔

”ماں جی شکرنا..... من تو نہیں چاہتا پر مجبوری ہے ہمیں آج رات ہی ڈیرہ دون یا

مسوری واپس جانا ہے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں..... کہیں..... معاملہ زیادہ خراب نہ ہو جائے۔“

طاہر نے کہا۔

اس کی بات سن کر سرداراں کچھ پریشان اور مغموم ہی ہو گئی۔

”بیٹا تیری مرضی..... دل تو نہیں چاہتا کہ تمہیں جانے دوں لیکن جینی کی مجبوری ہے اچھا رب خیر کرے۔ تم میرے بیٹے کا امیر تر کا فون نمبر لکھ لو..... پتے میں ایک ادھر تیرے دو مجھے زبردستی امیر تر لے جاتا ہے۔ اور وچن دو کہ تم دونوں ضرور ہمارے پاس آؤ گے۔ میرے ساتھ گاؤں میں آ کر رہنا..... کھلی آب و ہوا سے تمہارا دل بہت خوش ہوگا۔“

سرداراں نے اسے اپنے بیٹے کا امیر تر کا ٹیلی فون نمبر لکھواتے ہوئے کہا۔

”ماں جی میں وعدہ کرتا ہوں اگر زندہ رہے تو اگلے چند دنوں میں آپ کی سیوا میں حاضر ہوں گے کیونکہ مجھے گوردا سپورانی موسیٰ جی کے پاس ضرور جانا ہے ورنہ وہ ساری زندگی مجھ سے ناراض رہے گی۔“

اس نے سرداراں کے بوڑھے بیٹے سنگت سنگھ کا ٹیلی فون نمبر بھی لکھ لیا جو امیر تر میں بزنس کرتا تھا اور وہیں کسی گاؤں میں اپنی نو بیاہتا بیوی کے ساتھ قیام پزیر بھی تھا۔

اب انہیں نوجوت سنگھ کا انتظار تھا جس سے ملنے کے بعد وہ یہاں سے رخصت ہوتے نوجوت سنگھ تھوڑی دیر بعد آ گیا۔ ان کے اچانک جانے کی خبر نے اسے بھی مغموم کر دیا لیکن بھرجانی کی بیماری کا جان کر اسے بھی بادل غمازہ ان کی ہاں میں ہاں ملائی پڑی۔ دم رخصت ان کے ہاں ناں کرنے کے باوجود سرداراں نے زبردستی پانچ سو روپے کا منی کو قصدا دیے۔

آج سے تم میری بیٹی بن گئی ہو..... یاد رکھنا اور اپنی ماں کو کبھی نہ بھلانا۔“

سرداراں نے دندھے ہوئے گلے سے کہا تو کا منی کا دل بھر آیا۔

اس نے سرداراں کو گلے سے لگالیا۔

”ماں جی..... ہم بہت جلد ملیں گے۔ آپ دشواں رکھیے اور ہمارے لئے

”پارقتنا“ (دعا) کیجئے۔“

کا منی نے الگ ہوتے ہوئے کہا۔

نوجوت سنگھ نے اپنی چھڑی طاہر کو دے دی تھی اور طاہر نے اپنی چھڑی اسے۔ اس

طرح وہ دونوں ”چھڑی بدل بھائی“ بن گئے تھے۔

دونوں ماں بیٹا انہیں باہر اڑے تنگ چھوڑنے کے لیے بھندھے لیکن طاہر نے انہیں زبردستی روک دیا۔ کیونکہ ”شام کی سجا آرہی تھی“ ہونے والی تھی اور ”گوربانی“ کا ہاتھ شروع ہو گیا تھا۔

”آپ نے اکھنڈ صاحب کا بھوگ بھی رکھوایا ہے۔ یہ زیادتی ہو گئی۔“

اس نے دونوں سے کہا۔

اور..... دونوں ماں بیٹا نے ہاں غور سے انہیں رخصت کر دیا۔

دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے یہی حال کا منی کا بھی تھا اور طاہر سوچ رہا تھا کہ کا منی نے اپنی شخصیت پر کتنا کچا خول چڑھایا ہوا تھا جو چاقی کا ایک جھکا بھی برداشت نہ کر پایا۔

دہشت گردوں کو تربیت دینے والی ”را“ کی انسٹرکٹر اور تحریک کاری کے خطرناک ترین سنٹر بنواری کی شفاف آفسر کا منی اگر وال اندر سے مکمل مشرقی عورت تھی..... خدا جانے اس نے یہ بہروپ کس طرح خود پر طاری کیا تھا۔

○ ○ ○

شام ڈھل رہی تھی جب وہ دونوں باہر نکلے۔

سراٹے سے باہر نکلے ہی طاہر بے اختیار رنس دیا۔

”سوگوار چہرے اور فٹوں پھونکی آنکھوں والی کا منی نے حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا۔“

”خیریت۔“

”میں سوچتا ہوں کا منی کہ تم پر ”را“ کی تربیت کا کوئی اثر تو ہوا نہیں۔ تم تو بالکل مشرق لڑکیوں کی طرح ایک لڑکی ہو۔ اوہ ماں کا ڈاڑھ کیا بہروپ بنا رکھا تھا تم نے۔“

کا منی سمجھ گئی وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے۔ اور جواب میں

دونوں پوٹا صاحب کے بھرے پرے ہاڑے نزدیک پہنچ گئے تھے۔

دکانوں پر رکھے ٹیپ ریکارڈز سے اونچی آوازیں سے لگتے زرد بلیوں کی بیماری روشنی اندھروں گوردوارے سے براہ راست کیرتن شہر؟

”کا منی..... میں جیتلہ ہریان دکھائی دیتا تھا۔ پلیٹ فارم کے ایک کونے میں یہاں

کے وادہ خواہنہ فروش کی ریزمی جس پر اس نے کیوس کا پردہ ڈال کر گویا چروں سے محفوظ سمجھ لیا تھا کھڑی تھی جس کے ایک پیسے سے بندھی زنجیر کا دوسرا سر اس نے پلیٹ فارم کے فرش میں گڑے لوہے کے بیچ سے باندھ رکھا تھا۔

”ابھی گاڑی آنے میں شاید دیر ہے..... کوئی نظر نہیں آ رہا۔“

طاہر نے اپنی رائے ظاہر کی۔

”ہاں..... میرا بھی یہی خیال ہے۔“

کامنی نے کہا۔

دونوں آہستہ آہستہ نشیمن کی پشت پر آ رہے تھے جہاں قطار میں لگے درختوں کے جھنڈ میں وہ اطمینان سے دوسروں کی نظروں سے محفوظ رہ کر بیٹھ سکتے تھے۔

”وہل کم ٹوہیل“ (جہنم میں خوش آمدید)

فائرنگ پوزیشن لے لی تھی۔۔۔۔۔

کسی بھی لمبے اگولی کا منی کو لگ سکتی تھی۔ طاہر نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اسے جو بگھ بھی کرنا ہے چند لمحوں میں کرنا ہے ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔

"بزدل بے غیرت۔۔۔۔۔ تم اکیلے کیا کرتے ہو اپنے ساتھ ان دونوں کو بھی لے آئے ہو۔"

اس نے اچانک ہی اپنا آخری داؤ آزما تے ہوئے مونگیا پر بھر پور نفسیاتی حملے کرتے ہوئے باقاعدہ ہاتھ سے ایسے اشارہ کیا تھا جیسے اسے مونگیا کے پیچھے دو آ دی دکھائی دیے ہوں۔

اس کی یہ چال کامیاب رہی۔۔۔۔۔ ایک لمبے کے لئے مونگیا نے گردن گھمائی تھی لیکن ان لمحات میں طاہر نے اپنے جسم کی ساری طاقت مجتمع کر کے اپنی ہاتھوں میں سسٹنی اور ذقن بھر کر اس پر حملہ آور ہوا۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ مونگیا بھی اتنا زہی نہیں تھا۔

یعنی ان ہی لمحات میں اس نے کاشمی کی طرف فائر کیا تھا جب طاہر قریباً مونگیا کے نزدیک پہنچنے والا تھا۔

مونگیا کے ہتھول سے نفلی گولی طاہر کے بائیں ہاتھ کی پھیلی میں لگی کیونکہ وہ یہی ہاتھ کرل مونگیا کے ہتھول والے ہاتھ پر مارنے جا رہا تھا۔

لیکن۔۔۔۔۔ اس کا حملہ بھی خالی نہیں گیا تھا۔ دو عمل اکٹھے وقوع پذیر ہوئے تھے۔

گولی طاہر کے ہاتھ پر لگی تھی اور اس کی ہوا میں گھومتی ٹانگ مونگیا کے دائیں کندھے پر ہتھول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور اندھیرے میں جا رہا تھا جس پر وہ تھماتا ہوا طاہر کی طرف پلٹا۔

طاہر کے حملے نے اسے پھلج ہی کر دیا تھا۔ وہ دیوانہ وار گالیاں نکالتا اس پر جھپٹا اور اس کا زوردار شیخ طاہر کے پیٹ میں لگا جس نے اسے الٹا کر رکھ دیا۔۔۔۔۔

کرل مونگیا کا واسطہ بھی زندگی میں ایسے سخت جان آدمی سے نہیں پڑا تھا۔ اسے بھی امید تھی کہ اس شیخ کے بعد طاہر جس کے ہاتھ پر گولی لگ چکی ہے زمین سے نہیں اٹھ سکے گا۔

لیکن۔۔۔۔۔ وہ تو کسی بہشت پہلو بلا کی طرح اپنے قدموں پر کھڑا تھا۔۔۔۔۔

کاشمی حیرت زدہ اسے دیکھ رہی تھی اسے اتنا ہوش ہی نہیں تھا کہ آگے بڑھ کر ہتھول اٹھا لے۔ اب طاہر کی باری تھی۔۔۔۔۔ وہ اپنے ہاتھ کا تو زیادہ بھر پور استعمال نہیں کر سکتا تھا کیونکہ گولی پھیلی سے پار ہوئی تھی اور دردی ناقابل برداشت لہر اچانک سارے بازو میں اتر آئی تھی۔

اس مرتبہ اس نے کرل کے نزدیک آنے کا انتظار کیا اور اتنے قریب سے اچھل کر اس کی گردن پر دائیں ٹانگ مار دی تھی کہ کاشمی کے لئے یقین کرنا مشکل تھا۔ کرل مونگیا لڑکھڑایا لیکن سنبھل گیا۔

اس نے تیزی سے نفاض میں اپنا ہاتھ گھما کر مخصوص ٹانگ اپنایا تو طاہر کو ڈیرہ دون والا کیپٹن پکھرو دی یاد آ گیا۔

اس مرتبہ وہ انگریزی قلموں کے ہیرو کی طرح اس پر لپکا لیکن طاہر نے وار خالی دیا۔ دونوں کے درمیان مزید حملوں کا تبادلہ ہوا تھا جب کاشمی کو اچانک ہوش آ گیا اور وہ تیزی سے ہتھول کی طرف لپکی۔۔۔۔۔

"مونگیا Stop It۔۔۔۔۔" (رک جاؤ)

اس نے مونگیا کی طرف ہتھول سیدھا کرتے ہوئے اسے وارنگ دی۔ لیکن۔۔۔۔۔ کرل مونگیا کو طاہر نے شاید پھلج کر دیا تھا اس نے ایک لمبے کے لئے بھی کاشمی کی وارنگ کی پرواہ نہیں کی تھی اور گالیاں دیتا اس پر لپکا۔

لیکن۔۔۔۔۔ کاشمی بھی "را" کی تربیت یافتہ تھی۔ یکے بعد دیگرے اس نے دو گولیاں کرل مونگیا پر فائر کیں اور وہ پلٹ کر دوڑ جا کر۔

"ڈیمٹ۔۔۔۔۔"

بے عزتی کے احساس اور غصے سے کھوئی کاشمی نے آگے بڑھ کر اس کے سر میں ہتھول کی ساری تیزخونی خالی کر دی۔

اس کے ساتھ ہی وہ دیوانہ وار طاہر سے لپٹ گئی۔ کاشمی جانتی تھی اگر طاہر اپنے ہاتھ پر اس کو نہ روکتا تو یہ گولی اس کے دماغ میں گھس جاتی۔ کرل مونگیا ہوا میں اڑتے پرندے پر نشانہ لگنے کے لئے بٹواری کپ میں خصوصی شہرت رکھتا تھا۔

”تم ٹھیک ہوتا ظاہر... تم ٹھیک ہو ناں.....“

بچوں کی طرح ظاہر سے لپٹتے ہوئے وہ کہے جا رہی تھی پھر شاید اسے حالات کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔

پتول پینک کر اس نے ظاہر کا ہاتھ دیکھا جس سے خون نوارے کی طرح بہہ رہا تھا۔
”اوہ مائی گاڈ“... کہتے ہوئے کاشی نے جھک کر بیک کھولا اس میں سے اپنا دوپٹہ نکال کر بچاڑا اور اس کے ہاتھ پر اس طرح سختی سے باندھ دیا کہ خون بہتا بند ہو گیا۔

”چلو... نکلیں یہاں سے...“

قریباً دو تے ہوئے اس نے ظاہر سے کہا تھا۔

”یہ ضرور یہاں کسی گاڑی پر آیا ہو گا۔“

ظاہر نے کہا تھا۔

دونوں بیک اب کاشی نے اٹھالے تھے اور وہ ظاہر کے تعاقب میں درختوں کے جھنڈ کے دوسری سمت جا رہی تھی جہاں انہیں ایک درخت کے نیچے ایک پرائیویٹ کار نظر نہ دکھائی دی۔
جس کے دروازے بند تھے۔

”بیک بیک رکھ دو... آؤ میرے ساتھ۔“

”اس کی جیب سے تمام کاغذات کر لیں گاڑی کی چابی نکال لو۔۔۔۔۔۔ ساری جینیں

خالی کر دو۔“

ظاہر نے زمین پر اکڑوں بیٹھے ہوئے کہا۔

درو کی اذیت میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ خدا کا شکر تھا کہ اس کا خون بہتا بند ہو گیا۔
کاشی نے اپنے اوسان مکمل بحال کر لئے تھے اور اپنی تربیت کا بہترین استعمال کر رہی تھی۔ چند سیکنڈ میں اس نے کرش مونگیا کی ساری جینیں خالی کر دی تھیں۔ اس کا ہونہ کارڈ اور چابی اس کے پاس تھی۔

”گاڑی میں بیک رکھو۔“

ظاہر نے اس سے کہا اور خود مونگیا کی ٹانگ پکڑ کر اسے گھسیٹتا ہوا زور کی جھنڈ کی طرف لے جانے لگا جہاں خود وہ جھاڑیاں آسمان کو چھو رہی تھیں۔۔۔۔۔۔ کاشی اس کا مطلب سمجھ گئی تھی وہ

واپس چلی اور دوسری ٹانگ پکڑ کر اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔

دو تین منٹ میں انہوں نے مونگیا کی لاش ٹھکانے لگا دی۔ اب کم از کم صبح ہونے سے پہلے لاش کا انکشاف مشکل تھا۔

ظاہر کے لئے دردنا قابل برداشت ہو رہا تھا۔۔۔۔۔۔ اس نے خود کو قابل رکھنے میں ساری توانائیاں لگا دی تھیں۔ لیکن چاند کی ٹکٹی روشنی میں جب اس کے چہرے پر کاشی کی نظر پڑی تو اسے یوں لگا جیسے کسی نے زور سے گھونسا اس کے دل پر مار دیا ہو۔

”ظاہر! تم ٹھیک تو ہو ناں.....؟“

اس نے رد ہائی آواز میں کہا۔

”بے فکر ہو! میں ایسی ویسی جیس گولیوں سے مرنے والا نہیں ہوں۔“

ظاہر نے اس کے جذبات کا اندازہ کرتے ہوئے بزدلی مسکراتے کی کوشش کی۔

کاشی کو اچانک ہی جیسے کچھ یاد آ گیا۔ اس نے جھک کر بیک کھولا اس میں سے دو تین گولیاں درد ختم کرنے والی نکالیں اور درد کا بند پکٹ کھول کر اس کی طرف بڑھایا۔

”ایک بڑبڑکھول بھی دے دو۔ اس طرح تمہارا بدلہ پورا ہو گا۔۔۔۔۔۔ آخر میں بھی تمہیں یہ سب کچھ کھانا چاہیوں۔“

اس کی بذلہ غبی برقرار تھی۔

کاشی نے اختیار مسکراتی۔

اسی لمحے ظاہر اسے دنیا کا سب سے عظیم انسان دکھائی دیا جس کو اپنے زخم سے زیادہ کاشی کی فکر داس کی تھی۔

”آہ میرے بھٹو۔“

کاشی نے ظاہر کو بازو سے پکڑ کر اگلی سیٹ پر بٹھایا تھا۔ ظاہر کے بار بار کہنے کے باوجود اس نے ڈرائیونگ خود کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

○ ○ ○

کاشی اب مکمل ہوش و حواس میں تھی وہ جانتی تھی کہ اب ظاہر کی ذمہ داری اس پر آگئی ہے۔ اس نے ظاہر کے لئے فوری طور پر فٹ ایڈ کا بندوبست کرنا تھا۔

چاہی لگانے پر اسے اطمینان ہوا کہ گاڑی کی ٹینکی خالی تھی..... تیزی سے کار چلائی وہ پکی سڑک پر آگئی۔

”کار پیچا تھی ہو.....“

اچانک ہی طاہر نے سوال کیا۔

”میں بھی سوچ رہی تھی طاہر..... یہ گاڑی آج تک سیکورٹی سٹاف میں نہیں دیکھی گئی۔ میرے خیال سے کرل مونٹیا کی یہاں موجودگی کا بھی اس کے ساتھیوں کو علم نہیں ہوگا۔ وہ اصل میں کارنامہ دکھانے کے چکر میں مارا گیا۔ گاڑی میں ریڈیو ڈائریس نہیں ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ گاڑی اس نے اپنی شناخت اور یہاں موجودگی چھپانے کے لئے پرائیویٹ استعمال کی ہے.....“

کاشمی نے کہا۔

”اگر صورتحال الٹ رہی ہو۔“

طاہر نے عندیہ ظاہر کیا کیونکہ دونوں کی تربیت یہی تھی کہ تصویر کے دوسرے رخ کو ہرگز نظر انداز نہ کیا جائے۔

”چھر بھی فکر کی بات نہیں..... جب تک مونٹیا کی لاش کی شناخت نہ ہو جائے۔ پولیس کے پاس کار کا نمبر نہیں جائے گا..... بہر حال صبح تک ہم محفوظ ہیں..... اور اطمینان رکھو طاہر کاشمی کی موت کے بعد ہی اب کوئی تم تک پہنچے گا۔“

کاشمی کے لہجے کی صداقت تاریخی تھی کہ جو وہ کہہ رہی ہے وہ گرگز رہے گی۔

”ٹھیک ہے۔ اب کیا ارادہ ہے تم؟“

طاہر نے اس کا موڈ بدلنا چاہا لہذا انہیں انہیں گولیوں نے کچھ زیادہ اثر نہیں دکھایا تھا۔

”اب مجھ پر سب کچھ چھوڑ دو..... اور کم از کم ایک گھنٹہ خود کو نابل رکھنے کی کوشش کرو..... بس صرف ایک گھنٹہ طاہر..... مجھے کوئی خطرہ مول لیے بغیر تمہارے لیے فٹ ایڈ حاصل کرنی ہے۔ میں ان حرام خوروں سے ٹشنا جانتی ہوں..... تم سونے کی کوشش کرو..... گوکہ یہ ممکن نہیں..... لیکن کوشش کرو۔“

اس نے طاہر کی سیٹ کا لیور کھینچ کر اسے زیادہ آرام دہ کر دیا تھا اور خود چپختی ہو کر

سامنے سڑک پر نظر میں جمائے انتہائی رفتار سے گاڑی چلا رہی تھی۔

○ ○ ○

گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے وہ کن اکھیوں سے طاہر کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی جس نے اپنے زخمی ہاتھ کو دوسرے ہاتھ کے سہارے سے اس طرح اوپر اٹھایا ہوا تھا کہ خون بہنے کے امکانات کم سے کم ہو جائیں۔

اس نے بے پناہ قوت برداشت کا مظاہرہ کیا تھا اور کسی نہ کسی طرح صبر کئے بیٹھا تھا لیکن کاشمی کو اس اندھیرے راستے پر جہاں کبھی بھی صرف سڑک کے دور دوریہ لگے درختوں کے چمکڑے سے چاندنی روشنی چھنی کر آتی تھی اس کا چہرہ زرا واضح دکھائی دیتا تو وہ چہرے پر آنے والی معمولی سی زردی سے اندازہ لگا سکتی تھی کہ طاہر پر اس وقت کیا گزر رہی ہے۔

طاہر کی حالت دیکھ کر اس کا دل بیٹھنے لگتا تھا۔

یہ فیصلہ اس کے لئے دو تین ہی گھنٹے کا تھا۔ کس طرح آگے بڑھے کہ اس نے کرل مونٹیا کی کاشمی کی طرف بڑھتی گولی کو اپنے جسم پر رد کیا تھا۔

”بے فکر ہو طاہر..... میں بھی تمہیں خود سے پہلے مرے نہیں دوں گی۔“

اس نے دل ہی دل میں اپنے عزم کو دہرایا۔

سڑک کے دور دوریہ کرشنا چور (کھنجر) ڈھاکا، سنبھل اور الماس کے بیڑ بٹکے ہوئے تھے جن کی وجہ سے سڑک ڈھکی اور رنگ پرنگ پھولوں میں پھنسی دکھائی دے رہی تھی کیونکہ سردیوں کی وجہ سے الماس کے درختوں نے بستی پھولوں کے سہارے اپنے ماتھے پر نہیں جائے تھے لیکن ابھی تک یہاں کرشنا چور سرخ پھولوں سے لہے ہوئے تھے۔

اسے اپنی مانی یاد آگئی تھی جس نے سارے گھر کو الماس کے درختوں سے بھرا ہوا تھا۔

جب کبھی کاشمی اگر وال گھر جاتی اور اپنی موسیٰ سے وہاں کوئی اور درخت یا پھولوں کے پودے لگانے کی ضد کرتی تو وہ جتنی سے اسے روک دیتی۔

”تجھے دھرم کرم سے کیا لینا..... بیٹی جہاں الماس ہوں وہاں بن برستا ہے۔ کاشمی ماں

کی چھتر چھایا ہو جاتی ہے وہاں.....“

اس کی موسیٰ کبھی اور اسے خاموش ہونا پڑتا کیونکہ اپنی موسیٰ سے وہ بحث نہیں کر سکتی تھی

جس نے اسے اپنی گود میں اٹھا کر بچپن کی دہلیز پار کروائی تھی۔

ان کے پرانے گھر کی دیواروں کے ساتھ ساتھ امتاس کے درختوں پر جب بہار آتی اور وہ سنہرے ہاروں سے لد جاتے تو ایک ساورانی سا اجالا جھلک جاتا تھا۔

اسے ہنسی آتی تھی جب وہ اپنی ماں اور موسیٰ کو صبح جیل کی قہالی میں رتاکھلی کے پھول سجائے دودھ اور سندور کی قہال لئے اپنے گھر کے سامنے گلی کی کڑی میں بیٹیل کے پرانے درخت کے سامنے جاتے دیکھتی جہاں وہ صبح پوچا گیا کرتی تھی۔

نجانے کیوں یہاں کے درخت دیکھ کر اسے اپنی موسیٰ یاد آ گئی۔

اچانک ہی بے اختیار جیسے طاہر کے منہ سے ”سی“ کی آواز نکلی اور کالمی کا دل دھک سے رو گیا۔

کیا ہوا.....؟

اس نے تپ کر پوچھا۔ سیرنگ پر اس کا ہاتھ ایک لمحے کے لئے پکپکا گیا تھا۔

”کچھ نہیں مطمئن رہو۔“

طاہر نے کہا۔

لیکن..... وہ مطمئن کہاں رہ سکتی تھی۔

طاہر نے اس کی آنکھوں میں نمی دیکھ لی تھی اور اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس کے منہ سے

غیر ارادی طور پر بھی ”سی“ کی آواز کیوں نکلی ہے۔

کالمی نے اچانک ہی گاڑی سڑک کے کنارے روک دی تھی ہاتھ بڑھا کر اس نے

گجیلی سیٹ پر دھرا لے کر کھولا اس میں اپنی گرم چادر اور ”پیتا بمر“ (پیتا کپڑا جس پر اشوک وغیرہ لکھے ہوتے ہیں) نکال لیا۔

”پیتا بمر“ اس نے طاہر کے گلے میں ڈال دیا تھا اور اس کے سر بے بندھی بندھائی

چکڑی اتار کر اس کی سیٹ کے نیچے رکھی تھی کہ دوبارہ آسانی سے وہ اسے سر پر رکھ سکے۔ گرم چادر اس نے طاہر کے جسم پر ڈال دی تھی۔

”طاہر لیٹ جاؤ۔ آنکھیں بند کرلو۔ بس آدھا گھنٹہ اور..... صرف آدھا گھنٹہ۔“

اس نے اپنی گھڑی کی سوئیوں پر نظریں ڈالتے ہوئے اس کی سیٹ کا لیور آخربک دبا کر

قریب ساری ٹانگیں پھیلائے کی جگہ بنادی تھی۔

طاہر نے اس کی طرف دیکھا۔ زخمی مسکراہٹ اچھالی اور نہ چاہتے ہوئے بھی محض اس کا دل رکھنے کے لئے ٹانگیں پھیلا دیں۔

”آل رایت میڈم۔“

طاہر نے کہا اور کالمی کی آنکھیں چمک گئیں۔

بے اختیار ہو کر اس نے روتے ہوئے اپنا سر طاہر کے شانے پر رکھ دیا۔

”کالمی اگر تم حوصلہ ہاں گئیں تو پھر دونوں مارے جائیں گے۔“

وقت کی نزاکت کا احساس طاہر نے اسے دلا کر دلا سہیجے ہوئے کہا۔

کالمی دوسرے ہی لمحے تسخیل چکی تھی۔

”آئی ایم سوری..... آئی ایم سوری۔“

اس نے طاہر کی طرف دیکھ کر اپنی آنکھیں اپنی قیاس کی آستین سے صاف کرتے

ہوئے کہا۔

دوسرے ہی لمحے اس نے ایکسیلیٹر دبا دیا۔ گاڑی ایک مرتبہ پھر ہوائے باتیں کرنے لگی

تھی۔

○ ○ ○

سولان اس کی منزل تھی۔

ہاں چل پڑیں کا یہ سرحدی قصبہ اس کے لئے کبھی اجنبی نہیں رہا تھا یہاں اس کے بچپن

کی دوست ڈاکٹر شیلہ اپنے نادانہ کے ساتھ پریکٹس کرتی تھی۔

شیلہ اس کی واحد راز دار سبیلی تھی جسے علم تھا کہ کالمی اگر وال کی کیا نوکری ہے اور اسے کیا

کیا پڑ پڑتے ہیں۔

شیلہ جہاں بھی ہوتی دو تین ماہ بعد کالمی اس سے ملنے وہاں ضرور پہنچ جایا کرتی تھی۔

حیرت کی بات تھی کہ اس نے شیلہ کو یاد رکھا تھا اور نہ تو اپنے ماضی کے حوالے سے اسے کچھ بھی اچھا

نہیں لگتا تھا۔ شیلہ کو کبھی کالمی سے بہت محبت تھی..... اتنی محبت کہ اس نے ڈاکٹر جیکب سے شادی کی

اطلاع صرف اسے دی تھی۔

براہمن گھرانے کی ڈاکٹر شیلہ کو ڈاکٹر آنرک جیکب سے ایک سرکاری ہسپتال میں ہاؤس جاب کرتے ہوئے محبت ہوئی اور دونوں ایک دوسرے کے نزدیک آتے گئے۔ اسنے نزدیک کان کے سچ موجودہرم اور ساج کی دیواریں ایک ایک کر کے گرتی چلی گئیں۔ اس روز جب وہ چھٹی پر گھر آئی تو شیلہ بھی گھر آئی ہوئی تھی۔ معمول کے مطابق گھر میں داخل ہونے پر اس نے سب سے پہلے ڈاکٹر شیلہ سے متعلق دریافت کیا۔

”ہرے رام۔۔۔ ہرے رام۔“

شیلہ کا نام سننے پر اس کی ماں نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”کھجی۔۔۔ کھجی۔“

اس کی موسیٰ نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔“

اس نے دونوں کو حیرانگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ارے بیٹا اس کھوئی کا نام نہ لینا۔۔۔ اس نے تو خاندان کی شہیاد ہو دی۔“

اس کی موسیٰ نے حسب عادت سسٹس بچیلانے ہوئے کہا۔

”اوہ موسیٰ کیا پیلیاں بھجوا رہی ہو۔۔۔ کچھ منہ سے بولو گی یا پونہی الٹے سیدھے اشلوک

الا پتی رہو گی۔“

کاشی نے چڑکھو چھا۔

”ارہی بیٹی۔۔۔ کیا پوچھتی ہے۔ سنا ہے کسی عیسائی ڈاکٹر سے اس کے تعلقات قائم ہو

گئے ہیں اور اب وہاں شادی کا تہنہ کر رہی ہے۔“

اس کی موسیٰ نے کہا۔

”بس۔۔۔ اس میں کیا قیامت آگئی۔ کمال کرتی ہیں آپ بھی۔ شادی اس نے

کرتی ہے اور معیبت آپ نے مول لے رکھی ہے۔“

کاشی نے اپنی موسیٰ سے کہا۔

”دیکھو دیکھو لاڈلی کے کروت۔ پولیس کی نوکری کیا کر

لی۔ زبان بھی گڑبڑی ہو گئی ہے۔“

اس کی ماں نے موسیٰ کو طعنہ دیا کیونکہ کاشی کا اپنی ماں سے کم اور اپنی موسیٰ سے زیادہ تعلق تھا۔

”ارے گھبرا نہیں۔۔۔ ٹھیک ہو جائے گی۔ میں سوئی واچن کر رہی ہوں اس سچے

لئے۔۔۔ بنو مان چالیس پڑھ رہی ہوں۔“

موسیٰ نے اس کی ماں کو تسلی دی۔

کاشی اس دوران شیلہ کے گھر کی طرف جا چکی تھی جہاں ایک الگ طوقان بد تیزی پر پا

تھا۔ اس کی شکل پر نظر پڑے تو شیلہ کی ماں پھٹ پڑی۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا۔۔۔ ابھی تک اس کا باپ مندر کا پردہت ہے اور یہ چلی

ہے ایک عیسائی سے شادی کرنے۔“

”اوہو۔۔۔ موسیٰ اس میں کیا برائی ہے۔“

کاشی نے اس کی ماں کو سمجھانا چاہا۔

”اچھا تو یہ بات ہے۔ تو بھی اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ گویا تم دونوں ہماری

بربادی پر جس مچی ہو۔۔۔“

ڈاکٹر شیلہ کی ماں رو پڑی۔

ڈاکٹر شیلہ کا باپ کرشنا مندر کا چچا رہا تھا۔ ان کا گھرانہ بھی خالص پنڈت گھرانہ تھا۔ اور

ان کے ہاں ایسی کسی بات کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا جو شیلہ کرنے جارہی تھی۔

”ارے ماں میں نے کہا تھا کہ وہ ہندوہرم کے مطابق شادی کرنے کے لئے تیار

ہے۔ اور کیا چاہیے تمہیں۔“

ڈاکٹر شیلہ نے اپنی ماں کو تسلی دینی چاہی۔

لیکن۔۔۔ اس کی ماں نہیں مانی۔

ایک براہمن لڑکی جس کا باپ مندر کا پردہت ہوا ایسی کوئی حرکت کرے تو ان کے لئے

اس معاشرے میں زندہ رہنا ناممکن نہیں تھا۔

بہت دھکا نسا ہوا۔ شیلہ کے بھائی نے اس پر قہر طاری کیا لیکن خوش قسمتی سے کاشی کی

موجودگی نے اسے بچا لیا۔ ڈاکٹر شیلہ کو بادل خواستہ گھر والوں سے الگ ہو کر ڈاکٹر جیکب سے

ہاتھ میں مارچ پکڑے ایک پولیس والا جس نے برساتی اوڑھ رکھی تھی اس کے نزدیک آگیا۔ کامنی نے اپنی سائیکل کا شیشہ توڑا نچا کر لیا تھا۔

”اپنے انچارج کو بلاؤ۔“

اس نے پولیس والے کو کوئی سوال کرنے سے پہلے انگریزی میں درشت لہجے میں حکم دیا اور اس نے یوں اثبات میں گردن ہلائی جیسے وہ کاغذی کاملازم ہو۔

خدا جانے اس نے زدو کی چھپ میں بیٹھے پولیس انسپکٹر سے کیا کہا جو قریباً بھاگتا ہوا
کامٹی کی کار تک آیا تھا۔

”آئی ایم گریوال“

کاشی نے اپنا سکیورٹی کارڈ اور انٹیلی جنس کا خصوصی نشان اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا تو اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

”سوری میڈم سور اصل میں ہم۔۔۔۔۔“

انسپیکٹر کی زبان بڑکھڑا گئی۔

”اٹ ازاد۔ کے..... کوئی بات نہیں..... ڈیوٹی آفٹر آل ڈیوٹی ہے۔“

کامنی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”ایس میڈم۔“

انیکس نے اعلیٰ اڑناں جوڑتے ہوئے کہا۔

”ہمیں ”بیچ و پاس“ جانا ہے..... ابھی اور کتنی دیر کا سفر باقی ہے۔“

کامنی نے جان بوجھ کر سولان کے متضاد سمت کے ایک قصبے کا نام لیا تھا۔

”میزم ابھی دو گھنٹے اور لگیں گے۔ ڈونٹ وری۔ سڑک بالکل ٹھیک ہے۔ آپ سو لائن بائی پاس سے نکل جائیں۔ نئی سڑک بنی ہے۔ شہر میں داخل ہونے کی ضرورت ہی نہیں۔“

اس نے مستعدی دکھائی۔

”او۔ کے ٹینک پو..... مسٹر راج۔“

کامیابی نے اس کے سینے پر مہلکی نیم پلیٹ پر نظر ڈال کر کہا۔

شادی کرنی پڑی۔ اس نے شملہ میں کورٹ میرج کر لی تھی جس کی اطلاع صرف کامنی کو تھی جو اس وقت دونوں کے ساتھ کورٹ میں موجود تھی.....

ڈاکٹر شیلہ کی درخواست پر اس نے ابھی تک اس کا ایڈریس کسی کو نہیں دیا تھا اور اس کے والدین کو یہی بتایا تھا کہ وہ گزشتہ چھ ماہ سے اس سے نہیں ملے.....

کامنی کو یقین تھا کہ وہ اپنی سہیلی کے پاس محفوظ رہے گی۔

اس نے ظاہر کوڑا کٹر شیل کا تعارف کروا دیا تھا اور اسے ایک Cover Story بھی سمجھادی تھی۔

”او۔ کے“

ظاہر نے اثبات میں گردن ہلائی۔

مروک قدرے دور الٹھا۔ سالہا کا کارنامہ بالکل ہی انہیں سامنے ملتا ہے۔

اصطلاحی و ادبیاتی سے مراد کمال اور اعلیٰ ترین معیار ہے۔

[illegible]

یہاں تو ایسا ہی ہوا تھا

مولانا اسی میں بائیں کو یسر دور رکھا چاہتے ہی طاہر ہنر

نادر میان انہیں سرح

پوچھیں تاکہ

پچیس۔

س نے پریشان نظروں سے کامنی کی طرف دیکھا۔

”ہاں میرے خیال سے پولیس ہی ہے..... تم چپ چاپ اسی پوزیشن میں واپس چلے

جاء۔ ہم گاڑی واپس نہیں موڑ سکتے۔۔۔۔۔ میرے خیال سے یہ ان کا معمول کا ناکہ ہے۔ یہاں

سزا کوں پر ڈاکہ زنی ہوتی رہتی ہے..... کوئی خصوصی چکنگ نہیں..... رہ رکھ لو۔“

کہتے ہوئے کامنی نے ڈالیں بورڈ میں ادھر اچستول اس کا طرفہ دھاوا جو عالم ز

نے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ کر اسے بالکل افاقہ تک لے کر حصارِ حرم سے باہر نکال دیا۔

اللیلیٰ اور لٹھی.....!

منی زید راجہ - گادی - کاتھ

اور..... انسپکٹر راج کی گردن پھول گئی۔

اس نے کاشی کو باقاعدہ ایڑیاں بجا کر سیٹ مارا۔ انسپکٹر کے عقب میں موجود اس کے چار جوانوں نے اس کی تقلید کی تھی..... طاہر منہ پر ”چیتا میر“ لپٹا ہر گہری نیند سو یا رہا۔

○ ○ ○

اگلے چندہ منٹ میں جب رات کے گہرے اندھیرے نے سولان کو اپنی گرفت میں جکڑا ہوا تھا۔ کاشی کی گاڑی شہر کے ایک کونے میں موجود ماڈرن آبادی سے ذرا ہٹ کر بنے ہسپتال کے سامنے رکی گئی۔

یہ ڈاکٹر شیلہ اور جیکب کا پرائیویٹ کلینک تھا۔

تھکنی بجائے پر دروازہ شیلہ نے خود ہی کھولا تھا۔

بارش میں بھیکتی کاشی کی شکل پر نظر پڑتے ہی شیلہ بے اختیار آگے بڑھی اور اسے گلے

سے لگا لیا۔

”پہلے گیت کھول باقی باتیں پھر ہوں گی۔“

اس نے کہا اور ہماگ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

گاڑی اس نے اندر پارک کی تھی اور برآمدے کے نزدیک طاہر کو اتارنے کے بعد اندر کمرے تک لائی تھی.....

”شیلہ ڈیئر فور ان کی سرجری کا بندوبست کرو..... امیر جنسی ہے۔ میں گاڑی دوسری طرف لگا دوں۔“

اس نے طاہر کو بٹھاتے ہوئے کہا اور حیران و پریشان ڈاکٹر شیلہ کو چھوڑ کر گاڑی کو کلینک کی دوسری طرف موجود اس کے کمرے تک لے آئی۔ کمرے میں اس کی پہلے سے موجود گاڑی کے ساتھ اپنی گاڑی پارک کر کے اس نے سامان باہر نکالا اور گیراج کا دروازہ بند کر کے قریب بھاگتی ہوئی کلینک میں آ گئی۔

خدا کا شکر تھا کہ ہاں کوئی مریض بھی نہیں تھا۔

شیلہ کو اس کی نوکری اور دھندے کا بخوبی علم تھا اور وہ کچھ اندازہ اسے ہو رہا تھا کہ وہ یہاں کیوں آئی ہے؟ اس نے طاہر کے ہاتھ کے دھم کو دیکھ کر اندازہ کر لیا تھا کہ گولی لگی ہے۔ لیکن

ابھی تک کچھ پوچھے بغیر اپنے کام میں جت لگتی تھی.....

جب کاشی اندر آئی تو وہ طاہر کا زخم دھو رہی تھی۔

”کیا ہوا تھا؟“

اپنے کام میں مصروف ڈاکٹر شیلہ نے پوچھا۔

”گولی لگی ہے یار..... تجھے اپنے سارے دھندے کا علم تو ہے ناں..... بس یہ سمجھ

لے تجھ سے ملاقات کا بہانہ بن گیا..... آدھے گھنٹے سے ٹکریں مار رہی ہوں..... پر کاش کو بتا دیا تھا کہ تمہارے متعلق سوچا چلو اس طرح ملاقات کا بہانہ ہی بن جائے گا۔“

اس نے لاپرواہی سے کہا۔

”بے وقوف آئندہ ایسی غلطی کی کمی نہ کرنا..... آدھا گھنٹہ پہلے ان کے ہاتھ پر گولی لگی

ہے اور تم اب یہاں آئی ہو..... کاشی ابھی تک تمہاری عادتیں نہیں بدلیں..... تم کب سیریس ہو گی۔“

اس نے غور سے طاہر کا زخم دیکھنے کے بعد اپنا کام شروع کرتے ہوئے کہا۔

”دراصل اس میں کاشی کا قصور نہیں..... میری غلطی ہے..... کچھ معاملہ ایسا ہے کہ

ہم دونوں اپنی شناخت نہیں بنا سکتے تھے..... یہ سیکرٹ آپریشن تھا۔ اپنا تک ہی Encounter

ہوا اور مجھے کوئی لگ گئی..... کاشی آپ کا ذکر کرتی رہتی ہے میرے ساتھ۔ میں نے ہی اسے مجبور

کیا..... دراصل اس نے اتنی تعریف کر دی تھی آپ کی کہ میرا اشتیاق بہت بڑھ گیا تھا..... اور اس

نے غلطی بھی نہیں کہا تھا۔“

طاہر نے گفتگو کا رخ بدلنے کے لئے ڈاکٹر شیلہ سے کہا اور وہ اس کا آخری فقرہ سن کر

بے اختیار ہنس کر دی۔

”اس سالی کی بھی باتیں تو مجھے مار ڈالتی ہیں۔“

ڈاکٹر شیلہ نے ایک ہاتھ سے کاشی کی کمرے پر چپٹ لگاتے ہوئے کہا۔

”دیکھو مسٹر..... زخم گہرا ہے..... اگر تین چار دن آرام نہ کیا یا ذرا سی بھی لاپرواہی کی تو

ساری زندگی کے لئے میری دوست کی جان کو روٹے رہو گے۔ میڈیسن بننے سے لیتا۔ تمہارا

بہت خون نکل گیا ہے..... چاہیے تو یہ تھا کہ تمہیں کم از کم ایک خون کی بوتل لگائی جائے لیکن تو جوان

ہو سنبھل جاؤ گے۔۔۔ بس احتیاط کرنا۔۔۔ اور تم بھی۔۔۔“

اس نے کاشی کو پھر محبت بھری گالی دیتے ہوئے کہا۔

”جینجائی کہاں گئے۔“

کاشی نے ڈاکٹر جیکب کے متعلق پوچھا۔

”آج ہی گئے ہیں شمل۔۔۔ وہاں کانفرنس ہے ناں۔۔۔ تین چار دن لگیں گے۔۔۔ اگر

تہہ راز پتہ ہوتا تو شاید کانفرنس پر ہی نہ جاتا۔۔۔ کاشی ہمارا ہے کون تمہارا۔۔۔ سو۔۔۔ ایک تم ہی تو رہ گئی ہو۔۔۔“

یہ بات کہتے ہوئے ڈاکٹر شیلہ کا دل بھرا آیا تھا اور آواز بھی بدل رہی تھی۔ طاہر اس کے دکھ کو محسوس کر سکتا تھا۔

”بس۔۔۔ بس۔۔۔ اب وحیدہ رحمن (انڈین ملکہ جذبات) بننے کی کوشش نہ کرنا ورنہ میں ابھی چلی جاتی ہوں۔ تیرے پاس اپنے غم بھلانے آئی ہوں اور تو۔۔۔ کتنی مرتبہ تجھے کہوں نہ کہا کرا پیسے۔۔۔ میں کیا مرگئی ہوں۔۔۔ میں اکیلی کیا کم ہوں تیرے لئے۔۔۔ ارے سالی! میرے ہوتے ہوئے اگر کسی اور کی محبت نکلی تو دیکھ لیتا۔ یہ تو میری مہربانی سمجھ کر جیکب کو کچھ نہیں کہا۔۔۔ اس کے آگے نہ کہنا کچھ۔“

اس نے کہا۔

اور۔۔۔ آٹسو بھری آنکھوں سے ڈاکٹر شیلہ اس سے لپٹ گئی۔ اس نے ہاتھ کا قاعدہ روٹا

شروع کر دیا تھا۔

طاہر کو اس منظر نے خاصا جذبہ پائی کر دیا تھا۔

اس نے سوچا اگر اس ڈاکٹر نے کوہلم ہو جائے کراس کی واحد سبیلی بھی اب کبھی اس سے

نہیں ملنے آسکے گی تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔

دونوں سبیلیوں نے ایک دوسرے کو تسلیاں دے کر نارمل کیا۔

طاہر نے اپنے کپڑے بدل لیے تھے۔

ڈاکٹر شیلہ نے سدا آجکشن لگانے کے بعد گھوگھوڑ لگا کر بس پر لٹا دیا تھا۔ وہ ان دونوں کو

اپنے بیڈروم میں لے آئی تھی۔ اور یہ اس کی کاشی کے لئے محبت کی انتہا تھی کراس نے بغیر کچھ

جانے بوجھے طاہر کو اپنے بیڈ پر لٹا کر ڈرپ لگائی تھی۔

کمرے میں بیڑ چل رہے تھے اور طاہر پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ اسے اب

بہت سکون محسوس ہو رہا تھا۔

”ابھی آئیں سو نے نہ دینا۔۔۔ کچھ کھانا ضروری ہے۔۔۔ میں کچھ بنا کر لاتی ہوں۔“

شیلہ نے کاشی سے کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

○ ○ ○

”آئی ایم سوری طاہر۔۔۔ جنہیں فٹ ایڈ میں دیر ہو گئی لیکن مجبوری تھی۔ راستے میں

ایک دوسرے کا ریسپتال تھے۔ لیکن میں خطرہ نہیں مول لینا چاہتی تھی۔ میں جانتی ہوں طاہر کہ

کمرل مونگیا کے اوپر بھی ہمارا ایک ”چیک سسٹم“ ہے ذمہ دار دن کی فوجی اہمیت کی وجہ سے یہاں

ایجنسیاں آپریٹ کرتی ہیں۔ لیکن ”را“ کو ان میں سے کسی پر اعتبار نہیں۔ یوں بھی ”را“ کا

”سی آئی“ کاؤنٹر اٹھیلی جنس سسٹم بہت مضبوط ہے۔ انہیں جیسے ہی میرے فرائیڈ خرابی ہوگی تو جتنے

قائل ذکر مقامات ہیں ان کی ہر حساس جگہ پر ”را“ نے نظریں گاڑی ہوں گی۔ طاہر تمہیں بہت

تکلیف ہوئی لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم ایسی تکلیف خاطر میں لانے والے نہیں ہو۔ ہم

اب قدرے محفوظ ہیں مگر یہ دوسرا صوبہ ہے لیکن کمرل مونگیا اگر پوٹنا صاحب پر نظر رکھ سکتا ہے تو وہ

لوگ بھی سوالان کے متعلق سوچ سکتے ہیں۔“

بات کرتے کرتے رک کر اس نے طاہر کے چہرے کی طرف دیکھا تھا بہت اور کمزوری

سے اس کا رنگ پیلا پڑ رہا تھا۔

”اوہ مائی گاڈ۔“

کتنی ہوئی وہ اس پر جھک کر طاہر کے سر اور ماتھے پر ہاتھ پھیرنے لگی جہاں پسینہ کی نضحی

نضحی بوندیں اس تہہ کی سردی میں بھی چپک رہی تھیں۔

”تم ٹھیک تو ہونا۔“

اس نے بے چینی سے دریافت کیا۔

”ہاں۔۔۔ اب بالکل ٹھیک ہوں۔ کاشی تم گھبراؤ نہیں۔ میں اتنی جلدی چھٹی کرنے

والا نہیں ہوں۔“

اس نے مسکراتے ہوئے کامنی سے کہا۔

ظاہر کی زخمی مسکراہٹ کا منہ کی جان لے گئی۔

”ظاہر اب ہم جہاں پہنچ چکے ہیں اس ملک میں میرے لئے سب سے محفوظ قلعہ یہی ہے۔ شیلہ میری جگہ کی دوست ہے اور اس کے موجودہ ٹھکانے کا سوا اے میرے اور کسی کو علم نہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے مختصر الفاظ میں شیلا کی کہانی بھی سنادی.....

چنانک ہی دروازہ کھلا اور شیلانٹرے اٹھائے اندر چلی آئی۔

”بہت کمزوری ہو رہی ہے۔“

کامنی نے شیلہ کو طاہر کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

”ارے بھئی اتنا خون بہہ گیا کیا خون بہنے سے طاقت آئے گی۔۔۔ اب مجھے تمہارے دھندے کا علم تو ہے۔۔۔ ورنہ اس صوبی طور پر اکثر اے آر اے کے مریض کا علاج کیوں کرے جس کا جان بوجھ کر خون بہایا گیا ہو۔۔۔ احماد چکر۔“

اس نے کافی کی طرف سوپ کا پیالہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ شاید وہ ظاہر کی حالت کے پیش نظر سوپ بنا کر لائی تھی۔

”بھائی صاحب آپ برا مت مانیے گا۔ میں اسے بہت کچھ سنا چکی ہوں۔ اب اس کم
بخت کے سوا میرا اور سے ہی کون؟“

اس نے طاہر کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

کامٹی نے طاہر کو سہارا دے کر پلنگ پر بٹھایا اور اسے سوپ پلاتا چاہا۔ لیکن طاہر نے اس سے سوپ لے کر خود ہی پیٹا شروع کر دیا۔

سو پ پیتے ہوئے اسے قدرے راحت محسوس ہو رہی تھی۔

کلاسی نے خالی برتن ایک طرف رکھ دیئے۔ طاہر کے بار بار کہنے کے باوجود اس نے خود کچھ نہیں لیا تھا لیکن طاہر کی اس دھمکی کے بعد کہ چور دہی کچھ نہیں کھائے گا اس نے سوپ پینا شروع کر دیا تھا۔

شیلانے طاہر کو درد ختم کرنے کی گولیوں کے ساتھ ایک خواب آدرود بھی دے دی تھی اور اب اس کا بلڈ پریشر اور فیبر پھر چمک کر رہی تھی۔

”وَعَزَّوَجَلَّ“

اس نے بلند پیر چپک کرتے ہوئے طاہر کو داد دی پھر کاغذی سے مخاطب ہوئی۔

”کچھ ٹیسرے پلے ہے۔ صبح تک کنٹرول ہوگا۔ میں نے سونے کی دوا دے دی ہے۔ خیند آ جائے تو انہیں چکانا نہیں..... اور رُپ بھی ابھی کل تک چلے گی۔“

“ ”

کامیابی نے سر ہلایا۔

تو کچھ کھالے..... میں ذرا ان کی ”سلائیڈز“ دیکھ لوں۔

شیلہ جس نے طاہرہ کا کچھ خون نمونے کے لئے حاصل کیا تھا۔ اپنی دوست کی خاطر خود ہی لیبارٹری میں اس کا خون ٹسٹ کرنے جا رہی تھی۔ اسے خطرہ تھا کہ طاہرہ کو کوئی انفیکشن نہ ہو گیا ہو۔

یہ ندرہ بیس منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی۔

اس دوران طاہر کو خیندا آگئی تھی۔

شلال کا منی کو اشارے سے دوسرے کمرے میں لے گئی۔

“کے لیے۔“

کائنات کی مخلوق پر مشتمل ہے۔

”بڑی بہت والا ہے۔ سالی تو چھوٹا ہاتھ مارنے والی کہاں ہے۔ کمال ہے بھئی۔ تمام رپورٹس بالکل یکسر ہیں۔ اب کوئی گھبرانے والی بات نہیں۔ زخم تو دو روز ہی میں ٹھیک ہو جائے گا۔“

شیلہ نے اس کی طرف دیکھ کر آنکھ دھانی اور کاغذی بے اختیار مسکرا دی..... مسکراتے ہوئے اچانک ہی اس کی آنکھیں بھجرائی تھیں۔ شاید اس کے لئے اپنے جذبات پر قابو رکھنا ممکن نہیں تھا!

راحس اس شکر تھاجہ اس کی آنکھوں سے جھلکنے لگا تھا۔

شیلا اس کے دلی جذبات سمجھ رہی تھی اس نے بے اختیار کامنی کو گلے لگالیا۔ حیرت انگیز طور پر کامنی نے نارمل ہونے میں مانچ منٹ لگا دئے تھے۔

شِلا کے لیے یہ اچھے کی بات تھی۔ اس کی سہیلی تو بالکل مرد تھی۔ اور خصوصاً اس نوکری نے اس سے عورتوں والی تمام ملائمتیں چھین لی تھیں۔

○ ○ ○

”شِلا..... اس کا نام پرکاش نہیں۔“

اس نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

”مجھے علم ہے کاشی..... یہ ہندو نوجوان نہیں۔“

ڈاکٹر شِلا کے جواب نے اسے حیرت زدہ کر دیا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”کاشی ڈسپنسر..... میں آخر کو ایک ڈاکٹر ہوں اور یوں بھی مجھے علم ہے کہ اتنی قوت

برداشت ہم لوگوں میں نہیں ہوتی۔“

شِلا نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

”تم ٹھیک سمجھی ہو شِلا.....“

یہ کہہ کر اس نے شِلا کو ساری کہانی سنا دی۔

لیکن..... بالکل سچی نہیں، کچھ واقعات بدل کر۔

اس نے طاہر کا تعارف انسپکٹر خان کی حیثیت سے کروایا تھا اور بتایا کہ دونوں کے

درمیان گہرے تعلقات قائم ہو چکے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے بغیر جینے کا تصور نہیں کر سکتے

جبکہ اس کے اعلیٰ افسران اور سماج کے لئے یہ ناقابل برداشت ہے اس لئے وہ جان بچا کر بھاگ

آئے ہیں۔ طاہر پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا جس نے انہیں بھاگنے پر مجبور کیا ہے۔

”ہوں لں..... تو یہ بات ہے۔ سالی بڑی باتیں کرتی تھی۔ اب بتاؤ بھی پتہ ہے

کر نہیں۔“

ڈاکٹر شیلانے محبت سے اس کی کمر پر ہاتھ مارے ہوئے کہا۔

”شیلانہ... تم ٹھیک کہتی ہو... میں نے زندگی میں کبھی ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔ بس تو یہ سمجھ لے جس پیشہ سے میرا تعلق تھا اس نے میرے اندر موجود رہی کسی انسانیت کو بھی ختم کر دیا ہے۔ لیکن مجھے علم نہیں تھا کہ اس طرح اتنی بے اختیار ہو جاؤں گی۔ شیلانہ شاید میں کبھی اتنی محبت نہ کر پاتی۔ میرے سامنے تیری مثال نہ ہوتی۔“

اس نے آخری بات کہہ کر ڈاکٹر شیلانہ پر زبردست نفسیاتی حملہ کیا تھا جس نے شیلانہ کو چاروں شانے چت کر دیا۔ اس نے ایک لچکر محبت کے حق میں ہندو سماج کے خلاف دیا اور اسے جذبہ تحسین پیش کرنے کے بعد صبح تک آرام کرنے کی تلقین کرتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

یوں تو کامنی پہلی ہی مطمئن تھی۔

لیکن... شیلانہ کے رویے نے اس میں زیادہ اعتماد پیدا کر دیا اسے امید تھی کہ اب وہ اس نرک (جہنم) سے نکل جانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ظاہر گہری نیند سو رہا تھا۔ یہ ڈاکٹر شیلانہ کی دوا کا اثر تھا۔ کامنی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی دانست میں اس کی نبض چیک کی اور مطمئن ہو کر سر ہلاتی اس کے بستر کے نزدیک ایک ایک آرام دہ کرسی پر آگئیں پھیلا کر بیٹھ رہی۔ اس نے اپنے پاؤں ظاہر کے پتک پر رکھے ہوئے تھے۔

کامنی سونا چاہتی تھی۔ لیکن اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ ظاہر کو ابھی تک بخار تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد اسے اوگھسی آئی اور وہ کرسی پر ہوئے سے سو گئی۔

ظاہر کی آنکھ معمول کے مطابق صبح فجر کی نماز کے وقت کھلی تھی۔ اس نے دیکھا اس کے سر ہانے لٹکی گلو کوڑی بول خالی تھی۔ کامنی نے اس سے ڈرپ الگ کر دی تھی لیکن اس کے بازو میں سرخ لٹکی ہوئی تھی۔

ظاہر کو کامنی کی حالت کا اندازہ تھا وہ جانتا تھا کامنی صرف جسمانی ہی نہیں روحانی کرب کا بھی شکار ہے۔ خصوصاً اسے گولی گتے کے بعد سے وہ لاشعوری طور پر خود کو اس کا مذہب دار سمجھ کر وہ احساس گناہ کا شکار ہے۔

اسے اس حالت میں لینے دیکھ کر ظاہر کا دل بھر آیا۔

کرسی میں میز می میز می سو رہی کامنی کی گردن ایک طرف کرسی کی پشت سے ٹکی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر اس لمحے ایک زمانے کی معصومیت سم آئی تھی۔ ظاہر حیران ہو رہا تھا کہ یہی ”را“ کی انٹرکٹر کامنی اگر وال ہے؟ اس کے سامنے ایک معصوم اور مظلوم بچی کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ پھر کسی نا دیدہ ہستی نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی کہ یہی کامنی کا اصلی روپ ہے۔ اس سے پہلے جو کچھ بھی تھا وہ اصلیت نہیں تھی وہ تو ایک خول تھا جو حالات اور سماج نے اس کے چہرے پر زبردستی چڑھا رکھا تھا۔ جیسے ہی اسے موقع ملا اس نے نقاب نوج کر پھینک دیا۔

ظاہر نے کروش بدل کر اعزازہ کیا کہ اس کی توانائیاں واپس لوٹ آئی ہیں۔ اپنی دانست میں وہ آواز پیدا کئے بغیر اٹھ کر بیٹھا۔

لیکن... ابھی اس نے سمہری پر بیٹھے ہوئے بمشکل زمین پر پاؤں رکھے ہی تھے جب اچانک کامنی کی آنکھ کھل گئی۔

”کیا ہوا... تم ٹھیک تو ہوناں۔“

اس نے بے چینی سے دریافت کیا اور بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”کامنی میں بالکل ٹھیک ہوں۔ لیکن تم کیوں خود کو بیمار کرنے پر تلی ہو۔ پلو اٹھو شاہاں کچھ دیر کے لئے سو جاؤ۔“

اس نے کامنی سے کہا۔

ظاہر میں بالکل آرام سے ہوں۔

کامنی نے اس کی تشریش جان کر کہا۔

لیکن اس مرتبہ ظاہر نے اس کی بات سننے سے انکار کر دیا اور اسے بادل خواستہ ساتھ والے چنگ پر لے لٹا پڑا۔

ظاہر اب ہاتھ روم کارخ کر چکا تھا۔ پانچ دس منٹ بعد وہ باہر آیا تو اس کا چہرہ دھلا ہوا تھا۔ شاید اس نے وضو کیا تھا۔ کامنی کی آنکھوں میں نیند کہاں وہ بظاہر آنکھیں بند کئے لٹکی رہی تھی لیکن کن آنکھوں سے ظاہر کا جائزہ لے رہی تھی۔ جس نے کمرے میں کھڑے ہو کر نیز پر رکھی اپنی گھڑی سے سمت کا اندازہ کرنے کے بعد کرسی پر دیر کامنی کا دپنڈا اٹھا پھوڑا۔ سے ایک ہاتھ سے

دروازہ کھلا اور کامی ناشے کی لڑے دھکیلتی اندر آ گئی۔

”کیا چل رہا تھا؟“

”دوغلاری تھی خان بھائی کو..... لیکن مشکل ہے بھی۔“

شیلانے ہنسنے ہوئے کہا۔

تینوں نے ناشتہ اٹھنے کی بات کی۔

ڈاکٹر شیلانے انہیں بتایا تھا کہ تین چار دن تک ڈاکٹر آئزک نہیں آ سکتے اور وہ اکیلی

اپنے دو تین مانتوں کے ساتھ کلینک چلا رہی ہے۔

ظاہر نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ پرائیوٹ قسم کا چھوٹا سا ہسپتال تھا جسے دونوں میاں

بیوی مل کر چلا رہے تھے۔ ڈاکٹر مارجرین تھا اور شیلانہ بہت اچھی فزیشن بھی تھی۔ یہ اتفاق تھا کہ آج

یہاں کوئی موجود نہیں ورنہ یہاں عموماً دو تین مریض ضرور زیر علاج رہا کرتے تھے۔ دونوں نے

سرکاری نوکری پر سے تریج دی تھی البتہ ڈاکٹر آئزک بھی تک سرکاری ہسپتال سے وابستہ تھے اور اسی سلسلے

میں شیلانہ گئے ہوئے تھے۔

”مجھے اب کلینک میں جانا ہے۔ یہاں گھر کے اس حصے میں کوئی ٹریفک نہیں ہوتی۔ تم

جاتی ہو تو کر رکھنا ہم دونوں پینڈ نہیں کرتے اس لئے اطمینان سے یہاں جب تک رہنا چاہتے ہو

رہو۔ مجھے کہنا تو نہیں چاہیے لیکن کہے دیجیے ہوں کہ اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھنا اس کی ہر شے پر

تمہارا اتنا ہی حق ہے جتنا میرا لیا آئزک کا۔“

○ ○ ○

کامی نے استفسار نہ نظروں سے ظاہر کی طرف دیکھا شاید اگلا پروگرام جانا چاہتی

تھی۔

”میرے خیال سے ہمیں جلدی نکل جانا چاہیے کہیں ہماری وجہ سے ڈاکٹر شیلانہ پر۔“

”نہیں ظاہر۔“

کامی نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا۔

”ابھی نہیں۔ کم از کم آج سارا دن اور اگلے رات جہیں ہمیں گزارنا ہوگی۔ یہ تمہارے

آئندہ سفر کے لئے ضروری ہے۔ شیلانہ مجھے زندگی بھر معاف نہیں کرے گی اگر ہم یہاں سے اسے

”فرمائیے۔“

ظاہر مدتن گوش تھا۔

”مجھے علم نہیں کہ آپ میں سے پہلے کس کی طرف سے ہوئی تھی لیکن کامی کا دل جیتنا

مہا مہارت جیتنے سے زیادہ بڑا کارنامہ ہے۔ ہمارا بچپن ’لائکین اور اب جوانی بھی اکٹھے گزرے

ہیں۔ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ کامی جب کوئی فیصلہ کر لے تو اس پر آخری دم تک

قائم رہتی ہے۔ بس اسے اپنے ایک فیصلے کا پچھتاوا ہوا تھا کہ اس نے ’را‘ کی نوکری کیوں کر لی

۔ شاید قدرت نے تم دونوں کا ملاپ ہی اس لئے کروایا ہے کہ اب اسے کامی کی مزید منشن

برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ خان بھائی مجھے یہ بات کہنی چاہیے یا نہیں! کچھ اندازہ نہیں ہو پارا لیکن

کہے دیجیے ہوں معلوم نہیں زندگی میں اب کب ہمارا ملاپ ہوگا۔ ہوگا بھی کہ نہیں۔ سوچتی ہوں

نہ کہہ سکی تو ایک غلط سی دل میں رہ جائے گی۔ خان بھائی۔ شاید جہیں یقین نہ آئے کہ کامی

اور میں دونوں دھارک ہندو گھرانوں میں جنم لینے کے باوجود کبھی ہندو نہیں بن پائیں۔ شاید

شروع ہی سے ہم چٹائی کی تلاش کے مشن پر تھے۔ میں اپنی بات تو نہیں کہتی لیکن کامی کے حلق

ضرور کھول گئی کہ مر سکتی ہے کبھی اپنا قول نہیں پار سکتی۔ خان بھائی! ممکن ہے زندگی میں ایسے

مواقع آئیں کہ آپ کو کامی پر قصداً سے لیکن تب اپنی اس بہن کی خاطر اسے معاف کر دینا۔“

ڈاکٹر شیلانہ نے کہا۔

ظاہر اس کے انداز گفتگو اور چہرے کے جذبات سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ ڈاکٹر شیلانہ

اپنی دوست سے کتنی محبت ہے اور وہ اس کے لئے کیا بیکو کر گزرے گی۔

”ڈاکٹر شیلانہ۔ میرے پاس کوئی ایسا نسخہ نہیں جس کے ذریعے پاپ تول کر کے میں

اپنی چٹائی اور جذبے کی قوت ثابت کر سکوں۔ لیکن ایک بات ضرور ہے کہ میں کامی اور آپ

دونوں کے احساں کو کبھی نہیں بھینچاؤں گا یہ میرا وعدہ ہے۔“

اس نے اپنا دایاں ہاتھ ڈاکٹر شیلانہ کی طرف بڑھا دیا۔

”وش یو آل دی بیسٹ۔“ Wish you all the best

ڈاکٹر شیلانہ نے اس کا ہاتھ گرم جوشی سے دبا یا اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ شخص جھوٹ

نہیں بول رہا ہے بلکہ سچی ادکاری کر رہا ہے۔

بتائے بغیر نکل گئے وہ کل صبح تک تہارے ذہن کی کیفیت جاننے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کرے گی۔“
 ”ہوں..... جیسی تمہاری مرضی۔“

طاہر نے سر تسلیم خم کیا۔

”تم زیادہ آرام کرنے کی کوشش کرو..... میرے خیال سے ہمیں اب یونی کی طرف واپس جانے کے بجائے ہا چل پردیش ہی میں کچھ عرصہ چھپنا پڑے گا۔ اس طرف ان لوگوں کا خیال کم ہی جائے گا..... یوں بھی وہ سرحدوں کی طرف جانے والے تقریباً تمام مکمل راستے اب تک سب سے محفوظ ہیں۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ اب سے تھوڑی دیر بعد تک انہیں کرنل مونگیا کی لاش مل جائے گی جس کے بعد ممکن ہے وہ اس گاڑی کے متعلق جانکاری حاصل کریں جو ہمارے قبضے میں ہے۔“

کاشی نے مندیہ نظر کیا۔

”ہاں..... یہ سب سے اہم بات ہے۔ گاڑی ٹھکانے لگانا ضروری ہے اور یہ بھی علم نہیں ہونا چاہیے کہ گاڑی ڈاکٹر کے کلینک تک آئی..... میرے خیال سے پولیس والوں کو تو کچھ یاد نہیں رہے گا۔ تم نے اسے غلط منزل بتائی تھی۔“
 طاہر نے کہا۔

”ویل..... مجھے سب سے پہلے گاڑی کو ٹھکانے لگانا ہو گا وہ بھی فوراً..... یہاں صبح زیادہ مود منٹ Movement نہیں ہوتی..... مل ٹیشن ہے اور کل یہاں مشہور ”جوالا کھی“ میل شروع ہو جائے گا۔ قدرت ہمارے حال پر خود ہی مہربانی کر رہی ہے۔“

کاشی نے کہا۔

”ٹھیک ہے..... اپنا خیال رکھنا اگر مناسب سمجھو تو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“

طاہر نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

”تم مطمئن رہو..... مجھے علم ہے کہ کیا کرتا ہے..... تم آرام سے بیٹھے رہو..... زیادہ مناسب یہی ہے کہ سونے کی کوشش کرو..... طاہر تم اندازہ نہیں کر سکتے شیلہ مجھ سے کتنی محبت کرتی ہے۔ اگر تمہارا بخار نہ اتنا تھوڑا تو وہ کبھی ہمیں یہاں سے نہیں جانے دے گی..... کبھی بھی۔“

کاشی نے میز سے گاڑی کی چابیاں اٹھاتے ہوئے کہا۔

”مذکورہ..... خدا حافظ۔“

طاہر کے لئے اس وقت کاشی کی بات ماننے کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ نہیں تھا۔ کاشی اس علاقے سے آگاہی رکھتی تھی ذہنی اور جسمانی طور پر بھی فی الوقت وہی زیادہ اکیٹو تھی۔ ڈاکٹر شیلہ کا کوٹ پہن کر وہ باہر نکل گئی۔ طاہر دل ہی دل میں اس کی کامیابی کے لئے دعا کرنے لگا۔ اس نے پوریت سے سنبھلنے کے لئے ڈی آئی آر کیا۔ ڈاکٹر شیلہ نے کھل لگائی ہوئی تھی اور طاہر دُش کے پروگراموں سے لطف اندوز ہونے لگا تھا۔

ابھی تک ڈاکٹر شیلہ کا کوئی ملازم ڈیوٹی پر نہیں پہنچا تھا۔ کاشی نیچے اس کے کلینک میں آگئی تھی۔

”کیا ہوا۔“

ڈاکٹر شیلہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”میٹ کھولو..... میں گاڑی یہاں سے لے جاؤں اور کہیں اور چھوڑ دوں گی۔“
 کاشی نے اسے بتایا اور شیلہ سمجھ گئی وہ کیا چاہتی ہے۔

”چلو۔“

اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

کاشی نے کیراج کے ایک کونے میں دھرے ڈم سے ایک پلاسٹک کین میں کچھ پٹرول لے لیا تھا یہاں لوگ مٹی کا تیل اور پٹرول اکٹرا کر رکھتے تھے۔ ڈبہ گاڑی میں رکھ کر اس نے گاڑی سنارٹ کی اور باہر آگئی۔

شدید سردی نے باہر کے ماحول کو ٹھنڈ کر دیا تھا۔ دھند کی وجہ سے چند گز دور بھی کچھ صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔

کاشی نے اپنے ذہن میں اس سڑک پر گزشتہ سال کے سفر کو دہرایا اور ایک نیپلے پر پہنچ کر گاڑی آہستہ آہستہ چلاتی ہوئی شہر سے باہر لے آئی۔

○ ○ ○

اس نے جنوب کی سمت سفر شروع کیا تھا یہ نیز حائلز چاہاڑی راستہ تھا جس پر درخت کے جھنڈ دکھائی دے رہے تھے شیلہ نے جان بوجھ کر یہ راستہ اپنایا تھا۔ اب وہ قریباً کچی سڑک پر

جنگل میں داخل ہو چکی تھی۔

عام حالات میں شاید ایسے خطرناک راستے پر اس موسم میں کوئی سفر کرنے کا خطرہ مول نہ لیتا لیکن اس کے لئے ناگزیر تھا۔ اب وہ جنگل کے اندر ہی اندر چلتی جا رہی تھی قریباً آدھ گھنٹہ کے بعد وہ ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں راستہ گہری کھائی نے مکمل بند کر دیا تھا۔

جنگل میں درختوں سے شبنم کے قطرے مینہ کی طرح زمین پر ٹپک رہے تھے۔ کاشی نے ڈبلیں بڑھ کر سارے کاغذات نکال لیے تھے اور اب وہ کاری نبر پلٹ کاری میں موجود ٹول بکس سے بچ کس نکال کر کھول رہی تھی جلد ہی اس نے دونوں نبر پلٹیں الگ کر لیں۔

سب سے پہلے اس نے گاڑی کے تمام کاغذات ایک ایک کر کے جلا دیے۔ پھر مطمئن ہو کر سر ہلاتی ہوئی گاڑی کے نزدیک آ گئی۔ گاڑی کو خطرناک حد تک اسی کھائی کے نزدیک لے آئی تھی۔

شارٹ گاڑی سے وہ نیچے اتر آئی اور اس نے گاڑی میں دھرا پڑول نکال کر اسے گاڑی کے اگلے حصوں پر اندر بیٹوں پر اچھی طرح چھڑک کر خالی کر لیا۔

گاڑی میں صفائی والے کپڑے کو اس نے ایک لکڑی سے باندھ کر آگ دکھائی اور جب وہ باقاعدہ جلنے لگا تو کاشی نے گاڑی کے کھلے دروازے سے اندر ہاتھ ڈالا اور اسے میٹر میں ڈال دیا چلتی ہوئی لکڑی اس نے کچھ فاصلے پر رکھ دی تھی۔

گاڑی جھٹکے سے آگے بڑھی اور اسی رفتار سے کاشی نے زقہ بھر کر چلتی لکڑی اٹھائی اور کھلے دروازے سے اندر پھینک دی۔ اگلا منظر دیکھنے کے لیے وہ یہاں ایک پل بھی نہیں رکھی تھی اور پوری رفتار سے بھاگتی ہوئی دور چلی گئی تھی۔

پڑول نے بارود کا کام کیا۔ جھگ کی آواز سے گاڑی جلنے لگی اور چلتی ہوئی آگ کا گولہ سینکڑوں فٹ گہری کھائی میں جا گرا۔

تھوڑی دیر بعد کاشی دوبارہ وہاں چلتی تو اسے نیچے سینکڑوں فٹ گہرائی میں چلتی ہوئی گاڑی کا ڈھانچہ دکھائی دیا مطمئن ہو کر اس نے سر ہلایا اور دونوں نبر پلٹیں اٹھا کر سڑک کی طرف چل دی۔

سردی ہڈیوں میں اتر رہی تھی۔

لیکن اس کے لئے ایسے موسمی شدائد برداشت کرنا معمول کی بات تھی۔ یہاں کے تربیت کا اعجاز تھا۔ کچھ فاصلے پر موجود جھاڑیوں میں اس نے نبر پلٹ کی مدد سے زمین کھودی اور دونوں پلٹیں اس میں دبا کر مٹی ڈال دی اب اس نے اپنی دانست میں گاڑی کا نام و نشان ختم کر دیا تھا۔

یہاں سے سڑک تک قریباً آٹھ نوکلومیٹر کا فاصلہ تھا جو اسے پیدل طے کرنا تھا۔ دور دور تک کسی ذی نفس کا نام و نشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یوں بھی یہاں کسی جانور کی موجودگی تو ممکن تھی انسان کی موجودگی ممکن نہیں تھی۔

کاشی نے دونوں ہاتھوں میں دستانے پہنے ہوئے تھے۔ سر پر گرم ٹوپی اوڑھی ہوئی تھی جو اتنی لمبی تھی جس سے قریباً سارا چہرہ ڈھک جاتا تھا۔ گردن پر اس نے سکارف باندھا ہوا تھا۔

کاشی نے دونوں ہاتھ کوٹ کی میسوں میں ڈال رکھے تھے اور جیب میں اپنا پتول اس طرح رکھا ہوا تھا کہ ضرورت پڑنے پر فوراً اسے استعمال میں لاسکے۔

اپنا کام ختم کرنے کے بعد اس نے گھڑی بردقت دیکھا صبح کے نو بج رہے تھے۔ کاشی کو امید تھی کہ ٹول تو کسی نے چلتی ہوئی کار دیکھی ہی نہیں ہوگی۔ اگر ایسا ہوا تو بھی یہاں پہنچنے کے لئے بھی کم از کم آدھا گھنٹہ تو یہاں پہنچنے تک لگتا۔

عادت کے مطابق اپنے کام سے مطمئن ہو کر اس نے سر ہلایا اور سڑک کی طرف اپنے سفر کا آغاز کیا۔ درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان وہ کسی جنگلی ہرن کی طرح راستہ بتاتی چلی جا رہی تھی اور دل ہی دل میں دھاما گنگ رہی تھی کہ راستے میں کسی جانور کا سامنا نہ ہوا اس طرح اسے فائر کرنا پڑتا اور یہاں سے سڑک تک فائر کی آواز آسانی سے جاسکتی تھی کیونکہ چھاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے کافی گونج پیدا ہوتی۔

شاید قدرت کو اس کی حالت پر رحم آ گیا تھا اور وہ ایک گھنٹہ میں سڑک تک پہنچ گئی تھی جہاں اب کا کاٹکس اور گاڑیاں آتی جاتی دکھائی دے رہی تھیں ان میں زیادہ تعداد میں وہ لوگ سفر کر رہے تھے جو سولان میں "جوالا کھی" کا سلیڈ کھینے آ رہے تھے۔

کاشی نے یہاں سے کسی بس پر سوار ہونے کے بجائے پیدل چلنے چلے جانے کو ترجیح دی اور قریباً ڈیڑھ گھنٹہ مسلسل پیدل چلنے کے بعد وہ ایک اور چھوٹے سے قصبہ تک پہنچے جس

کامیاب ہوئی۔

○ ○ ○

یہاں موجود ایک پرائیویٹ پی سی او نے اس سے پہلے ڈاکٹر شیلہ کو فون کیا اور طاہر سے بات کر کے اسے اطمینان دلایا اس کی خبر تیرے دریافت کی اور اپنی منزل بتائے بغیر فون بند کر دیا۔

طاہر جانتا تھا کاشی بھی اس کی طرح تربیت یافتہ انٹیلی جنس آفیسر ہے۔ اس نے فون پر اپنا نام تک نہیں بتایا تھا۔ صرف آواز سے ہی شناخت کروائی تھی۔ اس نے شاید ابھی تک اس امکان کو ذہن میں رکھا تھا کہ ”را“ نے یہاں حساس مقامات پر لگے فون بک کرنے کا انتظام نہ کروا لیا ہو اسے علم تھا کہ ”را“ کے کاؤنٹر انٹیلی جنس سیل کے پاس فون ٹیپ کرنے کا جدید ترین موبائل نظام ہے اور وہ کسی بھی جگہ اس نظام کو وہین میں رکھ کر لے جاسکتے ہیں۔

سولان تک واپس پہنچنے کے لئے کاشی اگر وال نے پانچ مختلف سیس تبدیلی کی تھیں اور دوپہر کے بعد ڈاکٹر شیلہ کے کلینک کی دیوار پھاہندہ کر طاہر کے کمرے تک اس طرح پہنچی تھی کہ طاہر اور شیلہ کو بھی اس کی خبر دروازہ کھول کر اندر آنے پر ہی ہوئی۔

”تمہاری یہ جاسوسوں والی عادت نہیں گئی۔۔۔ یہاں کیا مصیبت آئی ہوئی ہے جو تم چندوں کی طرح آئی ہو۔“

شیلہ نے جو کہا اس کے انتظار میں رکھے تھی تھی کہا۔

”تم ابھی بچی ہو مائی ڈیر ڈاکٹر شیلہ! بڑک۔ تم ابھی ان باتوں کو نہیں سمجھو گی۔۔۔ ا“

کاشی نے محبت سے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”کاشی ٹھیک کہتی ہے۔ بہن جی۔۔۔ میری آپ سے بھی درخواست ہو گی کہ یہاں ہماری موجودگی کا کوئی ثبوت بھی نہیں ہونا چاہیے۔ میرے زخم سے متعلق دو اداؤں سے متعلق علاج سے متعلق کچھ بھی نہیں۔۔۔“

طاہر نے کہا۔

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ اب آپ کاشی کی طرح سمجھنا شروع کر دیں۔۔۔“ اس

نے قہقہہ لگایا۔

تینوں نے اکٹھے کھانا کھایا۔ طاہر کا ٹیپر چڑباز ٹاٹل تھا جس پر شیلہ نے دل ہی دل میں اس کی بے پناہ قوت ارادی کو سراہا تھا کیونکہ اب تک اس نے خود کو اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر ہی قائم رکھا ہوا تھا۔

میری طرف سے اس مرحلے پر کوئی پریشانی محسوس نہ کرنا۔ کاشی! مجھے علم ہے جلد یا بدیر وہ لوگ جو تمہاری تلاش میں ہیں یہاں تک پہنچ جائیں گے لیکن اطمینان رکھنا کہ میں جیتے جی کبھی اس بات کا اقرار نہیں کروں گی کہ میں نے تمہیں شادی کے بعد کبھی دیکھا ہے۔ تم جانتی ہو کاشی کہ میں کچ بول رہی ہوں۔۔۔“

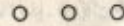
اچانک ہی ڈاکٹر شیلہ نے سنجیدگی اختیار کر لی تھی۔

”اتنی سیریس نہ ہو شیلہ۔ تمہارے جذبات کا اندازہ مجھ سے بہتر اور کون کر پائے گا۔ میں تمہیں سمجھوں سے جانتی ہوں۔ اس مرحلے پر جب کہ یہاں کی فضا نہیں اور ہوا نہیں ہماری دشمن ہیں صرف تم ایک ایسی ہوجس کے پاس میں مکمل اعتماد آگئی ہوں۔ شیلہ شاید تم اس بات کو نہ سمجھ پاؤ کہ کسی پر کبھی اعتماد نہ کرنا۔“ ہمارے بڑے کا پہلا اور بہترین اصول مانا جاتا ہے۔ ہمیں کبھی تربیت دی جاتی ہے کہ ہمارے بڑس میں کوئی لائق اختیار نہیں۔ لیکن تمہارے معاملات الگ ہیں۔ میں چاہتی ہوں تو پھر تم صاحب ہی سے ان کے زخم کا علاج کروا کر کسی اور طرف نکل جاتی لیکن شیلہ! ایک شخص سی دل میں رہ جاتی کہ آخری مرحلے تک لے کر نہیں آئی۔ تو جانتی ہے ہم نے زندگی کا کوئی بڑا فیصلہ ایک دوسرے کو متائے بغیر نہیں کیا۔۔۔ جب تو نے اس معاہدے کو کبھی نہیں توڑا تو میں ایسا کیوں کرتی؟۔۔۔“

کاشی نے کہا تو شیلہ نے اٹھ کر بے اختیار اسے گلے لگالیا۔

”مجھے علم تھا کاشی تو کبھی غلط اور چھوٹا فیصلہ نہیں کرے گی۔ دراصل ہم دونوں اپنے سماج کی باقی ہیں۔ ہم دونوں میں اپنے دھرم کے شہر کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی تھیں۔ لیکن یہ کبھی نہ بھولنا کاشی کہ یہ ہماری تمہاری آخری ملاقات نہیں ہے۔ ایسا ممکن ہی نہیں کہ میں زندہ ہوں تم زندہ ہو اور اور ہم مل نہ سکیں۔۔۔ دوبارہ کبھی ایسی بات نہ بان پر نہ لانا۔“

دونوں سہیلیاں قدرے جذباتی ہو رہی تھیں اور طاہر دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ عورت کیسا ہی روپ کیوں نہ اختیار کر لے وہ بہر حال عورت ہوتی ہے۔۔۔



اس روز ”جوالہ کشی“ میلے کا آغاز ہو گیا تھا۔ سولان جیسے چھوٹے مل مشین پر رونقیں لوٹ آئی تھیں۔ ہر طرف پہلے چٹا برہمجنڈے اور دوپٹے نظر آ رہے تھے۔ دور دراز سے کئی سیلوں کا پیدل سفر طے کر کے یا تری یہاں کی مخصوص ”بھلا پوجا“ میں شرکت کے لئے آئے تھے اور انہوں نے کچھ دنوں ہی کے لئے کسی ایسے علاقے کو آباد کر دیا تھا۔

وہ رات دونوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی ڈاکٹر شیلہ کے بعد ہونے پر یہاں بسر کی تھی کیونکہ اگلے روز وہ خود طاہر کے زخم کا جائزہ لینا چاہتی تھی۔

اس کے بس میں ہوتا تو ساری زندگی دونوں کو یہاں سے نہ جانے دیتی لیکن بادل غواہت ان کی حفاظت کے مد نظر بنا کر اس نے دل پر بھر رکھا کہ انہیں جانے کی اجازت دے دی تھی۔

ڈاکٹر شیلہ نے ایک بیک میں طاہر کے زخم سے متعلق تمام ادویات اور پیشیاں وغیرہ رکھ دی تھیں دونوں کو اپنا خاص خیال رکھنے کی تلقین کی تھی اور کاشمی سے کہا تھا کہ وہ پانچ روز کے بعد اس کے زخم کے ٹائیکل کھلاوے۔

اس نے کاشمی سے اس کی اگلی منزل بارف بابہ نہیں کی تھی۔ لیکن اسے اپنی خیریت سے مطلع رکھنے کے لئے کہا تھا۔

”ایک بات شاید دل میں رہ جائے تو غلطی سی رہے گی۔ کاشمی۔ کاش تم میرے ساتھ آدھا چلے نہ لو۔ میں جانتی ہوں خان بھائی کا قلعق اس دیش سے نہیں۔ لیکن تو نے مجھ سے یہ کیوں چھپائے رکھا اس کا علم نہیں ہو پایا۔“

جانتے ہوئے شیلہ نے کہا۔

”شیلہ تو جانتی ہے کبھی کبھی پورا چل بہت خطرناک ہو جاتا ہے۔ بعض باتیں نہی کہی جائیں تو بھی اپنے پیاروں تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہ بھی ان میں سے ایک بات تھی۔“

کاشمی نے اس سے گلے ملتے ہوئے کہا۔

دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

”خان بھائی۔ یہ اپنی بہن کی طرف سے حقیر سا نذرانہ سمجھنا۔ مجھے یہ علم ہے

تمہارے لئے اسے قبول کرنا مشکل ہو گا لیکن میری خواہش کچھ کر رکھ لینا۔ ابھی زندگی میں بہت سے مواقع ایسے آئیں گے جب ہم ایک دوسرے کے لئے بہت کچھ کر سکیں۔“

یہ کہہ کر اس نے لفافے میں بند کچھ ٹھکانے طاہر کو ہاتھ دیئے۔

بڑی عجیب صورت حال طاری ہمارے لئے انہیں واپس لوٹانے سے قبول کرنا زیادہ آسان تھا کیونکہ اس مرحلے پر وہ ڈاکٹر شیلہ کی کسی خواہش کو رد نہیں کر سکتے تھے۔

شیلہ کی آنکھیں اچانک ہی چمک پڑی تھیں وہ فوراً دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ کاشمی کی حالت بھی مختلف نہیں تھی۔

”کاشمی خود کو نارمل رکھو۔ ہمیں ڈاکٹر شیلہ کو مزید دکھ نہیں دینا۔ اس کی عظمت کا اعتراف کرنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ اپنے جذبات پر قابو رکھو۔“

اس نے کاشمی سے کہا اور کاشمی کو جیسے ہی اس کی بات سمجھا کی وہ نارمل ہو گئی۔

اس مرتبہ ڈاکٹر شیلہ کمرے میں آئی تو اس نے ایک بڑا گرم کوٹ اٹھا رکھا تھا ایسے کوٹ کو جنہیں مقامی زبان میں ”براغڑی“ کہا جاتا تھا یہاں کے موسم کی ضرورت اور تاگزیر ہوتے تھے۔

”خان بھائی یہاں تو کوئی ڈھنگ کا نہیں ہے۔ چند روز پہلے شیلے سے آتے ہوئے میں نے آئینک کے لئے یہ کوٹ خرید لیا تھا۔ یہ اپنی تو چاہتا تھا تمہارے ساتھ جا کر خود تمہارے لئے کوٹ خریدتی لیکن ایسا ممکن نہیں۔ اسے اپنی بہن کی طرف سے تحفہ سمجھ کر قبول کر لینا۔“

اس نے یہ کہتے ہوئے کوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

دونوں ملگ ہو چکے تھے۔

ڈاکٹر شیلہ کے بے پناہ غلوں اور کاشمی سے محبت نے دونوں کو بہت کر دیا تھا اس نے کاشمی کے لئے بھی بہترین گرم کپڑے دیئے تھے اور دونوں کو اپنی دعاؤں آنسوؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ رخصت کیا تھا۔

ان کی خواہش اور کاشمی کی ضد پر وہ انہیں رخصت کرنے کے لئے باہر تک بھی نہیں آئی تھی۔ اور مگر کے دروازے سے ہی جو کھینک کے دروازے کی دوسری سمت تھا انہیں رخصت کر کے آنسو بہاتی واپس لوٹ گئی تھی۔

اس کے غلوں نے طاہر کو بے پناہ متاثر کیا تھا اور زندگی میں شاید پہلی مرتبہ وہ بھی قدر سے جذباتی ہو رہا تھا۔ کاشی کے لئے تو اپنے آنسوؤں پر قابو رکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔

○ ○ ○

بریکینگ نیر مہترہ کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ کل سے اب تک کٹرل مونگیا نے اس سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ یہ خلاف معمول اور انتہائی غلط بات تھی۔ گوکہ کٹرل مونگیا اپنی برسرِ ارادہ اور پریشان کن عادات کی وجہ سے ہمیشہ ہی ایک الگ مقام کا حامل رہا تھا۔ لیکن اس سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ ڈیپن کے معاملہ میں بھی کسی غیر اصولی کا مظاہرہ کرے گا۔

ہزاری کیس کے تمام سیکورٹی انتظامات ملٹری انٹیلی جنس کرتی تھی اور کٹرل مونگیا بھی وہیں سے آیا تھا۔ گوکہ یہاں ہونے والی کسی بھی ”کھٹانا“ (آفت) کی اطلاع انہیں فوری طور پر صرف ملٹری انٹیلی جنس ہی کو دینی ہوتی تھی۔

لیکن..... کاشی اگر وال کا قتل چونکہ ”را“ سے تھا جسے انہوں نے مخرب کاروں کی تربیت کے لئے ”را“ سے بطور خاص درخواست پر مانگا تھا اس لئے اس کی کشیدگی کی اطلاع ”را“ کو دینا ضروری تھا۔

یوں بھی بریکینگ نیر مہترہ کسی بھی صورت کم از کم ”را“ کی ناراضگی مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے یہی کام کیا تھا اور یہاں کی صورت حال کو سنبھالتے ہی براہِ راست دہلی ہیڈ کوارٹر سے بات کی تھی۔

یہ الگ بات تھی کہ اس کے فون سے پہلے یہاں ٹوٹنے والی قیامت کا علم ”را“ کو ہو چکا تھا۔ ”را“ کا مقامی ہونٹ بہت چوک تھا خصوصاً ایسے حساس ایریا میں وہ اپنے انتہائی اہم اور لائقِ شرافت کو تعینات کرتے تھے۔

”را“ کا مقامی ہونٹ انچارج میجر پردیپ سنگھ پہلے آرمی کی پینشنل انٹیر وگیشن ٹیم میں تھا اور تین سالوں میں اپنے زیرِ نگرانی چندہ نو جوانوں کو یکے بعد دیگرے موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ یوں تو اسے تین سال کے لئے ڈیپنیشن پر ”را“ میں بھیجا گیا تھا لیکن بعد میں اس کی خدمات مستقل ”را“ کو سونپ دی گئیں۔

پردیپ سنگھ نام سے کتنے تھاکین وہ جاٹ کے بجائے مذہبی سکھ تھا اور اس کا باپ اس کی

پیدائش سے چند سال پہلے ہی اپنی قوم ہندو کے چھوڑ کر سکھ مہرم میں داخل ہوا تھا۔ اگر سکھوں کو علم ہو جائے گا کہ اس کے ہاں جنم لینے والا پردیپ سنگھ سکھوں کے لئے مستقبل میں ڈریگولا بن جائے گا تو وہ کبھی پردیپ سنگھ کے باپ کو ”امرت نہ چکھاتے“ لیکن ہونی شبدی۔

پردیپ سنگھ نے کیس رکھے ہوئے تھے اور بظاہر سکھوں والی تمام عادتیں اپنائی ہوئی تھیں لیکن اندر سے وہ کھال اتارنے والا مکمل ہندو تھا۔ اس نے انسانی کھال اپنے ہاتھوں اتار کر درندگی کی انتہاؤں کو چھوا تھا۔

تین ماہ پہلے اسے ڈیڑھ دوں کا سکورٹی چیف بنا کر بھیجا گیا تھا اور یہاں پہنچنے کے چند دنوں بعد اس نے ہزاری کیس کے اندر واپس ہاں پر اپنے بھجروں کا ایسا جال بن دیا تھا کہ یہاں ہونے والی کسی بھی کارروائی کی خبر اسے فوراً پہنچ جاتی تھی۔

دھماکوں کے آغاز سے دو گھنٹے بعد ہی اس کے ”سورس“ حوالدار آتمارام نے جو اس وقت اپنے کوارٹر میں موجود تھا۔ طوفانی رات میں ”را“ کے مقامی سیف ہاؤس پر پہنچ کر پردیپ سنگھ کے ایک ماتحت تک یہ خبر تفصیل سے پہنچا دی تھی۔ جس کے اگلے ہی لمحے پردیپ سنگھ کو فینڈ سے چمکا کر یہ اطلاع دی گئی تھی جہاں سے یہ اطلاع فوراً ولی پھنچا دی گئی۔

بھی تک انہیں دھماکوں کے کارکن (دب) کا علم نہیں ہوا تھا۔ صبح تک ساری پوزیشن ان کے سامنے آگئی تھی اور پردیپ سنگھ کی طرف سے اس اطلاع کے بعد کہ دونوں مسلمان دہشت گردوں کے ساتھ ان کی انٹرکمز کاشی اگر وال بھی غائب ہے سب کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔

”ایسا ممکن ہے وہ اپنے طور پر لاپتہ ہو.....“

دہلی سے ڈی۔ جی نے بے یقینی کے لہجے میں کہا تھا۔

”کوسر..... میں نے مکمل انکوائری کی ہے۔“ She is involve with (د)

ملوث ہے) شاید وہ لوگ کاشی کو درغلا نے میں کا سیاب ہو گئے ہیں.....“

”ڈیمیاٹ.....“

دوسری طرف ڈی۔ جی ٹیم میں اتنے زور سے چیخا کہ پردیپ سنگھ کے ہاتھ میں فون

روز کردہ گیا۔

”پر دیپ سنگھ مجھے لڑکے کا بیٹا مجھے فوراً بتاؤ۔ جڑ بھی چاہیے میں دوں گا یہاں دہلی سے میں تمہاری مکمل مدد کروں گا۔ But مجھے ہر صورت کاغذی اگر دال چاہیے۔ اگر وہ ہارڈ کر اس کرکٹی تو ہم سب کے لئے خود کشی کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں بچے گا۔ کوئی راستہ نہیں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو ناں۔“

”نہیں سر۔۔۔ آپ مطمئن ہو جائیں مجھے پانچ لڑکے فوراً دیجئے میں ”فری ہینڈ“ چاہتا ہوں سر۔۔۔ پھر دیکھوں گا سالی کو۔“

اس نے کاغذی کو موٹی سی کالی دی۔

”تمہیں سب کچھ ملے گا پر دیپ سنگھ سب کچھ Get in touch مجھے ایک مودسٹ کی خبر دو۔ ایک ایک لمحے سے باخبر رکھو۔ کسی کو خاطر میں نہ لانا۔ کسی کی پرواہ نہ کرنا۔ پر دیپ I Want result (مجھے نتیجہ چاہیے) ہر صورت میں۔۔۔ تم چوبیس گھنٹے میں کسی بھی سے پر مجھے کال کر سکتے ہو۔ جتنی فورس چاہو گے یہاں سے پہنچ جائے گی۔ لڑکے تمہارے پاس آگے دو کھٹے میں پہنچ جائیں گے۔ میں بجلی کا پڑا بیج کرتا ہوں۔“

ڈی۔ جی نے کہا۔

اب اس کی آخری امید پر دیپ سنگھ ہی تھا۔

اگر کاغذی اگر دال ان کے ہاتھ سے نکل جاتی تو ”را“ کے لئے یہ ڈوب مرنے کا مقام تھا۔

پر دیپ سنگھ نے ہیڈ کوارٹر سے اجازت لینے کی جھٹ بھی پوری کر لی تھی۔ ایک مرتبہ نیند سے جاگنے کے بعد اس نے دوبارہ نیندروم کا سٹیشن دیکھا تھا۔ اب وہ اپنے آفس میں موجود تھا جو اس عمارت کے گراؤ پر غور پر رہا ہوا تھا جہاں دور رہتا تھا۔

○ ○ ○

آدھی رات کو اسے آفس میں دیکھ کر اس کے سارے ہاتھ چوکنے ہو گئے۔ پر دیپ سنگھ نے ایک عرصے سے اپنی مرضی کی ٹیم اپنے ساتھ رکھی ہوئی تھی۔ یہ دو لوگ تھے جو سمجھ صاحب کے مزاج سے مکمل آشنائی رکھتے تھے۔ انہیں اپنے دوسرے ساتھیوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ

مرعات حاصل تھیں۔ لیکن وہ ”بہترین رزلٹ“ دینے میں سب سے آگے تھے۔ سارا عمل چوکس ہو گیا۔

جسور بے تھے انہیں جاننے والوں نے جگا دیا اور اب ایک پیش بین کے فاصلہ پر ہر ماتحت اس کا منتظر تھا۔ اس کے کسی بھی حکم پر پلک جھپکنے میں کرنے کو تیار۔!!

سب سے پہلے پر دیپ سنگھ نے اپنا کیپڑا آن کیا۔

اس کیپڑے کی سکرین پر انسٹرکٹر کاغذی اگر دال سے متعلق تمام معلومات موجود تھیں۔ جو معلومات اس سکرین پر آئی تھیں ان کو جمع کیا جاتا تو ایک مکمل کتاب بن سکتی تھی۔

اس میں کاغذی اگر دال کی پیدائش سے اب تک ایک ایک لمحے کی تفصیل درج تھی۔ اس کی عادتیں، پسند نا پسند، دوستیاں، دشمنیاں، خیالات، دھرم، سانچ، رائج ترقی سے متعلق اس کے واپار، کھانا، چٹا، اٹھنا، بیٹھنا، عام زندگی، خاص زندگی، غرض کوئی شبہ زندگی ایسا نہیں تھا جس سے متعلق سب کچھ درج نہ ہو۔

پر دیپ سنگھ کی نظریں بڑی تیزی سے سکرین پر پھیلے الفاظ سے پہنچتی اور ایک ایک لفظ اس کے دماغ پر نقش ہوتا چلا جاتا۔

کچنٹ نے بلا کا ذہن پایا تھا۔

اس نے اپنے دائیں ہاتھ بیٹھی کرٹ چہرے اور درمیانی عمر کی ایک لڑکی کو جو اس کی سیکرٹری تھی کا فوڈ پل سنبالنے کا حکم دیا اب وہ اپنے لئے اہم معلومات جن کی اسے مستقبل میں ضرورت پیش آسکتی تھی اپنی ماتحت کو لکھواتا جا رہا تھا۔

آخر میں اس نے اپنی ماتحت نیلم سے تمام معلومات دہرانے کے لئے کہا اور مطمئن ہو کر سر ہلایا۔

”آل رائیٹ۔۔۔ اب تم لوگ صبح آٹھ بجے تک اپنی نیند پوری کر لو۔ آٹھ بجے تک باقی دوست بھی آجائیں گے جس کے بعد پھر اپنا عمل شروع کریں گے۔“

اس نے نیلم کی طرف دیکھ کر کہا۔

”نہیں سر۔“

نیلم نے سر جھکا کر صاف دیکھا اور باہر آگئی اس نے باقی طاق کو بھی پر دیپ سنگھ کے حکم

سے مطلع کر دیا تھا اور اب یہاں معمول کی ڈیوٹی انجام دینے والے گاؤں زدہ گئے تھے باقی سب لوگ اپنے بستروں میں پہنچ گئے تھے۔ انہیں اب اس کس کے خاتمے تک جتنی بھی نیند میسر آتی وہ ان کے لئے بولس ہی تھا کیونکہ پردیپ سنگھ جب کسی کس کو ہاتھ میں لیتا تو نہ صرف اپنی بلکہ اپنے ہاتھوں کی نیند بھی حرام کر دیا کرتا تھا۔

○ ○ ○

صبح سات بجے ہیڈ کوارٹر سے پانچ بہترین ایجنٹ یہاں پہنچ چکے تھے۔ انہیں مقامی مکان کے ڈائریکٹر جنرل نے خصوصی ہدایات اور تیار یوں کے ساتھ یہاں بھیجا تھا۔ ان کے پاس کاشی کی درجنوں تصاویر تھیں۔

یہ وہ تصویریں تھیں جو ”را“ کے ریکارڈ میں تھیں اور جن کی کاپیاں یہ لوگ تیار کر رہے تھے۔ اپنے ساتھ لائے تھے۔

یہ تصاویر پردیپ سنگھ نے سارے شاف میں تقسیم کر دیں۔ اب اس نے سب کو بریفنگ ہال میں اکٹھے کر لیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد تین مختلف ٹیمیں تشکیل دے کر انہیں اپنے اپنے کمانڈر کے ماتحت تین مختلف ستوں میں روانہ کر دیا تھا۔ اسی اثنا میں اس کا مقامی ماتحت جواب بٹواری کپ پہنچ چکا تھا اسے بل پل کی خبر اور وہاں ہونے والی ڈیپٹمنٹ سے متعلق رپورٹ دے رہا تھا۔

ابھی تک انہیں کرل مونگیا کی اگلی منزل اور اس کی خبر نہیں ہوئی تھی گوکہ ”را“ کا ایک ”سورس“ مستقل اس سے چماتا تھا لیکن مونگیا نے اپنے ہاتھوں کو بھی اپنی اگلی منزل نہیں بتائی تھی۔

”ڈیم اٹ..... گودھا..... الو کا پٹھا“

اس نے مونگیا سے متعلق آخری بات کرنے پر اسے تین چار موٹی موٹی گالیاں سنا دیں۔

اس کے علاوہ کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ یہاں ہر ایجنسی اپنی حیثیت میں آزاد تھی اور یہ لوگ معاصرانہ ہتھمک کی وجہ سے ایک دوسرے سے تعاون کے بجائے ایک دوسرے کو دھوکے میں رکھ کر اپنا اوسیدھا کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

کریڈٹ لے جانے کی دہائیوں میں وہ اپنے ہماروں کو بچاؤنے میں کوشاں رہتے تھے اور کوئی ایجنسی دوسری ایجنسی کو برداشت نہیں کرتی تھی۔

مونگیا جانتا تھا کہ پردیپ سنگھ بھی ایکٹو (Active) ہو گا اور وہ اپنے ہوتے ہوئے مفروروں کی گرفتاری کا کریڈٹ کسی اور کو دینے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا۔

اس نے اپنی تمام صلاحیتیں اس بات پر صرف کر دی تھیں کہ ”را“ کو اس کے منصوبے اور حکمت عملی کا علم نہ ہونے پائے اور وہ تمام ایجنسیوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر خود مفروروں کو گرفتار کرنے کا کریڈٹ حاصل کر لے۔

اس نے اپنے ساتھیوں کو مفروروں سے متعلق ملنے والے کسی بھی سراغ کی خبر کسی اور ایجنسی کو دینے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔

ایسی ہی ہدایات باقی ایجنسیوں کے لوگوں کو بھی ان کے اعلیٰ افسران کی طرف سے ملی تھیں اور وہ سب اب اپنی اپنی حیثیت میں اپنا اپنا کام کر رہے تھے۔

○ ○ ○

پردیپ سنگھ اپنی ماتحت نیلم کمار کی کے ساتھ صبح نو بجے ایک خصوصی فلائیٹ سے دہلی جا رہا تھا۔

یہ ایک فوجی جہاز تھا جو کچھ افسران کو لے کر خصوصی مشن پر دہلی جا رہا تھا اور ”را“ کے ڈی۔ جی کی درخواست پر مقامی او۔ سی نے پردیپ سنگھ اور اس کی ٹیکرٹری نیلم کمار کی کے لئے دو سٹیشن اس میں رکھ لی تھیں۔

اسے اپنی تفتیش اور تلاش کا آغاز کاشی اگر وال کے گھر سے کرنا تھا جس کے لئے اس نے ہر غیر انسانی طریقہ اپنانے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ یوں تو وہ مقامی پولیس کی مدد بھی حاصل کر سکتا تھا لیکن اس نے دانستہ ایسا نہیں کیا تھا۔

دہلی آنے پر اس کے استقبال کے لئے ”را“ کی ایک اور مستعد ٹیم تمام ساز و سامان کے ساتھ موجود تھی۔

انٹر پورٹ ہی کے ایک کمرے میں انہوں نے اپنی Modus operandi (طریقہ واردات) تیار کی اور یہاں موجود پانچ مختلف ٹیموں کو مختلف ذمہ داریاں سونپ کر خود کاشی

اگر وال کے پاس سرج اگر وال کے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا جبکہ ٹیلیم کمار کی منزل کا مٹی اگر وال کا گھر تھی۔

اس نے کا مٹی کی موسی جاگی دیوی کو قہا بکرتا تھا کیونکہ ان کے پاس موجود اطلاعات کے مطابق اس کے گھر کی خواتین میں کا مٹی اگر وال سب سے زیادہ اپنی موسی جاگی دیوی کے نزدیک تھی۔

○ ○ ○

جاگی دیوی معمول کے مطابق کرشنا مندر سے اپنی پوجا ختم کرنے کے بعد ”پرشاؤ“ لے کر ”ہرے اوم“ ”ہرے اوم“ کا جاپ کرتی گھر کی طرف واپس آ رہی تھی جب اچانک ہی اس کی نظر ایک مارت لڑکی پر پڑی۔

لڑکی نے چٹون قمیض پہنی تھی لیکن اس کے کپڑے ایسے چست اور جسم سے چپکے ہوئے تھے کہ جاگی دیوی نے بے اختیار کانوں کو ہاتھ لگا لیے اور ”ہرے اوم“ ”ہرے اوم“ کی نکرار زیادہ تیز کر دی۔

”جاگی موسی“

اچانک ہی لڑکی نے اس کے نزدیک آ کر کہا اور وہ چونک گئی۔

جاگی دیوی نے حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا تھا کیونکہ وہ اسے بالکل نہیں پہچانتی تھی۔

”آپ جاگی دیوی ہی ہیں ناں۔“

اس نے دوبارہ پوچھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔“

جاگی دیوی نے انہماک میں گردن ہلا دی۔

”میں ٹیلیم ہوں۔۔۔۔۔ کا مٹی کی دوست۔ ارے جاگی موسی کا مٹی نے تمہارے متعلق اتنا

کچھ بتا دیا ہے کہ میں نے ایک نظر میں پہچان لیا کہ تم ہی جاگی موسی ہو گی۔“

اس نے جاگی دیوی کے استفسار سے پہلے ہی کہہ دیا۔

بے چینی کے انداز میں جاگی دیوی نے اس کی طرف دیکھا۔

”لیکن میں تمہیں نہیں جانتی۔“

”اس کی ضرورت بھی نہیں آؤ تمہیں کا مٹی سے ملنا دوں۔۔۔۔۔ دراصل ہم لوگ دلی دو خیم خیمنے کے لیے ٹھہرے ہوئے ہیں وہ خود بری طرح پسنی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ مجھے کہہ دیا کہ تمہیں لے کر ہی آؤں۔۔۔۔۔!“

ٹیلیم نے اس کے مزید نزدیک آتے ہوئے کہا۔

”لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔۔۔۔۔ میں گھر والوں کو بتا دوں۔“

جاگی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کا مٹی نے ملاقات کا یہ کیوں سا طریقہ ایجاد کر لیا ہے۔ اسے کا مٹی سے یہ امید بزرگ نہیں تھی۔ نہ ہی وہ یہ ماننے کے لئے تیار تھی کہ واقعی یہ لڑکی سچ بول رہی ہے۔

”ارے جاگی موسی ہمارے پاس پہلے ہی وقت کم ہے اور تم۔۔۔۔۔۔“

اس نے یہ کہتے ہوئے جاگی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

جاگی نے اگلے ہی لمحے صورتحال کی سنگینی کا احساس کر لیا کہ اس کے ساتھ زبردستی کی جا رہی ہے وہ حیران و پریشان ہو گئی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔

اس سے پہلے کہ جاگی دیوی چیخ کر کسی کو مدد کے لئے بلوائے اچانک ہی سامنے سے ایک تیز رفتار جپ ان کے نزدیک جھٹکے سے آ کر رک گئی جس کے پچھلے حصے میں ایک لمبا ترنگا جوان بیٹھا تھا وہ جپ رکستے ہی نیچے اتر آیا۔

اس کے ساتھ ہی ٹیلیم کمار نے جاگی دیوی کو جھٹکے سے اپنے بازوؤں پر اٹھایا اور جپ کے پچھلے حصے میں پھینک دیا۔ جاگی کے ہاتھ میں بگڑی ”پرشاؤ“ کی قطالی باہر ہی گر پڑی جسے نوجوان نے ٹھوکر مار کر پرے پھینک دیا تھا۔

یہ کافی مصروف گزر رہا تھی۔ لوگ اس طرف متوجہ بھی ہوئے لیکن ان کے کچھ بھٹ آنے سے پہلے ہی جپ جس طرح اچانک نمودار ہوئی تھی اسی طرح برق رفتاری سے غائب ہو گئی۔

کسی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا۔

”کون ہوتا۔۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔۔؟“

خوف سے سبھی اور پریشان حال جاگی دیوی نے بمشکل آواز نکالی۔

”چپ کر سالی..... ابھی بتاتی ہوں تجھے۔“

نیلیم کماری نے اسے تین چار گالیاں دیتے ہوئے جاگتی دیوئی کے منہ پر زوردار مٹا چھ
رسید کیا کہ بے چاری جاگتی کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

اذیت اور ذلت کے احساس سے بے بس جاگتی کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔
زندگی میں پہلی مرتبہ کسی نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔

لیکن..... ایک بات کی اسے سمجھ آ گئی کہ ضرور کامیابی نے کوئی چاند چڑھادیا ہے جب ہی
تو اس کے گھر والوں پر مصیبت آئی تھی۔

اس نے سسکیاں لے کر رونا شروع کر دیا۔

”چپ کرتی ہے یا.....“

نیلیم کماری نے نجانے کس طرح اسے دھمکایا تھا کہ خوف سے جاگتی دیوئی منگ ہو کر رہ
گئی۔

جس گاڑی میں اسے لے جایا جا رہا تھا اس کے شیشوں میں سے کچھ باہر کا منظر دکھائی
نہیں دیتا تھا کیونکہ نیلیم کماری نے جاگتی کو اس طرح اپنی ٹانگوں کے درمیان بٹھایا ہوا تھا جیسے قربانی
کے بکرے کو قصائیوں نے پکڑا ہوتا ہے۔

ڈرائیور کی سیٹ سے ساتھ آگے وہی لمبا ترنگا نوجوان بیٹھا تھا جو پچھلے حصے سے اترا
تھا۔

اب تک دونوں میں سے کسی کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا نہ ہی نیلیم کماری نے
کوئی بات کی تھی.....

اچانک ہی چپ میں لگے ڈرائیور میں سے کسی کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا نہ ہی نیلیم کماری نے
”آپ کے لئے میڈم.....“

یہ کہہ کر اس نے مائیک پیچھے بیٹھی نیلیم کماری کی طرف بڑھا دیا۔

”لیں۔“

نیلیم کماری نے کہا۔

دوسری طرف پردے پر کچھ تھا جس نے صرف ”رپورٹ اور“ کہہ کر اسے بلانے کا موقع دیا

تھا۔

”آن ٹارگٹ سر۔“

نیلیم کماری نے مختصر جواب دیا۔

”ویل ڈن..... Coming (آ رہا ہوں) آؤٹ.....!“

کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

○ ○ ○

جو سلوک جاگتی دیوئی کے ساتھ ہوا تھا اس سے کچھ الگ سورج آگروال کے ساتھ بھی
نہیں ہوا۔ بے چارہ سورج آگروال جس کا گناہ صرف کامیابی آگروال کا باپ ہونا تھا پردے چپ سگھ کی
شکل پر نظر پڑتے ہی گھبرا گیا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرے پردے چپ سگھ نے اسے اپنا تعارف کروا کر اپنے
ساتھ آنے کے لئے کہا تھا۔

سورج آگروال نے اسے اپنی بے عزتی جانا۔ آخر وہ بھی ایک سرکاری آفیسر تھا اور اس
کی بیٹی ”را“ کی آفیسر تھی پردے چپ سگھ نے اپنا تعلق ہی بی آئی سے بتایا تھا۔ یہ ان کی تربیت تھی کہ وہ
کبھی اپنا تعارف اپنی اصلی انجینی کے حوالے سے نہیں کروا تے تھے۔

اس سے پہلے کہ سورج آگروال پردے چپ سگھ کو اخلاقیات سکھانے کی کوشش کرتا اس کے
ہمراہی نے سورج آگروال کی گدی میں ہاتھ ڈالا اور اسے اٹھا کر چپ میں پیچک دیا۔

غصے اور بے عزتی کے احساس سے کھولتے ہوئے سورج آگروال نے شاید بہت عرصے
بعد کسی کو گالی دی تھی۔

لیکن..... اس گالی کا فیازہ اسے برا سمجھتا پڑا۔

دو آدمیوں نے اسے چپ کے اندر دھتک کر رکھ دیا اور سورج آگروال خوفزدہ ہو کر
خاموش ہو گیا۔

اس کے دو تیس روٹھیں سے درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ بے عزتی کا احساس الگ سے
جان کو آ رہا تھا لیکن صورت حال جانے بغیر بھی انہیں علم ہو گیا تھا کہ ضرور کامیابی آگروال نے کوئی
ایسی حرکت کر دی ہے جس کا انہیں اس طرف سے دھڑکا لگا رہتا تھا اور اب وہ معتبہ ہو رہے

تھے۔

جاگتی دیوی اور سورج آگروال کو الگ الگ راستوں سے ایک ہی عمارت تک پہنچایا گیا تھا۔ یہ "را" کا مقامی انٹیر ویمین سنٹر تھا۔ جہاں اب ان دونوں سے الگ الگ تفتیش کی جارہی تھی۔

"جاگتی دیوی..... ہمارا تعلق فوج کے جاسوسی کے محکمے سے ہے کاشمی آگروال ویش روہی لنگی وہ ایک مسلمان کے ساتھ بھاگ گئی ہے..... اور ہم نے اسے بھارت سے نکلنے نہیں دینا۔ وہ دیش اور دھرم کی غدار ہے۔ تم دھارک عورت ہو۔ اپنے ویش اور دھرم سے تمہارا رشتہ کاشمی سے زیادہ مضبوط ہونا چاہیے تمہیں اس کی گرفتاری میں ہماری مدد کرنی ہوگی۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا..... یا ہم سے کچھ چھپایا تو یاد رکھنا میں تمہیں زندہ کاڑ دوں گی۔"

وہ الگ الگ سے ایک کمرے میں لے آئے تھے جہاں اسے ایک آرام دہ کرسی پر بٹھایا گیا تھا۔ ٹیلم کماری اس کے سامنے بیٹھ گئی تھی اور ایک ٹیپ ریکارڈر اس کے سامنے رکھا تھا۔ ٹیلم کے منہ سے کاشمی کا لہجہ سن کر جاگتی دیوی کو یوں لگا جیسے اچانک اس پر حیران (موت کافرشیہ) حملہ آور ہوا اور اس کی آدھی جان نکال کر اسے زندہ درگور چھوڑ گیا ہو.....

وہ پچھلی پچھلی نظروں سے ٹیلم کماری کی طرف دیکھنے لگی پھر اچانک پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کاشمی آگروال کو بدعائنیں دینے لگی۔

"یہ سارا اس حرام خور شیلہ کا کیا دھارہ ہے۔ اس نے میری بیٹی کو گمراہ کیا ہو گا۔"

پلا خر اس نے کہا اور ٹیلم کماری چوگی۔

"کون ہے یہ شیلہ۔"

اس نے پوچھا۔

اور..... جواب میں جاگتی دیوی نے شیلہ کے متعلق اسے مزید مصلحتی لگا کر ساری کہانی سنائی۔ لیکن ٹیلم کماری بہت دور لگانے کے بعد بھی ڈاکٹر شیلہ کا موجودہ ایڈریس معلوم نہ کر سکی۔

○ ○ ○

دوسری طرف کاشمی کے ہمارے بھی کوئی مختلف سلوک نہیں ہوا تھا۔

ان کے ساتھ پردے پہنچے تھے وہ کچھ کر دیا تھا۔ جس کا انہوں نے زندگی میں کبھی تصور

بھی نہ کیا ہو۔ شام ڈھلنے تک تینوں گروہیں جواگ الگ تفتیش کر رہے تھے اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ اگر کاشمی کے پاس اپنا کوئی نمکناہ بھارت میں محفوظ ترین ہے تو وہ صرف ڈاکٹر شیلہ ہے۔ اب انہیں ڈاکٹر شیلہ کو تلاش کرنا تھا۔ جس کی اطلاع اس کے گھر والوں کو بھی نہیں تھی۔ اگلے روز دوپہر تک وہ مختلف مفروضوں پر زور آزمائی کرتے رہے۔ اس دوران انہوں نے شیلہ کے گھر والوں کو اتنا ڈرایا دھمکایا تھا کہ اس کی بوڑھی ماں کو دل کا دورہ پڑا اور پڑھ لکھنے والا اس دورے سے جانبر ہو پائی تھی۔

دوپہر کے بعد تک "را" کے دہلی ہیڈ کوارٹر کا علم ہو چکا تھا کہ یہاں کسی کے پاس بھی شیلہ کا ایڈریس نہیں ہے۔

اس کی آخری پوزیشن راجستھان میں ہوئی تھی جہاں سے بعد از خرابی بسا ر اطلاع ملی کہ شیلہ نے سرکاری نوکری سے شادی کی افواہ پھیلنے ہی انتظار دے دیا تھا اور اپنی نئی منزل کا کسی کو علم نہیں ہونے دیا تھا۔

"اس ماں لے جیکب پر کام کرو۔ اسے ڈھونڈو۔ آخر وہ دونوں زندہ ہیں۔ مر نہیں گئے۔ کہیں نہ کہیں تو ملیں گے ہی۔"

پردے پہنچے تھے غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

دوسرے ہی لمحے شیلہ کے خاوند کے متعلق ممکنہ حد تک حاصل کردہ معلومات کو "را" کے مین کمپیوٹر سنٹر نے ملک کے کونے کونے میں پہنچا دیا تھا۔

شام گئے تک وہاں جیکب نام کے درجنوں ڈاکٹروں سے متعلق اطلاعات جمع ہو چکی تھیں۔

اب اگلا مرحلہ شروع ہوا اور وہ یہ تھا کہ "اصلی ڈاکٹر جیکب کی تلاش۔"

رات گئے پلا خر انہیں کو ہر مقصود ہاتھ لگ گیا اور ڈاکٹر جیکب کے تین چار ممکنہ نمکناہوں کا علم ہو ہی گیا۔

اب انہیں بیک وقت ان تمام نمکناہوں پر ریل کرنا تھی جس کے لئے وہ خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ رات ہونے تک انہیں ڈاکٹر جیکب کے دو چار نمکناہ مل سکے وہ ملک کے چار الگ الگ صوبوں میں تھے۔ یہ وہاں کے ہسپتال تھے جہاں اس نام کے اور اس

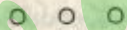
مخصوص بیماری کے ماہر ڈاکٹر جیکب کام کر رہے تھے۔

ڈاکٹر جیکب کا شہر شیلہ کے باپ کی طرف سے ملنے والی اطلاعات کی بنیاد تھی۔

چار مختلف ٹیمیں ہیلی کاپٹروں کے ذریعہ روانہ کر دی گئیں۔ اس روز دلی کے ایک ہوائی اڈے سے جو ایک دور دراز جے میں صرف "را" کے لئے مخصوص تھا موجود چاروں ہیلی کاپٹر ایک ہی مشن کے لئے الگ الگ سمتوں میں روانہ ہوئے تھے۔

ان چاروں ٹیموں کے پاس ڈاکٹر شیلہ کی تصویریں موجود تھیں تاکہ ان کی شناخت میں دشواری پیش نہ آئے۔

پردہ پٹنگے خود راجستھان کی طرف عازم سفر تھا کیونکہ سب سے زیادہ ڈاکٹر جیکب کے ملنے کے امکانات یہیں پائے جاتے تھے۔



ڈیڑھ دوں میں کرنل مونگیا کے ساتھیوں نے چپے چپے چھان مارا تھا لیکن یہاں انہیں نہ کچھ ملنا تھا نہ کچھ ملا۔ زیادہ تشویشناک بات تو یہ تھی کہ ابھی تک ان کا رابطہ کرنل مونگیا سے نہیں ہوا تھا۔ جو ماضی کی روایات کے برعکس تھا۔

کرنل مونگیا بڑا ایڈوانچر پسند تھا وہ اپنے دشمن کو "سر پرائز" دینے میں مشہور تھا۔ لیکن ۲۰۰۰ گھنٹے تک اس کا رابطہ اپنے ہیڈ آفس سے نہ ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

اس کی جیب میں بہت طاقتور وائرلیس سیٹ نصب تھا جس پر مسلسل پیغام بھیجے جا رہے تھے لیکن دو دن سے انہیں کسی پیغام کا جواب نہیں مل رہا تھا۔

تیسرے روز جب کیپٹن ناگر نے اسی اوپنسنگنگل دیا تو دوسری طرف سے جواب موصول ہو گیا۔

لیکن..... حیرت انگیز طور پر یہ کرنل مونگیا نہیں بلکہ اس کی یونٹ کی ایک کمپنی کا کوئی میجر تھا جو ان سے بات کر رہا تھا۔ یہ کمپنی "پوننا صاحب" کے علاقے میں کوئی ایکسرسائزر کر رہی تھی۔

"کرنل صاحب درودز پہلے اپنی جیب یہاں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ انہوں نے آج تک واپس آنے کا وعدہ کیا تھا اور جی سے تاکید تھی کہ کوئی وائرلیس پیغام موصول نہ کیا جائے لیکن

اب چونکہ ہمیں بھی تشویش ہونے لگی ہے اس لئے آپ کے پیغام کا جواب دے رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے کہا گیا۔

اور.....

کیپٹن ناگر نے گا تھا خشک خشک ضرور دال میں کچھ کالا تھا۔ ورنہ یہ کچھ ممکن نہ ہوتا۔ ان کے لئے کرنل مونگیا کا اپنی جیب اپنی یونٹ میں کھڑی کر کے غائب ہو جانا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ جانتے تھے دوسرے لائق افسروں کی طرح کرنل مونگیا کو بھی "معاصرانہ چٹنگ" کا عارضہ لاحق ہے۔ اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے جیب وائرلیس سے اس کے متحارب "را" کے لوگ کوئی کلیو تلاش کر کے اس کے کئے کرانے پر پانی پھیر کر اپنے نمبر بتائیں۔ اس لئے اس نے حسب روایت اپنی جیب یہاں کھڑی کر کے کسی پرائیویٹ کار کے ذریعے سفر کیا ہو گا۔ یا پھر کوئی اور طریقہ اپنایا ہو گا۔

"پلیز یہاں بہت امیر بیسی ہے۔ آپ اپنی مقامی یونٹ سے درخواست کریں کہ کرنل مونگیا کو تلاش کرے۔ صورت حال بہت خطرناک ہے۔"

کیپٹن ناگر نے اپنی درخواست دہرائی اور دوسری طرف سے اثبات میں جواب ملنے پر ریڈیو تیر تھوڑے سے رابطہ کر کے اسے تمام صورتحال سے آگاہ کیا۔

تھوڑے گھنٹے کے بعد بھی یہ فزٹویشناک تھی۔

"تم اپنے لوگوں کے ساتھ پوننا صاحب کی طرف نکلو۔ فوراً۔"

اس نے مختصر ماحکم دے کر فون بند کر دیا۔

کیپٹن ناگر نے کو اگر یہ حکم نہ بھی ملتا تو بھی اس نے مسوری کی طرف رخت سفر باندھ دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کرنل مونگیا ضرور اس طرف گیا ہو گا۔

اپنے تین نو جوانوں کے ساتھ وہ جیب کو اڑاتا ہوا مسوری پہنچا تھا جہاں اس نے فوراً مقامی پولیس چیف سے رابطہ کیا۔ کیپٹن ناگر نے تو پولیس فورس کی مدد حاصل کرنے کے لئے رابطہ کیا تھا لیکن یہاں سے جب اسے آج صبح ایک نامعلوم لاش ملنے کی خبر ملی جس کی تصویر تھوڑی دیر تک ایس پی آفس پہنچنے والی تھی تو وہ تصویر کا انتظار کرنے کے بجائے مقامی قاتل کی طرف بھاگا۔ جہاں سے ابھی لاش کو مردہ خانے روانہ کر دیا گیا تھا۔

کیپٹن ناگر سے اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ جب مقامی سول ہسپتال کے مردے خانے ڈیوٹی پر موجود پولیس کے دو جوانوں نے اسے روکنا چاہا تو اس نے دونوں کو دھکا دے کر ایک طرف کر دیا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ بچھ پانچیں کیپٹن ناگر سے کے عتب میں آنے والے اس کے جوانوں نے اس پر قابو پایا۔

مردہ خانے میں صرف ایک لاش پڑی تھی۔

لاش کے منہ سے کپڑا ہٹا کر جب کیپٹن ناگر نے اس کا چہرہ دیکھا تو گھبراہٹ سے چادر کا پوسٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اس نے بمشکل اپنے منہ سے نکلنے والی بے ساختہ آواز کا گلہ دیا تھا۔

”اف بھگوان۔“

بالآخر کیپٹن آواز میں اس نے کہا۔

کیونکہ دوسری مرتبہ بھی کپڑا الگ کر کے دیکھنے پر نتیجہ مختلف برآئ نہیں ہوا تھا۔

اس کے سامنے کرل مونگیا کی لاش پڑی تھی۔

”کرل مونگیا مار گیا۔“

اس نے سنبل کر بے یقینی کے انداز میں سر ہلایا اور سارے جسم سے چادر اتار دی۔

اب بے کی کوئی مضائقہ باقی نہیں رہ گئی تھی۔

کیپٹن ناگر نے جس رفتار سے اندر گیا تھا اسی رفتار سے باہر آیا۔

”انہیں قابو رکھو۔“

اس نے دونوں پولیس گارڈز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے جوانوں کو حکم دیا اور خود چپ کے دائرے سیٹ کی طرف دوڑا۔

سب سے پہلے اس نے بریگیڈ ٹرہو ترو کی یہ منہوں خبر سنائی تھی جس نے تین بار مختلف انداز میں اپنا سوال دہرا کر اس بات کی تہلی کرنا چاہی تھی کہ کہیں کیپٹن ناگر کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ اور جب اسے یقین ہو گیا کہ ایسا بات نہیں تو بالآخر اس نے یہ بات ہائی کمان تک پہنچادی۔

کیپٹن ناگر کو اس نے وہیں گھبراہٹ پر پیشینہ لے رکھے کا حکم دیا تھا۔

قریباً پندرہ بیس منٹ بعد نکس آری کی ایسی بولس اور گاڑیاں اس طرف آتی دکھائی دیں۔ یہ کرل مونگیا کی پونٹ کے لوگ تھے جس کی لاش یہاں سے اٹھا کر فوراً ملٹری ہسپتال لے گئے۔

کیپٹن ناگر نے دونوں پولیس والوں کو سختی سے تاکید کر دی تھی وہ اس واقعہ کا ذکر کسی سے نہیں کریں گے اور پولیس کی ہائی کمان سے کہہ دیا گیا تھا کہ لاش کو نامعلوم قرار دے کر اپنی کاندھی کا رروائی مکمل کر لے۔

کرل مونگیا کی موت معمولی بات نہیں تھی۔ اس کا پوسٹ مارٹم فوراً ہی شروع ہو گیا تھا اور اگلے تین گھنٹوں میں اس کی مکمل پوسٹ مارٹم رپورٹ متعلقہ افراد کے سامنے پیش کی گئی تھی۔

مسوری میں موجود فوج کی سکیورٹی نے سارے علاقے کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ یہاں موجود ہائی کمان ایجنسیوں نے اپنے الگ الگ بندوبست کے ساتھ اپنا کام شروع کر دیا تھا۔

وہ شخص جس نے سب سے پہلے کرل مونگیا کی لاش کی خبر دی تھی۔ مقامی مشین ماسٹر تھا۔ جسے تھوڑی دیر بعد ہی اپنی زندگی کی سب سے بڑی لطفی کا احساس ہو گیا کیونکہ صبح سے رات گئے تک درجنوں افسر اس سے الگ الگ لائے سیدھے سوالات کر چکے تھے ابھی تک اس بے چارے کو کسی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ مرنے والا کون ہے۔

لیکن اسے آری اٹلی جنس نے ضرور اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس کے گمروالوں کو مطمئن کر دیا گیا تھا اور سختی سے زبان بند رکھنے کی تلقین بھی کی گئی تھی۔

فوج اور پولیس کے اعلیٰ افسران نے وہاں کے چپے چپے معائنہ کیا تھا جہاں سے لاش ملی تھی۔

فوج کے تربیت یافتہ فوجیوں نے وہاں ایک اور شخص کے خون کی نشاندہی بھی کی تھی۔

شاید یہ قاتل کا خون تھا جس کے تعاقب میں کتے ایک کار کے گاڑوں کے نشانات تک گئے اور پھر کئی سڑک تک پہنچنے کے بعد اپنی دونوں ٹانگیں اٹھا کر بھونکنے لگے کیونکہ اس سے آگے کار کے گاڑوں کا بھی کوئی نشان نہیں ملتا تھا۔

لیکن وہ جس سڑک تک آئے وہ شملہ کی طرف جاری تھی۔

پروپ سکھ کا بیلی کا پٹر لینڈ کر رہا تھا جب اسے "پوننا صاحب" سے کرٹل مونگیا کی لاش اور اب تک ہونے والی تفتیش کی رپورٹ ملی۔
"ڈیم اٹ....."

اس نے غصے سے گھانا پھاڑتے ہوئے کہا۔
مقامی ہسپتال پر اس کی جس ڈاکٹر جنیپ سے ملاقات ہوئی اس کا شکار نہیں تھا۔
دوسرے ہی لمحے وہ بیلی کا پٹر پر "پوننا صاحب" کی طرف عاجز سفر تھا۔ اس نے اپنے مقامی ماتحت کو تمام تفصیلات ہیڈ کوارٹر کو دینے کی ہدایت کر دی تھی اور اب بیلی کا پٹر کے وائز ایس ریڈیو پر اپنے ہیڈ کوارٹر میں بات کرنے کے بعد ان سے اگلی ہدایات موصول کر رہا تھا۔

○○○

ظاہر نے کامنی کی آنکھوں میں نمی بڑی واضح محسوس کی تھی۔ وہ جانتا تھا اس وقت کامنی کے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ شیدا اور کامنی کی محبت کا اسے بخوبی اندازہ تھا۔ شیدا کو شاید اس بات کا علم نہ رہا ہو لیکن کامنی تو جانتی تھی کہ اب زندگی میں شاید ہی وہ اپنی دوست سے دوبارہ مل پائے۔
دونوں کچھ دیر تک خاموشی سے پیدل چلتے رہے۔ ظاہر سمجھتا تھا کہ کامنی کے دل پر کیا گز رہی ہے۔ شاید وہ خاموش رہ کر کامنی کو اپنی حالت سنہالے اور نامل ہونے کا موقع دے رہا تھا۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں ایک دوسرے سے بات کر لینی چاہیے۔"

بالآخر اس نے خاموشی کا طعنے توڑتے ہوئے کہا۔

"آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے۔"

کامنی بے ساختہ مسکرا دی۔

دونوں نے ایک دوسرے کا حوصلہ بڑھا دیا۔ ظاہر کو اگر کامنی کی ذہنی حالت کی فکر و امن گیری تھی تو کامنی اس کے زخم سے متعلق پڑیشان تھی۔ ابھی تک زخم پر ٹانگے لگے تھے۔ ظاہر کی انگلیاں بینڈیج سے محفوظ تھیں۔ اس لئے اس نے دونوں ہاتھوں پر اوٹنی دستانے چڑھائے ہوئے تھے۔ یہی حال کامنی کا تھا۔ جس نے نہ صرف ہاتھوں پر دستانے بلکہ گرم کوٹ کے علاوہ اپنے سر پر گرم ٹوپی اوڑھنے کے بعد ایک شمال سے اپنا منہ قریباً چھپا رکھا تھا۔ دونوں نے آنکھوں پر عینکیں چڑھا رکھی تھیں۔

ظاہر نے کامنی کی آنکھوں میں نمی بڑی واضح محسوس کی تھی۔ وہ جانتا تھا اس وقت کامنی کے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ شیدا اور کامنی کی محبت کا اسے بخوبی اندازہ تھا۔ شیدا کو شاید اس بات کا علم نہ رہا ہو لیکن کامنی تو جانتی تھی کہ اب زندگی میں شاید ہی وہ اپنی دوست سے دوبارہ مل پائے۔
دونوں کچھ دیر تک خاموشی سے پیدل چلتے رہے۔ ظاہر سمجھتا تھا کہ کامنی کے دل پر کیا گز رہی ہے۔ شاید وہ خاموش رہ کر کامنی کو اپنی حالت سنہالے اور نامل ہونے کا موقع دے رہا تھا۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں ایک دوسرے سے بات کر لینی چاہیے۔"

بالآخر اس نے خاموشی کا طعنے توڑتے ہوئے کہا۔

"آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے۔"

کامنی بے ساختہ مسکرا دی۔

دونوں نے ایک دوسرے کا حوصلہ بڑھا دیا۔ ظاہر کو اگر کامنی کی ذہنی حالت کی فکر و امن گیری تھی تو کامنی اس کے زخم سے متعلق پڑیشان تھی۔ ابھی تک زخم پر ٹانگے لگے تھے۔ ظاہر کی انگلیاں بینڈیج سے محفوظ تھیں۔ اس لئے اس نے دونوں ہاتھوں پر اوٹنی دستانے چڑھائے ہوئے تھے۔ یہی حال کامنی کا تھا۔ جس نے نہ صرف ہاتھوں پر دستانے بلکہ گرم کوٹ کے علاوہ اپنے سر پر گرم ٹوپی اوڑھنے کے بعد ایک شمال سے اپنا منہ قریباً چھپا رکھا تھا۔ دونوں نے آنکھوں پر عینکیں چڑھا رکھی تھیں۔

شدید سردی کی وجہ سے یہاں کے لوگ ایک مخصوص قسم کی ٹوپی اپنے سر پر پہنتے تھے جو سر کے بعد کانوں سے ہوتی ہوئی گردن تک پہنچ جاتی تھی اور اس میں صرف پہننے والے کی آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ شیلانے ان کے سامان میں یہ ٹوپیاں بھی رکھ دیں تھیں لیکن دونوں نے انہیں استعمال کرنا ہی الوقت مناسب نہیں جانا تھا۔

تھوڑی دور تک پیدل چلنے کے بعد انہیں اپنے ارد گرد ”یا تریوں“ کی بھیڑ دکھائی دینے لگی۔ یہ وہ لوگ تھے جو مقامی میلے میں شرکت کرنے کے لئے آئے تھے۔ شدید سردی نے بھی نے ان کے جذبات کو مضطرب نہیں کیا تھا اور وہ سب زور زور سے اونچی اونچی آواز میں بھجن لاپتے اس پہاڑ کی طرف رواں دواں تھے جہاں ایک مندر میں آج کی مخصوص عبادت کی جاری تھی۔

اس بھیڑ کے پتلیوں میں راستہ بناتے دونوں اطمینان سے اپنی اگلی منزل کی طرف رواں دواں تھے ایک مرتبہ پھر کاشی نے سموری میں خریدے ہوئے ”پیتامبر“ اپنے اور طاہر کے کندھے پر ڈال دیئے تھے۔ اب وہ یا تریوں کی بھیڑ کا حصہ بننے چل رہے تھے۔

کاشی تو نہیں چاہتی تھی کہ طاہر زیادہ دور تک پیدل چلے لیکن طاہر کسی خطرے کو ایک لمبے کے لئے بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا اس نے کاشی کے کہنے کے باوجود پیدل چلنا ہی مناسب جانا۔ یوں بھی اب وہ جسمانی طور پر مکمل فٹ تھا۔ ڈاکٹر شیلانے اپنی طرف سے کوئی سر نہیں چھوڑی تھی۔ دونوں کو پیدل چلنے پر یوں یوں ٹھنڈ ہو گیا تھا۔ اور اب وہ مختلف پہاڑی راستوں کا چکر کاٹنے کے بعد اس مقامی بس سٹینڈ تک آ گئے تھے جہاں سے چلنے والی دیکھیں اور ہمیں شملہ جاتی تھیں۔ ان کو مقامی ٹرانسپورٹ ہی کہا جاسکتا تھا۔ کیونکہ یہ سروس صرف سولان سے شملہ تک ہی چلتی تھی۔

دونوں ایک دیکھن میں خاموشی سے سوار ہو گئے۔

ان کے اطوار سے کئی دکھائی دے رہا تھا جیسے نوبیا جوتا جوڑا کوئی منت پوری کرنے کے لئے یہاں بادل خواستہ اتنی سردی میں آیا ہو۔

سولان سے شملہ تک اگر سرکاری ٹرانسپورٹ کے ذریعے سفر کیا جاتا تو وہ دو گھنٹے میں پہنچ جاتے لیکن اس بس نے انہیں تین ساڑھے تین گھنٹوں میں پہنچایا تھا کیونکہ ہر چند وہ منت کے بعد اس کا اگلا سٹاپ آ جاتا تھا۔

کاشی اگر وصال نے یہ قدم بطور احتیاط اٹھایا تھا وہ جانتی تھی کہ ایسی مقامی قسم کی ٹرانسپورٹ کو زیادہ چیک نہیں کیا جاتا۔

شملہ میں زندگی اپنے مکمل جوں پر دکھائی دے رہی تھی۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چمکتی دھوپ نے سفید رنگ کے برف میں ڈھکے پہاڑوں پر سرخ رنگ کا عجیب سا جال بن دیا تھا۔ دیکھیں ایک بس سٹینڈ کے نزدیک ہی اتنی تھیں دونوں اپنے اپنے بیک سنیالے۔ اب کسی ”ڈھابے“ کی تلاش میں رواں دواں تھے۔

کاشی کی خواہش تھی کہ طاہر کوئی بیک نہ اٹھائے لیکن طاہر نے زبردستی دو بیک سنیالے ہوئے تھے جب کہ تیسرا ایک کاشی کے پاس تھا جس میں طاہر کی دو انیاں اور بیٹن ج کا سامان رکھا تھا۔ کاشی نے سولان سے روانگی پر ہی پانی کی بوتل اپنے ساتھ کر لی تھی اور راستے میں ایک لمبے کے لئے بھی اسے دو اپنے میں چوک نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر شیلانے بطور خاص ہدایت کی تھی کہ وہ طاہر کو بروقت دوا دیتی رہے کیونکہ شدید سردی اور بے آرامی کی وجہ سے اس کے ہاتھ میں درد ہو سکتا تھا۔ البتہ وہ ڈر نہیں ہونے والے مکمل انکیشن کی طرف سے مطمئن تھی کیونکہ یہاں برف باری کی وجہ سے آلودگی کے زیادہ امکانات نہیں تھے۔ یوں بھی انکیشن روکنے کا مکمل اہتمام اس نے کر دیا تھا۔

دونوں کچھ دیر پیدل چلنے اب ایک ڈھابے پر آ گئے تھے۔

ڈھابے کا مالک ”پاپا کھنہ“ تھا جو اپنی بڑی سی تو نہ کھداری دائی اور میلی سی مچھڑی سر پر رکھے خود ایک تخت پوش پر رکھی بڑی سی قوم کی گدی پر اُلٹی پائنتی مارے کھیل اوڑھے کھیلے کھیلے سانسے بیٹھا تھا جب کہ اس کے ملازم کا گلوں کے سیوا میں مصروف تھے۔

اس کی کاروباری نظروں نے بھانپ لیا تھا کہ اس کے ڈھابے پر آنے والا نوبیا جوتا کسی ایسے گھرانے کا گھنا ہے۔ اس لئے وہ خود پانی سیٹ سے اٹھ کر گرم پانی جگ میں لے کر ان کی طرف گیا تھا۔

”مہاراج جی مل پانی (ہاتھ دھو) کر لیں“

اس نے طاہر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”سرداری دھواؤ۔“

مدم روشنی میں "سی آر پی ایف" (سنٹرل ریزرو پولیس فورس) کے الفاظ پڑھ کر دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر غواغواہ مکرادیے۔

کاشی نے تو یہاں سے کہیں اور جانے کا ارادہ بنا دیا تھا لیکن طاہر نے اس کا عندیہ بھانپ کر اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ مطمئن اور خاموش رہنے کا اشارہ تھا۔

طاہر نے جان لیا تھا کہ یہاں وہ خود نہیں آئے بلکہ قدرت انہیں لے کر آئی ہے ضرور اس میں کوئی حکمت ہی ہوگی۔

ان کا استقبال ایک مستعد گارڈ نے کیا تھا دونوں نے اپنا تعارف ڈاکٹر کی حیثیت سے کروایا اور بغیر کسی تحقیق کے انہیں ایک آرام دہ کمرہ مل گیا۔

رات کا کھانا انہیں کمرے ہی میں مقامی میس سے سیلائی کیا گیا تھا اور اب وہ دونوں کمرے میں گئے آتش دان کے سامنے آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے آگ تپ رہے تھے۔

حیرت کی بات تھی کہ دونوں کو کسی سوال و جواب کے بغیر کمرہ ملا تھا۔ صرف طاہر نے ایک رجسٹر پر شملہ کے ایک سرکاری ہسپتال ڈاکٹر ہوسٹل کا اپنا ایڈریس لکھ دیا تھا۔

کاشی نے اطمینان سے یہاں اس کی میزبانی تبدیل کی اور پرانی پیٹیاں وہاں بچھنے کے بجائے انہیں ایک پولی ٹھن کے لفافے میں بند کر کے کمرے کی کھڑکی سے باہر اس نالے میں پھینک دیا تھا جو پہاڑوں سے بہتا ہوا اس ڈاک بچھنے کی پشت سے گزرتا تھا۔ طاہر نے اسے اطمینان دلانے کے لیے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو اچھی طرح جنبش دی تھی تاکہ کاشی کو اطمینان رہے کہ اس کا زخم مندمل ہو چکا ہے اور ہاتھ بھی صحیح کام کر رہا ہے۔

کاشی نے بطور خاص دیکھا تھا کہ زخم نازل تھا اور اس میں پیپ وغیرہ نہیں پڑی تھی۔ جو بہت اچھا شگون تھا اب وہ اگلے روز اطمینان سے اس کے کچلے ٹکڑے کو کھاتی تھی۔

دونوں رات دیر گئے آتش دان کے سامنے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ کاشی نے اسے اپنے ماضی کی کہانیاں سنائی شروع کیں اور سنائی چلی گئی۔

اس نے اپنے بچپن لڑکپن جوانی اور عملی زندگی کا ایک ایک ورق کھول کر طاہر کے سامنے رکھ دیا تھا۔

طاہر ایک ماہر نفسیات کی طرح اس کی ایک ایک بات کا یہ کر رہا تھا اور آدمی تے مجھے جب بوجھل دل اور رندھے ہوئے گلے کے ساتھ اپنی کہانی سناتے ہوئے بے اختیار وہ طاہر کے سینے سے جا لگی تو طاہر کو احساس ہوا کہ کاشی کے ساتھ کتنی نرمی ہوئی ہے۔

اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کاشی اپنے سانچ میں کبھی مطمئن ہی نہیں اور بچپن میں اس کے اندر قدرتی طور پر ایک انقلاب جنم لے چکا تھا۔ یہ تبدیلی بہت سہل رونما ہوتی تھی۔ انہوں نے بہر حال حق سچ پر لبیک کہا تھا۔

طاہر کے بعد ہونے پر وہ بستر پر لیٹ گئی جبکہ طاہر نے اپنے آتش دان کے نزدیک سیل پھینک کر لیٹ گیا۔

دونوں تھوڑی دیر ہی سوئے تھے جب صبح ہو گئی۔

صبح کا ناشتہ بھی انہوں نے کمرے ہی میں منگوا لیا۔ پھر آپ جیسی وہیں منگوا کر ان کے ذریعے بظاہر یہاں کے سول ہسپتال کا رخ کیا کیونکہ انہوں نے یہی تاثر دیا تھا جیسے یہاں ان کا تعلق ہوا ہے۔

جیسی کو رخصت کرنے کے بعد ہسپتال کے دوسرے دروازے سے نکل کر کھیتوں پہیل چلے بازار کے ایک کونے میں بس سٹینڈ تک پہنچے۔ جہاں سے ایک بس کے ذریعے وہ ڈھوڑی کی طرف جا رہے تھے۔

واڈ بکر خود ایک مکمل ڈاکٹر تھا اور اپنی بالکن ڈاکٹر شیلہ کی انسان دوستی کی وجہ سے اس کی بہت عزت کرتا تھا۔

اس نے اپنی زندگی میں ڈاکٹر شیلہ جیسی درد دل رکھنے والی ڈاکٹر نہیں دیکھی تھی جو بظاہر تو یہ پرائیویٹ ہسپتال چلا رہی تھی لیکن عملاً صورت حال یہ تھی کہ یہاں آنے والے مریضوں کو کسی بھی جزل ہسپتال سے زیادہ بہولیات حاصل تھیں۔

آدھے سے زیادہ مریضوں کا علاج یہاں مفت ہوتا تھا۔ کبھی کبھی واڈ بکر کو مریضوں پر غصہ بھی آتا کہ وہ جان بوجھ کر جزل ہسپتال جانے کے بجائے یہاں کیوں پہلے آتے ہیں کیونکہ ڈاکٹر شیلہ ان کو ادویات بھی خود خرید کر دیا کرتی تھی۔

اس نے جب بھی ڈاکٹر شیلہ کو اپنا روپہ بدلنے کے لیے کہا۔ شیلہ مسکرا کر رہ جاتی۔ اس نے واڈ بکر سے ایک روز کہا کہ مقامی آبادی کی غربت کا اندازہ کیا اسے نہیں ہے؟ یہ لوگ کہاں سے اتنے پیسے ملانے کے لئے پیسہ لائیں؟ اور ڈاکٹر شیلہ کی مجبوری یہ تھی کہ اسے یہ مل مشین بہت پسند آتا تھا اور وہیں بسیرا کرتا چاہتی تھی۔

اس وقت ہسپتال میں واڈ بکر اور دو نرس اپنے کام میں مصروف تھیں اور ڈاکٹر شیلہ اپنے کمرے میں صوری تھی جب اچانک وہاں ایک طوفان بدتمیزی کھس آیا۔

چار بیسیں کے بعد دیگرے وہاں آ کر کیس جن میں سے سولین کپڑوں میں لمبوس آٹھ دس جوان بیٹیوں نے انھوں میں آٹھ چوک اسطو تمام رکھا تھا ہسپتال میں کھس آئے۔ انہوں نے یہاں داخلے کے لیے جو غیر مہذب طریقہ استعمال کیا تھا اس نے واڈ بکر کا پارہ چڑھا دیا۔

تین چار دیوار پھان کر باقی سامنے اور پیچھے کے دروازے سے اندر آئے اور انہوں نے ہسپتال کے مختلف کونوں میں ایسے پوزیشن سنبھال لیں جیسے اچانک ہونے والے حملے کا مقابلہ کرنے کی تیاری کی جاتی ہے۔

پر دیکھ سکتے اپنے دو ماحول کے ساتھ اوپر ایمر جنسی روم میں کھس آیا جہاں تین مریضوں کو گھوکوز کی بوتلیں لگی ہوئی تھیں اور ایک کونے میں واڈ بکر اور دو نرس اپنی اپنی ڈیوٹی سنبھالے بیٹھے تھے۔

”شیلہ کہاں ہے؟“

ڈاکٹر شیلہ معمول کے مطابق اپنے کینک سے فارغ ہو کر کچھ دیر سنانے کے لیے اپنے بیدروم میں آئی تھی۔ وہ وہاں کونین کھینچے کا وقت کرتی تھی۔ اس دوران بچ اور کچھ دیر سنانے کے بعد پھر رات دیر تک وہ اپنے کاموں میں مصروف رہتی تھی۔

کاشمی کو یہاں سے گئے آن دوسرا دن تھا اور اس کا دل کہتا تھا کہ وہ دونوں جہاں بھی ہیں ضرور اسے محفوظ رکھانے پر پہنچ گئے ہوں گے۔

ڈاکٹر جبک کا کورس ابھی چل رہا تھا اور آج ہی اس نے شملہ سے فون کر کے شیلہ کی خبریت بھی معلوم کی تھی۔

ڈاکٹر شیلہ نے اپنی دانست میں کوئی ایسا نشان گھر میں نہیں رہنے دیا تھا جس سے کاشمی اور طاہر کی یہاں موجودگی کا شائبہ بھی گزرتا ہو۔

آج مقامی میلہ ہونے کی وجہ سے مریض کچھ زیادہ ہی آئے تھے اور دو تین شدید زخموں کو داخل کرنا پڑا تھا۔ شیلہ قدرے تھکاؤ محسوس کر رہی تھی اور اب اپنے بستر پر گر کر لمبے لمبے سانس لے کر گویا تھکاؤ دور کر رہی تھی۔ آج وہ اتنا تھک چکی تھی کہ اب اس کا دل بچن میں جا کر لچ تیار کرنے کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔

جیسے جیسے اس نے رات کے سائن کے ساتھ ایک روٹی زہر ماری اور کپڑے بدل کر اپنے بستر پر گر گئی۔

اس نے اپنے اسٹنٹ واڈ بکر سے کہہ دیا تھا کہ شدید ضرورت پر بھی اسے نہ اٹھائے

اس نے اندر جھٹکتے ہی واڈ بکھرے بڑی بدتمیزی سے دریافت کیا۔

”آپ کون ہیں؟“

واڈ بکھرے قدرے خوف اور غصے سے ملے جلے جذبات سے پوچھا کیونکہ اس کے دونوں ساتھیوں نے وہاں لینے مریضوں کے نزدیک پہنچ کر انہیں گھورنا شروع کر دیا تھا جیسے وہی ان کے مطلوبہ مہم ہوں۔

”ششاپ..... تم سے جو پوچھا جائے اس کا جواب دو۔“

پردیپ سنگھ نے واڈ بکھڑا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

واڈ بکھڑا اس سے گالی کی توقع نہیں تھی۔ اس نے زندگی میں شاید ہی کسی سے گالی کھائی ہو۔ بے عزتی اور زبوں کے سامنے..... اس صورتحال نے اس کا دماغ گرم کر دیا۔

”کیا کہتے ہو؟ تمیر سے بات کرو۔ یہ ہسپتال ہے۔ تمہیں کسی نے بتایا نہیں کہ بات کیسے کی جاتی ہے؟“

واڈ بکھڑے غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

”سالے تجھے تو پہلے سیدھا کر لوں۔“

یہ کہہ کر پردیپ سنگھ نے واڈ بکھرے منہ پر اتنا زور سے چھڑ مارا کہ وہ سامنے کی دیوار سے ٹکرا کر گر پڑا۔

دونوں نہیں خوفزدہ ہو کر اسے لعن طعن کر کے واڈ بکھڑی مدد کو آگے بڑھیں تو پردیپ سنگھ نے انہیں بازوؤں سے جھٹکے دے کر الگ کر دیا۔

اس کے دونوں ساتھیوں نے ان کی طرف بند و قیس تان لی تھیں۔

حجرت انگیز طور پر واڈ بکھر خوف زدہ ہونے کے بجائے غصے سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور پردیپ سنگھ کی طرف بڑھا۔

”تمہیں شرم آتی چاہیے..... اگر تم کوئی سرکاری آدمی ہو تو یاد رکھنا، تمہیں اس چیمبر کی قیمت ادائی کر پڑے گی۔ ڈاکٹر صاحب اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہیں۔ تمہیں کیا کام ہے.....؟ اور یہ کیا طریقہ ہے؟“

اس نے بدقت تمام اپنے منہ میں پردیپ سنگھ کے لیے آنے والی گالیوں کو روک کر محض

اتنا ہی کہا۔

”کہاں ہے اس کا کمرہ.....؟“

پردیپ سنگھ نے بچا دکھانے والے لہجے میں پوچھا۔

دونوں تریس جو ہم کر خوف سے کانپ رہی تھیں اب ان میں سے ایک باقاعدہ رونے لگی تھیں۔

دوسری نے اس مصیبت سے نکلنے کی شاید یہی آسان ترکیب سوچی کہ واڈ بکھر کے مزید کسی سوال نما جواب سے پہلے ہی کہہ دیا۔

”اوپر..... میڈم اوپر رہتی ہیں۔“

”دیکھو تمہیں جو بھی بات کرنی ہے مجھ سے کرو۔ اس وقت میڈم کو.....“

واڈ بکھر کی بات نامکمل ہی رہ گئی۔ جب پردیپ سنگھ نے اسے دکھائے کہ ایک طرف کیا اور دوسرے اشارہ کیا تھا۔ اس طرف کی میز جوں کی طرف لپکا۔

اس کے دونوں ساتھیوں نے ابھی تک ان کی طرف بند و قیس تان لی ہوئی تھیں۔

○ ○ ○

خیلا کی ابھی بمشعل آنکھ ہی لگی تھی جب ایک زوردار جھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے یوں لگا جیسے اچانک زوردار دھماکہ ہوا ہو اور خیلا کے چنگ نے اسے ہر گھوٹ پر اچھال کر بٹھا دیا۔

یہ دھماکہ کسی بم کا نہیں بلکہ اس کے بیڈروم کے دروازے کا تھا جو کسی نے بدتمیزی اور زور سے کھولا تھا کہ وہ اندر کی دیوار سے ٹکرایا اور زوردار آواز پیدا ہوئی۔ پریشان کن اور حیرت زدہ آنکھوں کے ساتھ ڈاکٹر خیلا نے دیکھا۔ دروازے کے عقب میں ایک لڑکی اس کی طرف بہتول تانے لگزی ہے۔

یہ نلیم تھی.....!

پردیپ سنگھ کی ماتحت..... جسے اپنے پاس کی طرح کارنامے دکھانے کا شوق تھا۔

ابھی خیلا بمشعل سنبھل پائی تھی جب نلیم کے عقب میں اسے میز حیاں چڑھ کر اوپر آتا پردیپ سنگھ دکھائی دیا۔

ڈاکٹر شیلانے بظاہر تو ہاتھ روم کارنگ کیا تھا لیکن اپنے چہرے پر پانی کے چھینٹے ڈالنے کے فوراً بعد اس نے بیڈ روم کے فون سے مقامی ایس پی جی کی ساری فلی دو نوں میاں بیوی کی مریض تھی، بڑی خاموشی سے اپنے ساتھ ہونے والی ایمرنسی سے باخبر کر کے فوراً پہنچنے کی درخواست کی تھی۔۔۔۔۔

اور۔۔۔۔۔

ایس پی نے اسے مطمئن رہنے کے لئے کہا تھا۔

تین چار منٹ بعد جب وہ بظاہر نارمل ہو کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو اس نے یوں انہیں مخاطب کیا جیسے اپنے مریضوں سے بات کیا کرتی ہے۔

پردیپ کے اشارے پر نیلم نے اس کی طرف دونوں تصویریں بڑھا دیں۔۔۔۔۔ دونوں کو وہ بچکانہ تھی۔

”آپ ان لوگوں کو جانتی ہیں؟“

پردیپ سنگھ نے دریافت کیا۔

”میں۔۔۔۔۔ یہ تو میری بچپن کی سیملی کا منی ہے۔ دوسری تصویر کس کی ہے میں نہیں

جانتی۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔

”غور سے دیکھئے۔ میڈم شاید آپ اسے بھی پہچان جائیں۔“

اس مرتبہ ہر خندہ مسکراہٹ کے ساتھ نیلم نے کہا تھا۔

”میں ڈاکٹر ہوں اور آپ سے بہتر اپنی نظر کے متعلق جانتی ہوں۔ میری آنکھیں بھی

بھگوان کی کرپا سے بالکل صبح ہیں۔“

اس نے قدرے سختی سے جواب دیا۔

”آل رایت۔۔۔۔۔ آپ یہ بتا دیجئے کہ کل کا منی یہاں کیا کرنے آئی تھی۔“ اپنی

دانست میں پردیپ سنگھ نے بڑا زبردست انفیاتی حملہ کیا تھا۔

”کل۔۔۔۔۔ یہ آپ سے کس نے کہہ دیا۔“ کاٹش! وہ میرے پاس آئے۔ اس نے تو

میرے رمانوں پر اس ڈال دی۔ ایسی بے وقافتگی۔۔۔۔۔ مگر والوں کی طرح اس نے بھی ملنا چھوڑ

دیا۔ مجھے اس کی امید نہیں تھی۔ بہر حال دنیا شاید اسی کا نام ہے۔۔۔۔۔“ ڈاکٹر شیلانے سو گوار لہجے

میں کہا۔

”گو کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ کل یہاں نہیں آئی تھی؟“

پردیپ سنگھ نے زبردست مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی۔

”لگ مسٹر۔۔۔۔۔ میں ایک بات کا جواب ایک مرتبہ ہی دیا کرتی ہوں۔ شادی کے

بعد سے میں کا منی کی فحش دیکھنے کو ترس گئی ہوں۔۔۔۔۔ سمجھے تم۔۔۔۔۔ وہ میری بچپن کی دوست

ہے۔ میں نے اس سے کب انکار کیا۔ اب تو وہ اٹھلی جنس آفیسر ہے۔ اگر وہ کوئی قاتلہ بھی ہوتی تو

بھی میرے اس کے لیے یہی جذبات ہوتے۔ میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں اسے جانتی بھی

نہیں۔۔۔۔۔ لیکن وہ یہاں بھی نہیں آئی۔ شادی کے بعد بھی نہیں آئی۔ حرام خور۔۔۔۔۔ الو کی بچی۔۔۔۔۔

کاٹش!۔۔۔۔۔ ایک مرتبہ مل جائے۔“

ڈاکٹر شیلانے کالج کے زمانے میں بہترین اداکارہ مانی جانتی تھی اور آج اپنی اداکارانہ

ملاحیتوں کا بہترین مظاہرہ کر رہی تھی۔

”دیکھئے میڈم۔۔۔۔۔ ہمارے پاس اس بات کے مکمل ثبوت موجود ہیں کہ وہ آپ

کے پاس آئی تھی اور اب وہ کوئی اٹھلی جنس آفیسر نہیں ایک ہندار ہے۔ جس نے اپنے دیہی کوچہ

کرنے کی سازش میں حصہ لیا ہے۔“

پردیپ سنگھ قدرے جھنجھلاہٹ کا شکار تھا۔

”اگر تمہارے پاس ثبوت ہیں تو اسے یہاں سے برآمد کرلو۔۔۔۔۔ اور خبردار میرے

سامنے کا منی کے متعلق کوئی غلط بات نہ کہنا۔“

شیلانے کے آخری انفیاتی حملے نے تو اسے چاروں شانے چت کر دیا تھا۔

اس سے پہلے کہ پردیپ سنگھ اگلا سوال کرے ’سیر میوں سے مقامی ایس پی اپنے ایک

ماحت کے ساتھ اوپر آتا دکھائی دیا۔

○ ○ ○

”وٹس پرائیلم۔۔۔۔۔؟“

اس نے ڈاکٹر شیلانے سے ہاتھ ملاتے ہوئے دریافت کیا۔

”آپ کے یہ بہادر افسران یہاں مجرم ڈھونڈنے آئے ہیں۔۔۔۔۔ شاید میں کوئی

دہشت گرد ہوں کیونکہ انہوں نے میرے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا ہے۔“

شیلانے ان کی طرف اشارہ کیا۔

پردیپ سنگھ کو اس دوران اطمینان ہو چکا تھا کہ واقعی وہ لوگ یہاں نہیں آئے اور اسے اس طرح حملہ آور نہیں ہونا چاہیے تھا۔

”کون ہیں جناب آپ؟“

ایس بی نے پردیپ سنگھ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”اس طرف آئے۔“

پردیپ سنگھ نے شاید اسے کوئی خاص اشارہ کیا تھا۔ دونوں دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ دونوں کے درمیان کیا گفتگو ہوئی، اس کا اندازہ تو ڈاکٹر شیلانے کو نہ ہو سکا۔ لیکن تین چار منٹ بعد جب وہ باہر نکلے تو پردیپ سنگھ نے اس سے معذرت کرتے ہوئے درخواست کی تھی کہ وہ اس سارے واقعہ کو اپنے تنگ ہی محدود کمرے میں نہ لے جائے۔ اس نے شیلانے سے کہا تھا کہ کاٹھی اگر وال ایک غیر ملکی دہشت گرد کے ساتھ ملک کا بہت بڑا نقصان کر کے فرار ہو گئی ہے اور وہ لوگ اس کو تلاش کر رہے ہیں۔ اگر وہ یہاں آئے تو برائے مہربانی انہیں خبر دے۔ اس کے ساتھ اس نے ڈاکٹر شیلانے کو اپنا مقامی نمبر بھی دیا تھا۔

ایس بی نے خود بھی اس سے درخواست کی تھی اور تھوڑی دیر بعد وہ سب ایک میز پر چائے پی رہے تھے جو ڈاکٹر شیلانے نے ان کے لیے تیار کی تھی۔ اس دوران پردیپ سنگھ خود کو بہت شرمندہ محسوس کر رہا تھا اور اس نے واڈیکر کے ساتھ ہونے والے سلوک پر معذرت بھی کی تھی۔

لیکن..... پردیپ سنگھ نے یہ سب کچھ ٹھنڈے پیٹوں میں کہا تھا۔ ایس بی نے اسے کہا تھا کہ شیلانے کے متعلق غلط رائے قائم ہی نہیں کی جاسکتی۔ جب پردیپ سنگھ نے اسے کہا کہ کاٹھی نے اسے اصل صورت حال کہاں بتائی ہوگی، وہ اسے دھوکے میں رکھ کر اس کی مدد حاصل کرنا چاہتی ہو گی تو ایس بی نے یہ کہہ کر اسے لا جواب کر دیا تھا کہ ڈاکٹر شیلانے کو ایک مرتبہ یہ علم ہونے کے بعد کہ کاٹھی اور اس کا ساتھی کون ہیں؟ اس سے چھپانے کی کیا ضرورت تھی اور وہ کاٹھی کی اصلیت جاننے کے بعد ضرور اسے بتا دیتی کہ وہ یہاں آئی تھی یا نہیں۔

اس علاقے میں ڈاکٹر شیلانے اور اس کے خاوند کی سماجی حیثیت جاننے کے بعد ایک بات

کا اندازہ تو ”را“ والوں کو ہو گیا تھا کہ اگر ڈاکٹر شیلانے کے متعلق یہ ثبوت بھی مل جاتا کہ مفرد یہاں آئے تھے اور شیلانے ان کی مدد کی تھی تب بھی وہ ڈاکٹر شیلانے کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتے تھے۔

ان کے لیے صرف ایک ہی چانس تھا کہ وہ کاٹھی اگر وال اور طاہر کو یہاں سے گرفتار لیتے اور یہ چانس وہ کھو چکے تھے۔

مگر پردیپ سنگھ وہاں سے ناکام لوٹ آیا تھا۔ لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ اور ڈاکٹر شیلانے کی مستقل نگرانی کے لئے اپنے دو ماتحت وہاں چھوڑ آیا تھا۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ چھپے بھی ممکن ہو شیلانے کے خلاف اس بات کا ثبوت حاصل کر لے کہ اس نے دونوں کو پناہ دی تھی۔

یہ بات تو ثابت تھی کہ ان دونوں میں سے ایک دشمنی ضرور ہے جس کا ثبوت انہیں مسوری میں مل چکا تھا۔ اب انہیں صرف اسی ایک کلیہ کو بنیاد بنا کر انہیں تلاش کرنا تھا۔

اور..... یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔

000

دُعا کا نام

ایک مرتبہ پھر دونوں ڈھوڑی کی طرف عاجز سفر تھے۔
 کاشی نے ابھی تک طاہر سے اپنی اگلی منزل میں پوچھی تھی نہ ہی اس نے اپنی طرف
 سے طاہر کو ابھی تک کوئی صلاح دی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ طاہر کے ذہن میں تیار شدہ پلان کے
 مطابق ہی عمل کیا جائے کیونکہ وہ طاہر کو اپنا سب کچھ مان چکی تھی اور یہ سچائی اس پر دوز روشن کی
 طرح عیاں تھی کہ طاہر کو اپنا رہنما ماننے کا فیصلہ شاید اس کی زندگی کا بہترین فیصلہ تھا۔
 صبح کے جب وہ ڈھوڑی کی جانے والی بس پر سوار ہوئے تو انہیں دس فٹ کے فاصلے پر
 بھی کوشے ڈھنگ سے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔
 دھند اور برف کے گالوں نے سارے منظر کو دھسایا کر دیا تھا اور طاہر کا دل اس وقت
 ڈاکٹر شیلہ کے لیے بے پناہ احسان مندی کے جذبات سے لبریز ہو چکا تھا جب اسے احساس ہوتا کہ
 اگر شیلہ زبردستی اسے لہا کر کوٹ نہ دیتی تو شاید اس کی ہڈیاں ٹخمد ہو جاتیں۔
 اس نے کاشی کو زبردستی اپنی جیب بھی پہنا دی تھی۔
 سردی سے بچنے کے لئے انہوں نے بھی دوسرے لوگوں کی طرح اپنے جسم پر اتنا کچھ
 پہن رکھا تھا کہ ڈھنگ سے کسی کی شکل مکمل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔
 کاشی نے سر پر بھی گرم اونٹنی لونی اوڑھ رکھی تھی اور اپنے منہ کو گرم مٹلر سے اس طرح
 ڈھانپا ہوا تھا کہ اس کی آنکھیں ہی بے شکل دکھائی دے رہی تھیں۔ طاہر کی طرح اس نے بھی ہاتھوں
 میں گرم اونٹنی دستان پہن رکھے تھے۔

طاہر نے تو اس سے بھی زیادہ اہتمام کیا تھا۔
 شاید وہ زندگی میں کبھی وہ گرم ٹوپی نہ پہنتا جو کاشی اگر وال نے ایک طرح زبردستی سے
 اسے پہنا دی تھی۔ جس نے اسے سر سے گردن تک ڈھانپ دیا تھا اور اس کی صرف آنکھیں دکھائی
 دے رہی تھیں جن پر عینک موجود تھی۔
 طاہر نے بھی کاشی کی طرح گرم دستان پہنے ہوئے تھے اور اپنے ہاتھ کو خصوصاً
 زیادہ حدت پہنچانے رکھنے میں کوشاں تھا۔
 لیکن..... سردی جو ہڈیوں میں اتر رہی تھی اپنا اثر دکھانے لگی تھی۔ اسے اپنے ہاتھ
 میں درد کا احساس ہو رہا تھا۔
 بہر حال یہ کوئی ایسا درد نہیں تھا جو اسے پریشان کرتا۔ یوں بھی اسے اب خود کو نابل رکھنا
 تھا کیونکہ کاشی کے لیے یہ اطلاع بڑی پریشان کن ہوتی کہ اس کے ہاتھ میں درد ہونے لگا ہے۔
 بس ڈرائیور نے شاید بہت پہلے سے انجن شارٹ کیا ہوا تھا کیونکہ ڈیزل کی بودور تک
 پھیل گئی تھی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اسے دوبارہ بس کا انجن شارٹ کرنے میں کافی وقت پیش آتی۔
 یہاں تو سردی سے یہ عالم تھا کہ خون رگوں میں جتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ڈیزل کی تو بات ہی اور
 تھی.....
 خدا خدا کر کے پلا خربس چل پڑی۔
 حیرت انگیز طور پر سواریاں پورکی تھیں۔ ان میں زیادہ تعداد ملازم پیشہ یا پھر وہ نوبہا ہوتا
 جوڑے تھے جو جنی منوں منانے کے عزم سے ڈھوڑی جا رہے تھے۔ جیسا روپ ان دونوں نے بھی
 دھارا تھا۔
 بس چلی تو کاشی نے بیک سے گرم شال نکال کر طاہر اور اپنی ٹانگوں پر ڈال دی۔ طاہر
 بظاہر اس سے باتیں کر رہا تھا لیکن کاشی کا جو تعلق اس سے بندھ گیا تھا اس کے بعد طاہر کی کسی بھی
 تکلیف سے خبر نہ تھا اس کے لیے ممکن ہی نہیں رہا تھا۔
 ”درو تھیں ہو رہا باب.....؟“
 اس نے اچانک ہی طاہر سے دریافت کیا۔
 ”نہیں.....؟“

طاہر نے بے ساختہ کہہ دیا۔

اور..... کاشی نے بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس نے طاہر کے ہاں ٹان کرنے کے باوجود گھڑی کے ساتھ گرم چادری کی ایک ٹیک بنا کر طاہر کو اس کے ساتھ اس طرح بٹھادیا تھا کہ اسے گرم چادری کی گرمی کا احساس ہوتا رہے۔ اس کے بائیں طرف وہ خود طاہر سے لگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس طرح اس نے اپنی دانست میں طاہر کے بدن کو گرم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی تھی۔ اب اس نے طاہر کا بایاں بازو اپنی گود میں رکھ کر آہستہ آہستہ دہانہ شروع کیا تو طاہر کو عجیب سی غماض کا احساس ہونے لگا۔

اس کا درد کم ہونے لگا تھا.....!

قریباً آدھ گھنٹہ تک بس رینگ رینگ کر چلتی رہی۔ اب وہ شہر سے باہر اس پہاڑی سڑک پر آگئے تھے جو ڈلہوڑی جاتی تھی۔ انہیں آٹھ گھنٹے کا سفر طے کرنا تھا اور یہی وہ واحد بس تھی جو اپنی اچھی سروس کے لیے مشہور تھی۔ یہی وجہ تھی کہ شدید سردی میں بھی جب اپنے بستروں سے نکلنا ممکن نہیں ڈلہوڑی جانے والے مسافر اس بس تک پہنچ چکے تھے۔

کاشی کی نظر بس بار بار اپنی گھڑی کے ڈائل پر جاتی تھیں۔ گھڑی کی سوئیاں جیسے ہی آٹھ پر پہنچیں اس نے اپنے پیٹ بیک سے تین مختلف گولیاں نکالیں۔ اپنے قدموں میں دھرے تھراں سے چائے ایک کپ میں اغلیں اور گولیاں طاہر کی طرف بڑھا دیں..... طاہر بے ساختہ مسکرا دیا۔

”کم از کم دوران سفر تو رنگ بھول چاہا کرو۔“

”چپ چاپ اچھے بچوں کی طرح نکل جاؤ۔ تمہیں ابھی یہاں کی سردی کا انداز نہیں۔“

امید ہے کہ مجھے تمہارے منہ میں خود وہ دانہ ڈالنی پڑے گی۔“

کاشی نے تھراں کا ڈسکن بند کرتے ہوئے کہا۔

طاہر اب اسے اپنی محبوبہ سے زیادہ محسنہ جاننے لگا تھا۔ اس کا ایمان تھا کہ زندگی موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔

لیکن..... کاشی نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ میسائی کا جوا انداز اپنایا تھا اس نے طاہر کو بہت متاثر کیا۔

اس نے اندازہ لگایا تھا کہ اب کاشی کے دل پر کوئی بوجھ نہیں رہا۔ گزشتہ تین دنوں سے اس کے چہرے پر جو سکون ٹھہر گیا تھا، جس طرح اس کی آنکھیں پر سکون رہنے لگی تھیں اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اب اس کا ضمیر اپنے کسی بھی عمل پر مطمئن ہے اور اس کے دل اور دماغ میں اگر کسی فیصلے پر پہنچنے کے لئے کوئی جنگ جاری تھی تو وہ اب ختم ہو چکی تھی۔

ڈلہوڑی تک کے سفر میں بس دو تین مرتبہ رکی تھی۔

خریت گزری کہ راستے میں کوئی لینڈ سلائیڈ تک نہیں ہوئی تھی جس نے انہیں بروقت ڈلہوڑی پہنچا دیا۔

دوران سفر انہوں نے صرف ایک جگہ چائے کے ساتھ سکٹ کھائے تھے ورنہ تو کاشی

بھی اس کی طرح سفر خالی پیٹ کرنے کی عادت تھی۔

○ ○ ○

ڈلہوڑی میں بس جہاں رکی وہاں تین چار بیس پہلے سے موجود تھیں۔ یہاں خاصی چہل چل پھل دکھائی دے رہی تھی۔ سر پہرے کے چار بج رہے تھے اور دھوپ اپنے پورے عروج پر تھی۔ ان کی آنکھوں کے سامنے تاحدنگاہ ڈھلان پر برف روئی کے گالوں کی طرح چمکی ہوئی تھی۔ قدرت نے بڑی مہارت سے سارے منظر پر جیسے سفید چادر تان دی تھی جس پر سورج کی سنہری کرنوں کا رقص آنکھوں کے لیے بڑا طمانیت بخش تھا۔

گرمیوں میں تو یہاں جل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی لیکن شدید سردی کے اس موسم میں یہاں کچھ زیادہ بھیڑ بھاؤ نہیں تھی۔ بس کے ٹیکسٹ نے ان کا سامان جو دو بیک پر مشتمل تھا بس کی چھت سے اتار دیا۔

کاشی کے لیے ڈلہوڑی کوئی نئی جگہ نہیں تھی۔ اپنی شوؤٹ لائف میں اور پھر دوران سروس وہ متعدد بار یہاں آچکی تھی۔ ایسے مل ٹیشن ہمیشہ سے اس کی کمزوری رہے تھے۔

طاہر کے لیے الٹی یہ جگہ ایشی تھی۔ اسے ہا میل پر دلش کا صرف نقشے کی حد تک ہی علم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے یہاں آنے سے پہلے ہی کاشی کو اپنا رہنما بنالیا تھا اور اسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ اب یہاں انہوں نے جو تین دن گزارنے ہیں وہ کاشی کی ہدایات کے مطابق ہی گزاریں گے۔

مطابق زخم پر سیلہ بسن پاؤں رچھڑک دیا۔
”شاہاں..... اب یہ قیمتی بکڑ اور احتیاط سے اوپر والی آخری سچ کا دھا کا کاٹ

”۔“

اس نے کاٹنی سے کہا۔

”ظاہر مجھ سے نہیں ہوگا۔ میں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔“

وہ کچھ گھبرا رہی تھی۔

”ارے پھر کیا..... یہ جو کچھ تم کر رہی ہو کیا ایسے پہلے بھی کیا تھا.....؟ بھی حالات اور وقت کے مطابق سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ کم آن کاٹنی..... تم اٹھلی جنس چپ Chap ہو۔ تمہیں تو سب کچھ کرنے کے لیے تیار رکھا جاتا ہے۔ کیری اون.....!“

اس نے اس اعزاز سے کہا کہ کاٹنی بے ساختہ ہنس دی۔
اور..... حیرت انگیز طور پر اس نے ظاہری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اس کی تمام سچڑ بڑی آسانی سے نکال دیں۔

ڈاکٹر شلا تو ویسے ہی کمال کی سرجن تھی لیکن ظاہر کے لئے تو اس نے بطور خاص بڑی مہارت دکھائی تھی۔ کیا حال جڑا کئے نکلنے کے بعد ہاتھ پر معمولی سے نشان بھی باقی رہے ہوں۔
”ویل ڈن کاٹنی..... ویل ڈن ڈاکٹر شلا..... حینک یو.....! حینک یو..... ویری

ج.....! اگر زندہ رہے تو تمہارے اس احسان کا شکر یہ ضرور ادا کریں گے۔“
ظاہر نے اپنے ہاتھ باندھ کر انھیں کو باری باری جنس دیتے ہوئے کہا۔
کاٹنی کا دل بھرا آیا۔

اسے شلا بے اختیار یاد آ گئی۔ جب اس نے دل ہی دل میں اپنا یہ مہم ہر لایا کہ وہ بھی اپنی اس سبیلی سے کبھی الگ نہیں ہوگی۔

اس کی آنکھوں میں اچانک نمی اتر آئی تھی۔ اپنا دلی کیفیات جواب چہرے پر آنے لگی تھیں ظاہر سے پوشیدہ رکھنے کے لیے اس نے سارا سامان اٹھا کر ہاتھ روم کا رخ کیا اور جب پیالہ وغیرہ دھو کر وہ باہر نکلی تو بالکل نابل ہو چکی تھی۔ ظاہر کے زخم پر معمولی سی مرہم پٹی کرنے کے بعد اس نے ظاہر کے ہاتھ سے اترے والے اسب کچھ ٹوکری سے نکال کر ایک پوٹی تھن بیگ میں بند

کیا جس مقصد کے لئے اس نے پہلے ہی سے اپنے پاس رکھے ہوئے تھے اور ایک ٹیپ سے بند کر کے ہاتھ روم والی ٹوکری میں رکھا آئی۔

ظاہر کی پتیلی باہر سے صاف تھی۔ اندر دنی طرف البتہ دوا لگنے کے بعد کاٹنی نے ڈاکٹر شلا کی طرف سے ملی ہوئی جینز سب کچھ لگا دی تھی جس کو ٹیپ بند کر کے چھپانا بہت آسان تھا۔

”تمہاری دوست بہت عظیم عورت ہے کاٹنی..... اسے واقعی تمہاری ہی دوست ہونا چاہیے تھا۔ کاٹنی اپنا دل بوجھل نہ رکھنا۔ مجھے یقین ہے کہ زندگی میں تم دونوں ضرور آپس میں ملتی رہو گی اور میں اپنی رباط بھر کوشش کے ساتھ ایسا ممکن بنائوں گا۔“

کمرے کی کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے دور خلاؤں میں جھانکتے ہوئے کہا۔
کاٹنی خاموشی سے اس کے برابر آ کر کھڑی ہو گئی..... کھڑکی کے سامنے سے پردہ ہٹا کر وہ باہر کا منظر دیکھ رہے تھے۔

ان کی کھڑکی کے سامنے ہوٹل کا طویل مگھرا سبز لان موجود تھا جہاں رنگ برنگی کیو بیباں دھنک کا سامان باندھ رہی تھیں۔

سورج کی کرنیں شاہی سارے ڈبلوزی سے سمت کر رہی ویلو ہوٹل کے اسی لان پر مرکوز ہو چکی تھیں جہاں مہارت کے مختلف کونوں سے آئے نو بیا جتا جوڑے اور کچھ ٹیلیو اپنے بچوں سمیت قیام پزیر تھیں۔

ان کی نظر بھی سرداروں کے ان بچوں پر پڑی تھیں جو ایک دوسرے سے اٹھلیاں کرتے لان میں بھی کیو بیباں کے گرد گرد چکر کاٹ رہے تھے۔
طویل لان کے کونوں پر خوبصورت ریٹک موجود تھی جس کے بعد پہاڑیوں کے چھوٹے چھوٹے سلسلے شروع ہو جاتے تھے۔

ان پہاڑیوں کے دامن سے جھانکتے جنگلوں کی اوٹ میں سورج ڈھل رہا تھا۔ سبز درختوں پر اس کی سنہری کرنیں شام کا آخری سلام کر رہی تھیں اور پہاڑیوں کی سرسبز چوٹیاں سورج کا کرنی پڑا ہوا اہن اوڑھ رہی تھیں۔

مہنر پہاڑوں کے دامن میں کہیں کہیں تھی برف پر سورج کی کرنوں کا قص جاری تھا اور اس رقص کے دامن سے سنہری روشنیاں جھوگ رہی تھیں۔

اس نے بے اختیار اپنا سر طاہر کے کشادہ سینے پر رکھ کر اس کی بات کا جواب دیا کیونکہ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

○ ○ ○

طاہر نے ڈنر ہوٹل کے مین ہال میں کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ یہاں سٹ کر بیٹھنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ وہ کمرے میں بند رہ کر کسی کے لیے بھی سوالیہ نشان بن سکتے تھے۔

دونوں ہال کمرے میں آ گئے۔

ایک کونے میں دھڑی میز جس کے گرد دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں انہوں نے سنیچال لی۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے ہوٹل کا مین ہال بھر گیا۔ اشتہار انگیز کھانوں کی خوب موسیقی اور ہال کے مین وسط میں بنے گول میز پر کمرچاتی ناچتی لڑکیاں۔

اب طاہر کو اچھی طرح سمجھ آ رہی تھی کہ یہاں زیادہ تر فوجی جوان کیوں آ رہے ہیں۔ ہوٹل کا بار دم اسی ہال سے منسلک تھا جہاں لوگ باری باری جاتے اور شراب کے جام اٹھائیں کر کھانے پر فوٹ پڑتے۔

انہوں نے ہوٹل کا مینو دیکھنے کے بعد اپنے لیے مناسب کھانا منگوا لیا تھا۔ دونوں دیر گئے تک یہاں بیٹھے کھانے کے بعد چائے سے دل بہلاتے رہے۔ جوں جوں رات دھڑل رہی تھی ہال کے مرکزی میز پر موجود رکھیاؤں کے کپڑے مختصر ہونے لگے تھے۔ ان کے ڈانس بیچان انگیز ہو رہے تھے۔

میٹھے رقصاؤں کے ساتھ ساتھ شراب کے نشے میں بدست لڑکے اور لڑکیاں بھی ہال میں گونجتی موسیقی کی دھنوں پر ناچ رہے تھے۔

شاید اب کاشی کے لیے ایسے مناظر میں دلچسپی کا عنصر باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اس کے برعکس وہ غامضی بورت محسوس کر رہی تھی۔

آج سے چند روز پہلے تک یہ ماحول اس کے لئے آئیڈیل تھا لیکن اب اسے کراہیت محسوس ہو رہی تھی۔

اس کے چہرے پر ابھرے ناگواری کے تاثرات نمایاں ہونے لگے تھے۔ طاہر بڑی سہری نظر دوں سے اس کے نفسیاتی اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔

یہ تبدیلی خوش آئند اور کاشی کے اندر پیدا ہونے والے انقلاب پر دلالت کرتی تھی۔ اس نے مسکرا کر سند دوسری طرف موڑ لیا۔

”چلو یہاں سے چلیں۔“

بالآخر کاشی نے کہہ ہی دیا۔

”کہاں.....؟“

طاہر نے جان بوجھ کر سوال کیا۔

”کہیں بھی..... یہاں سے اٹھو۔“

کاشی نے باقاعدہ اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

”ٹھیک ہے..... جیسے تمہاری مرضی۔“

طاہر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

دونوں اپنے کمرے میں آ گئے۔

رات انہوں نے کمرے میں بسر کی۔ طاہر فرش پر اور کاشی بستر پر سوئی تھی۔ خاصی دیر تک وہ بے اندر کی طرح چنگ پر لیٹے کیونکہ اسے زیادہ آرام کی ضرورت تھی لیکن طاہر نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

علی الصبح جب طاہر اٹھ کر نماز پڑھ رہا تھا کاشی اپنے بستر سے اٹھ کر زمین پر بیٹھ گئی اور اسے دلچسپی سے دیکھتی رہی۔

نماز کے بعد دعا کرتے ہوئے طاہر نے بطور خاص اللہ تعالیٰ سے استعجا کی تھی کہ جس طرح صدق دل سے کاشی نے دین کی حقیقت کو جان کر قبول کر لیا ہے اللہ اس کی مدد کرے اور اس کا ایمان مضبوط بنائے۔

کاشی بسا اوقات بالکل بچوں کی طرح خند کرنے لگتی تھی۔ آج وہ بے اندر کی طرح اسے بھی نماز پڑھانے لگا جس پر اس نے بالآخر کاشی کو اپنے پیچھے قرآنی آیات دہراتے ہوئے نماز پڑھانی شروع کر دی۔

جس وقت کاٹنی نماز کے خاتمے پر دعا مانگ رہی تھی اس کے چہرے پر ہانا نور کا ہالہ آنکھوں کے راستے طاہر کے دل پر نقش ہو گیا۔ اس نے اپنے بزرگوں سے جن کرامات کی باتیں سنی تھیں انہیں آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔

کاٹنی نے دل ہی دل میں بڑی لمبی دعا مانگی تھی۔۔۔۔۔

اس کی شدید خواہش پر آج اسے کلمہ طیب پڑھانے کے بعد طاہر نے باقاعدہ دائرہ اسلام میں داخل کر لیا تھا۔

اس نے اپنی ایک مسلمان کلاس فیلو مریم کے نام پر اپنا اسلامی نام مریم تجویز کیا تھا۔ طاہر کو اس میں کیا اعتراض ہوتا۔ اس کی تو خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ البتہ اس نے کاٹنی سے ایک درخواست ضرور کی تھی کہ وہ ابھی سب کچھ مینڈراز میں رکھے۔

ناشد انہوں نے کمرے ہی میں منگوا لیا تھا۔۔۔۔۔

طاہر نے محسوس کیا کہ اب اس کے سر پر چادر مستقل تک ملے گی تھی اور اس نے شلووار قمیض پہن لی تھی۔

طاہر کی درخواست اور حالات کے پیش نظر اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے میک اپ میں کچھ تبدیلی کی تھی۔ دونوں کی کوشش تھی کہ وہ اپنی تصویروں سے کسی بھی طرح مختلف نظر آئیں اور اس میں ابھی تک دو کامیاب بھی تھے۔

طاہر نے اب پکڑی اتار دی تھی لیکن ڈانگی برقرار رکھی ہوئی تھی۔ اس کے بالوں کا شائے بڑی ہمت کے بعد سر کے درمیان سے مانگ نکال کر کاٹنی نے تبدیل کر دیا تھا۔ اور آنکھوں پر سفید شیشوں کی ٹینک لگانے کے بعد وہ اس عمر میں بھی خاصا عجیبہ قسم کا کوئی سرکاری افسر دکھائی دیتا تھا!۔۔۔۔۔

کاٹنی نے اپنے بال ہائیڈروجن سے رنگ لیے تھے اور ڈاکٹر شیلہ کے ہاں سے رولر اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ اس کے گہرے کالے رنگ کے سیدھے بال اب بھورے رنگ کے کھنکھریالے بالوں میں تبدیل ہو چکے تھے اور جین جیکٹ پہننے کے بعد وہ کسی ماڈرن گھرانے کی ایسی بھارتی ناری بن گئی تھی جس کے ماں باپ نے زبردستی اس کی شادی ایک سنجیدہ سے سرکاری افسر سے کر دیا تھا اپنی جان چھڑائی ہو۔

اس مرتبہ اس نے جان بوجھ کر کمرے کے باہر مغربی اطوار اپنائے تھے۔ اور اپنے کانوں میں لمبے لمبے بندے ڈال کر ایسی مغربی دو شیزہ پہننے کی اداکاری کی تھی جس نے اپنے اوپر مشرقیت زبردستی عاری کر لی ہو۔

صبح کا ناشد انہوں نے اپنے کمرے میں کیا اور سورج نکلنے کے بعد باہر آ گئے۔ انہوں نے اب شام کا وقت کمرے سے باہر ہی گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اپنے ایک بیگ میں کاٹنی نے ہر ایسی چیز ڈال لی تھی جس سے اس کی پہچان ممکن ہو سکے اور وہ بیگ اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔

اپنے کمرے میں انہوں نے صرف کپڑے اور ضروری سامان ہی چھوڑا تھا۔ رات والی مینڈراج انہوں نے باہر پھینکنے کے لیے اپنے پاس محفوظ کر لی تھی کیونکہ ان کی غیر موجودگی میں کمرے کی صفائی ممکن تھی۔

○ ○ ○

دونوں ہوٹل سے پیدل چلتے پتھر تھک آ گئے جہاں سے انہوں نے باقی لوگوں کی دیکھا دیکھی سڑک آغاز کیا۔

ابھی زیادہ لوگ اس طرف نہیں آئے تھے اور سڑک قدرے ویران نظر آ رہی تھی۔ البتہ سڑک کے کنارے موجود ڈھابوں کے چولے ضرور روشن تھے۔ سڑک کی خستہ حالی اس کی ٹوٹ پھوٹ سے عیاں تھی۔ دونوں کناروں پر لگے درختوں سے ٹوٹ کر گرنے والے سوکے پتے ہوا کے ساتھ سڑک پر کھڑکھڑاتے پھرتے تھے۔ فضا میں چادر اور ایک پائیت سی عاری تھی۔

کاٹنی کے لیے یہ راستہ اب بھی نیا تھا۔ وہ یہاں سے درجنوں مرتبہ گزری تھی لیکن آج جیسا سفر جانے زندگی میں کب نصیب ہو؟

اس نے سوچا۔۔۔۔۔

شاید یہ ڈیوڑھی میں اس کی زندگی کا آخری سفر تھا۔ کسی ناپیدہ طاقت نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی اور کاٹنی نے چاہا کہ جی بھر کے اس ملکہ کبھار کے ایک ایک منظر کو اپنی آنکھوں کے راستے اپنے دماغ پر نقش کر لے۔

طاہر کو یہاں ہر شے شکست خوردہ دکھائی دے رہی تھی۔ گہرے ہنر پہاڑ کی روئیدگی

واپس کچھوں میں کہن سالی دور قدیم کے حوض پانی سے خالی تھے اور ان پر کائی آلودہ شعلی کے آثار نمایاں دکھائی دے رہے تھے۔

سڑک کنارے نگڑی کے بچے کی جگہ درمیان سے ٹوٹ چکے تھے البتہ ان کی لوہے کی ہاتھیں ابھی تک قائم تھیں جن کا رنگ گالے سے اب رنگ آلودہ ہونے کے بعد پادامی سا دکھائی دے رہا تھا۔ طاہر کو یوں لگا کہ جیسے وہ ان میں سے کسی ساخوردہ بچے پر بیٹھے گا وہ ٹوٹ کر نیچے گر جائے گی۔

کناروں کے ساتھ ساتھ البتہ قدرت کی فیاضی اپنے نقطہ عروج کو چھو رہی تھی۔ سڑکوں کے کنارے گہرے جنگلات کے ساتھ ساتھ دست قدرت نے رنگ رنگ پھولوں والی گہری بیلوں کے جال تان رکھے تھے جن سے جھانکتے یہ رنگ رنگ پھول عجیب بہار دکھا رہے تھے۔

پہاڑوں کی گہرائیوں سے اٹھنے والی خوشبو دار اور پھولوں سے لدی پھندی خوش رنگ بلیں کھائیوں کھائیوں اور گڑھوں سے اٹھ کر فطرت اور دیران سڑک سے نکلے ملتی دکھائی دیتی تھیں۔

گھنے درختوں کے جھنڈ اب مقامی محکمہ جنگلات کی مہربانیوں سے کہیں کہیں خالی نکالی دکھائی دینے لگے تھے۔ درمیان سے درخت کاٹ کر فروخت کر دیئے جاتے تھے۔ نگڑی کی چوری یہاں کی سب سے بڑی اور اہم ترین کرپشن تھی۔

ایک بات طاہر نے بطور خاص محسوس کی کہ یہاں بھارت کے باقی حصوں سے بھی کچھ زیادہ ہی غربت دکھائی دیتی تھی۔ راستے میں انہیں جتنے مقامی اور غیر مقامی لوگ آتے جاتے دکھائی دیئے ان سب کے چہروں سے ایک بے نامی غم و غصہ نکلتا تھا۔ رنگ و روپ سے عاری مر جھائے ہوئے بے رونق چہرے۔

سڑک کے ساتھ ساتھ کہیں اگر کوئی عمارت دکھائی دیتی تو وہ بوسیدہ اور کائی آلود ہوتی۔ کبھی انگریزوں نے ذوق و شوق سے یہاں جو جنگل اور ڈاک جنگل بنائے تھے اب وہ کھنڈرات کے ڈھیر بننے چارے تھے۔ ان کے گرد بھجڑ بھنکار کے جنگل اگے ہوئے تھے۔

ڈاک جنگلوں کے بڑے بڑے لاناؤں پر خوبصورت اور خوش رنگ پھولوں کی جگہ نازیدہ جھاڑیوں نے لے لی تھی۔

دونوں ایک چھوٹی سی مارکیٹ میں داخل ہوئے تو وہاں موجود تمام دکانداروں کی لچکائی ہوئی فقیرانہ قسم کی نظروں نے انہیں اپنے حصار میں بٹھرایا۔

ہر دکاندار کی خواہش تھی کہ وہ اس کی دکان پر آئیں۔ کسی کسی دکان پر اکا دکا گاہک دکھائی دیتا تھا ورنہ تو زیادہ تر دکاندار یہاں خالی ہاتھ نکلیاں ہی مار رہے تھے۔ طائرانہ نظروں سے چھوٹی چھوٹی دکانوں کا جائزہ لینے کے بعد پالا خرہ ایک دکان میں جا گئے۔

دکان کا مالک اپنے عقب میں لگی کسی دیو کی تصویر کے نیچے ”وصف“ جلا کر شاید کبھی کاختر تھا۔

کاشی نے یہاں سے دو گہرے رنگوں کی عینکیں اور مقامی طور پر بنی دو الگ الگ قسم کی ٹوپیاں خریدیں۔ کچھ اور چیزیں بھی اس نے خریدی تھیں اور طاہر کے جیب میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس نے بڑی بھرتی سے اپنے پاس موجود چیزوں سے مل کر ادا لگی کر دی تھی۔

اس نے دکاندار کی ڈیمانڈ سے آدمی قیمت پر یہ چیزیں خریدی تھیں۔ جن میں دو شاندار گرم زمانہ چادریں بھی تھیں جو مقامی کارکنوں کو تیار کردہ اور یہاں کی سوغات دکھائی دے رہی تھیں۔

طاہر کو یوں لگتی تھی کہ ان چادریوں کا مصروف کیا ہے لیکن اس نے خاموشی اختیار کر رکھی۔

دکان سے باہر آ کر جب کاشی نے گہرے رنگ کے بڑے بڑے شیشوں والی ٹینک اپنے چہرے پر لگا کر سر پر یہاں سے خریدی ہوئی کپڑی پہنی تو طاہر کے لئے بھی اسے پہلی نظر میں پہچاننا ممکن نہ رہا۔

”وہ نقل.....!“

اس نے بے اختیار کاشی کو دوا دی۔

اسے یقین تھا کہ اب وہ واپس بناواری کپ بھی پہلے جاتے تو کوئی آسانی سے اسے شناخت نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ وہ خود اپنی شناخت نہ کروائے۔

”طاہر مجھے یہ کھاب بالکل پسند نہیں۔ صرف تمہاری خواہش کے احترام میں اپنا بیس تبدیل کرنے کے لئے میں نے یہ سوا لگا رکھا ہے۔ مجھے اب صرف تمہارے حکم کی تعمیل کرنی

ہے۔

اس نے ہار آنے پر کہا۔

”اوہ کاشی..... تم مجھے مار ڈالو گی..... دیکھ لینا تم مجھے مار ڈالو گی۔“

اس نے بے اختیار کاشی کے ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر دباتے ہوئے کہا۔

دونوں نے تھوڑی دیر بعد ایک دُعا پے سے چائے اور بھری کے پکڑے کھائے۔ ان

کا یہ ایک طرح سے لچ تھا۔

شام تک کا وقت انہوں نے اسی طرح مہرِ شفقت کر کے گزرا اور سورج ڈھلنے پر اپنے

کمرے میں واپس آ گئے۔

ان کے کمرے سے ملحقہ دو زمین کمروں میں ٹویا بٹا جوڑے ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ

سب ان کے ساتھ ہی واپس آئے تھے۔

دن بھر مسلسل پیدل چلنے سے وہ قدرے تھکاؤت محسوس کر رہے تھے لیکن یہاں بیٹھ کر

وقت گزارنے سے بہر حال گھومنا پھرنا زیادہ بہتر تھا۔

کمرے میں کچینے کے بعد کاشی نے سب سے پہلے اپنے ایک سے ہسٹول نکال کر

سربانے رکھا۔ یہ سرکاری ہسٹول ابھی تک اسی کے پاس محفوظ تھا۔ چھوٹا ہونے کی وجہ سے اسے

چھپانے میں بھی زیادہ دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ ظاہر کے کہنے پر ہسٹول وہ اپنے بیک میں رکھتی

تھی۔ دونوں نے کمرے میں آ کر اس بات کا اطمینان کر لیا تھا کہ ان کے بعد کبھی کسی شک کی بنیاد

پر کمرے کی تلاشی تو نہیں لی گئی یا پھر کسی نے یہاں کوئی ”جگ سسٹم“ تو نہیں لگایا ہوا۔ دونوں اٹھلی

جنس کے تربیت یافتہ تھے اور اپنی تربیت کے مطابق دونوں نے اطمینان کر لیا تھا کہ ایسا کچھ نہیں

ہوا۔

ظاہر نے کمرے میں کافی ہنگوانے کے بعد دروازے کے باہر ”ڈونٹ ڈسٹرب“ کا

سائن لگا دیا تھا اور اب وہ کاشی کی طرف متوجہ تھا۔ اسے اب کاشی پر معمولی سے شک و شبہ بھی باقی

نہیں رہا تھا کیونکہ کاشی نے اس کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا تھا اور اب ان کا بیعت نامہ سنا سمجھا تھا۔

اس نے اپنے ذہن میں ترتیب دینے پر دو گرام سے اسے آگاہ کرتا ہوا اس سے

درخواست کی تھی کہ وہ مناسب سمجھے تو اس میں رد و بدل بھی ہو سکتا ہے۔ کاشی نے جتنی طور پر اس کی

برتری بٹواری کمپ میں تربیت کے دوران ہی تسلیم کر لی تھی۔ خاص طور سے پوسٹال سے اس کی

لڑائی کے بعد اسے کوئی شک باقی نہیں رہا تھا۔ یوں بھی بٹواری کمپ سے فرار ہونے کے بعد سے

اس کے ساتھ گزارے ایک ایک لمحے نے کاشی کو ظاہری پہنچ اور جسمانی صلاحیتوں کا معترف بنا

دیا تھا۔ اس نے ظاہری تجویز پر تسلیم کر کے ہونے سے بتایا کہ جس علاقے سے اس نے سرحد

عبور کرنے کا پروگرام بنایا ہے اس امر یا ہے کاشی اگر وال نے اپنی سروں کا آغاز کیا تھا اور اسے

وہاں سے متعلق خاصی معلومات بھی حاصل ہیں۔

”ہمیں اپنے اور دشمن کے درمیان کم از کم آٹھ دن کا وقفہ رکھنا ہے۔ میرا خیال ہے

آٹھ دن انہیں یہ یقین دلانے کے لیے کافی ہوں گے کہ اب ہم ان کی دست برد سے بچا نکلے ہیں

اور اب انہیں کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے۔“ کم از کم یہ ضرور ہو گا کہ انہوں نے ہماری

تلاش پر جو اضافی فورسز لگائی ہیں وہ واپس آ جائیں گے۔ اور باطل حالات سے ہم انتقام اللہ

نہت ہی لیں گے۔ معمول کی نگرانی اور چوکی تو کبھی ختم نہیں ہوگی، لیکن وہ لوگ تین چار روز کے

بعد زیادہ دیر نہیں رہیں گے۔“

ظاہر نے کہا۔

”انہیں دھوکہ دینے کی ایک سیم میرے ذہن میں آئی ہے۔“

کاشی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”کیا.....؟“

ظاہر نے پوچھا۔

اور اب کاشی نے اسے جو سیم بتائی اس پر وہ دل ہی دل میں اسے داد دینے بغیر نہ رہا۔

کاشی نے یہ منصوبہ اس بنیاد پر تیار کیا تھا کہ اس کے والدین کی کڑی نگرانی ہو رہی ہوگی اور انہوں

نے ”را“ کی اسی ”چوکی“ کو اپنے حق میں استعمال کرنا تھا۔

”وڈر فل..... کاشی..... میرے ذہن میں تو یہ بات آئی ہی نہیں تھی۔ کل ہی

اس پر کام شروع کرتے ہیں۔“

ظاہر نے کہا۔

کاشی نے حساب لگایا تھا کہ ظاہر ابھی مزید چار پانچ روز بھارت میں ضائع کرنا چاہتا

ہے اور اسے اچانک ہی خیال آیا تھا کہ ان کے پاس اتنا زور اور بھی ہو گا یا نہیں..... لیکن..... اس نے طاہر سے یہ سوال کرنے کے بجائے اپنے پرس میں موجود ساری رقم باہر نکالی اور ہاتھ میں پینے سونے کے انگٹن کے ساتھ اس کی طرف بڑھا دی۔

”یہ کیا.....؟“

طاہر نے حیرانگی سے پوچھا۔

”دیکھو طاہر اب تمہاری یا میری والی کو کوئی بات رہی نہیں..... میرا جو کچھ ہے وہ تمہارا ہی تو ہے۔ میں بہر حال ایک مشرقی عورت ہوں جو یہ چاہے گی کہ اپنا سب کچھ اپنے بچے کے حوالے کر دے..... یوں بھی اس رقم کا مناسب استعمال ہی تم ہی کر سکتے ہو۔“

طاہر اس کا مطلب بخوبی سمجھ گیا تھا۔ شاید کاٹھی نے اخراجات کا اندازہ لگا کر یہ سوچا ہو کہ طاہر کے پاس پیسے ختم نہ ہو جائیں۔ کاٹھی کی اس بات پر مسکراتے ہوئے اس نے کاٹھی کی ساری رقم واپس کر کے اپنے ہاتھ سے وہ انگٹن اس کے بازو میں پہنا دیا۔

”کاٹھی..... میرا تعلق ایک چھوٹے لیکن غیرت مند ملک کی فوج سے ہے جو اپنے ساتھی کو کسی تباہی نہیں چھوڑتے۔ اول تو میرے پاس کافی رقم ہے۔ اگر خدا خواستہ ضرورت پیش آگئی تو اس کا بندوبست ہو جائے گا۔ ایک دن کے مارچن پر ہمیں مطلوب رقم مل سکتی ہے لیکن اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اور ہاں..... کہیں اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے تم خواہو کہجوسی نہ کرتی رہتا۔ اپنے معمولات کے مطابق سب کچھ کرو..... بے فکر ہو اور کچھ نہ بناتو دو دنوں ناگزیر حالات میں کسی بھی لالچی کو کوٹ کر اپنا کام چلا نا جانتے ہیں۔“

کاٹھی اس کی بات پر کھٹکلا کر ہنس دی۔

چلی مرتبہ طاہر نے اسے پرسکون اور ہنستے ہوئے دیکھا تو اسے روحانی خوشی حاصل ہوئی تھی۔ اگلا روز بھی انہوں نے ایسے ہی گزار دیا اور آج انہیں تیسرا دن تھا جب طاہر نے مقامی بی۔سی۔ او سے ایک کال اپنے کھٹنڈو میں موجود دوست پر تاب مہرہ کے لئے بک کروائی۔ وہ اب کاٹھی کے بتائے ہوئے منصوبے پر عمل کرنے جا رہا تھا۔

کھٹنڈو کے گرجنڈو میں موجود ایک فریول کنبھی کے شہر مسٹر پر تاب مہرہ نے اس کی کال موصول کی تھی۔ طاہر نے اس سے مختصر بات کرتے ہوئے اپنا پیغام اسے اس طرح لکھا یا کہ

اگر یہ فون کہیں دیکارڈ بھی ہو رہا ہو تو کسی کے کچھ پلے نہ پڑے۔ البتہ مسٹر پر تاب مہرہ نے یہ کال کئی اور پیغام بھی نوٹ کر لیا۔

○ ○ ○

پردیپ سنگھ سولان سے واپس ضرور آ گیا تھا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ اس نے ڈاکٹر شیلے سے اپنے معمول کے مطابق انکیش نہیں کی تھی لیکن دو روز تک اس کے ایجنٹوں نے مقامی تحصیل برانچ کی مدد سے سر توڈکوشل کر ڈالی تھی کہ ان کے ہاتھ کوئی ایسا ثبوت لگ جائے کہ یہاں کاٹھی اور طاہر آئے تھے لیکن انہیں یہاں سے کچھ حاصل نہ ہوا۔ اب اس نے اپنا ایک چالاک اسٹنٹ اس امید پر یہاں چھوڑ دیا تھا کہ شاید آئندہ کبھی کاٹھی اپنی دوست ڈاکٹر شیلے سے ملے یا مدد لینے کی کوشش کرے۔ اسے اندازہ تھا کہ ابھی وہ دونوں اس ملک میں ہی ہیں۔ اتنی جلدی وہ فراٹھیں ہو سکتے تھے کیونکہ ”را“ نے اطلاع ملنے ہی نزدیک ترین نیپال کی سرحد پر یا سئل کر دی تھی۔

پکراتا سے گنگوڑی نامی بھارت کے سرحدی علاقے کا جانے والے راستے کو انہوں نے ایک طرح سے لینڈ لاک کر دیا تھا۔ صرف ایک چانس تھا کہ اگر واردات کی پہلی رات ہی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے تو یمن ممکن ہے وہ نکل چکے ہوں۔ ورنہ مقامی انٹیلیجنس اور سرحدی پولیس تو ان کی غلام تھی جو ان کے حکم پر زمین کا چپچہ چھان سکتی تھی۔

پردیپ سنگھ نے کاٹھی کے ماضی کے حوالے سے جتنے تعلق تلاش کئے تھے ان سب کی کڑی جھرائی ہو رہی تھی۔

ان سب کی ڈاک چیک ہو رہی تھی۔

ان کے ٹیلی فون ”بم“ ہو رہے تھے۔

ان کی نقل و حرکت مکمل ملاپ پر کڑی نظر رکھی جا رہی تھی۔

”را“ کے ہیڈ کوارٹر سے پچاس ایجنٹوں پر مشتمل ایک ٹیم اسی مشن پر لگی تھی جن کی طرف سے ملنے والی تمام اطلاعات کی مانٹرنگ مرکزی کپیوٹر سیکشن میں ہو رہی تھی۔ پردیپ سنگھ اس ٹیم کے سربراہ کی حیثیت سے دہلی میں موجود تھا۔

کاٹھی کے تمام تعلق والوں کے ایک ایک پل کی حرکات و سکنات اور معمولات کی خبر بھی اسے مل رہی تھی۔ اس کے گھروالوں سے متعلق تو ہر ایجنٹ حلف اٹھا کر کہنے کے لئے تیار تھا کہ کاٹھی

نے لکھ دیا تھا اور ایک دھارمک ہندو گھرانہ ہونے کی وجہ سے جب سے انہوں نے اپنی "سکھائی" کی تعلیمات جانی ہے وہ سب ان کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ کاشی اگر وال کا مکان ہے تو ان کے ہندو دشو پریشد برائے کاسکری جزل تھا۔ ان کے گھر پر ہر وقت "مکھو" (متصحب ہندوؤں کا پیلے رنگ کا پرچم) لہراتا رہتا تھا۔ سورج اگر وال کے دوست دشمن سب اس بات پر متفق تھے کہ وہ مر تو سکتا ہے لیکن اپنے دھرم اور ریتی رواج کے خلاف اپنی بیٹی کی بناوت برداشت نہیں کر سکتا۔

اس میں اگر وال نے رنج دیا تھا کہ وہ اپنی بہن کو جب بھی دیکھے گا اپنے ہاتھوں قتل کر ڈالے گا۔ وہ آر۔ ایس۔ ایس کے مقامی خنڈوں کے ساتھ الگ سے اس کی تلاش میں نکلا ہوا تھا۔ اس نے خود پردےپ سنگھ سے رابطہ کر کے اپنی مدد کی پیش کی تھی۔ اس خاندان کے ایک ایک فرد کی تفتیش کے بعد "را" کو یقین ہو چلا تھا کہ کاشی اگر وال کے جرم میں یہ لوگ ہرگز شامل نہیں البتہ ایک مفرد سے پردہ ابھی تک قائم تھے کہ کاشی اگر وال شاید اپنے گھر والوں یا اپنی کسی کنبلی سے رابطہ کرنے کی کوشش ضرور کرے گی۔

اور اس روز جب پردےپ سنگھ کو اپنے موبائل پر ایک "انتہائی اہم کلو" کی اطلاع ملی تو اس نے فوراً انسپکٹر آقارام کو اپنے پاس بلا لیا جس کے ہاتھ میں ایک نیلی گرام تھا جو کاشی نے نیپال کے شہر کھنڈو سے بھیجا تھا۔

تھوڑی دیر بعد خط کی شکل میں لکھا نیلی گرام اس کی میز پر موجود تھا۔

○ ○ ○

کاشی نے دراصل یہ اطلاعی معافی نامہ اپنے والد کے ایڈریس پر پوسٹ کیا تھا۔ شاید اسے یہ امید تھی کہ اس کے باپ کے آفس کی نگرانی نہ کی جارہی ہو۔ اس نے یہ بات خط میں بھی لکھی تھی کہ وہ اسی لیے خط والد کے آفس پر روانہ کر رہی ہے۔

اس نیلی گرام لینڈ میں اس نے اپنے والدین سے درخواست کی تھی کہ وہ اسے معاف کر دیں اور بھول جائیں۔ وہ شاید اب زندگی میں کبھی انہیں دوبارہ مل سکے کیونکہ اس نے اپنا دھرم بھی تبدیل کر لیا تھا اور بھارت کو چھوڑ کر کسی اور دیش میں جا چکی تھی۔

جس دیش میں وہ گئی تھی اس کا نام کاشی نے نہیں لکھا تھا۔ لیکن وہ سب جانتے تھے کہ یہ کون سا ملک ہو سکتا ہے۔

خط اگلے لمبے درجنوں کا بیوں کی صورت میں تمام اہم شخصیات کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ "را" کے متعدد ایجنٹوں نے اگلے تین گھنٹوں میں اس بات کا کھوج بھی لگایا تھا کہ یہ نیلی گرام کھنڈو کے کس پوسٹ آفس سے بھیجا گیا ہے۔

شام تک "را" کے سات آٹھ ایجنٹ کھنڈو میں طویل سرکھائی کے بعد اپنے ہیڈ آفس کو جو رپورٹیں بھیج رہے تھے ان کا خلاصہ یہ تھا کہ کاشی نے ایک عیسائی نام کی لڑکی کے ساتھ نیپال کے جعلی پاسپورٹ کے ذریعے بڑی ملک کی انٹر لائن سے سفر کیا ہے۔ اس نے یہ نیلی گرام نیر پورٹ کے پوسٹ آفس سے اپنی پرواز کی روانگی کے پیشکل آدھ گھنٹے پہلے پوسٹ کروایا تھا اور معمول کے مطابق پرواز کی روانگی سے تقریباً چھ گھنٹے بعد یہ خط متعلقہ ایڈریس پر بھارت میں پہنچا دیا گیا تھا۔

ان معلومات کے حصول کا ذریعہ ایک ٹریول ایجنسی کا دفتر تھا جہاں "را" کے ایک ڈبل ایجنٹ کے ذریعے کاشی کی تصاویر دکھانے پر یہ اطلاع حاصل کی گئی تھی۔

اس ڈبل ایجنٹ نے جو نام بتایا تھا ایئر لائن کے مسافروں کی لسٹ سے وہ نام بھی مل گیا۔ گویا "را" کو ہر ممکن طریقے سے یہ اطلاع پہنچا دی گئی تھی کہ "چڑیا" ان کے ہاتھوں سے نکل کر اب محفوظ ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے۔

اگلے حزیہ چوبیس گھنٹے کی سرکھائی کے بعد ان کے پاس ایسی کوئی وجہ باقی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ اس نیلی گرام لینڈ کو دشمن نیپالی جنس کے "دھوکے کی چال" کہہ سکیں کیونکہ ان کے متعدد ایجنٹوں کو ایسے تمام شواہد مل گئے تھے جو اس خط کی ایک ایک سطر کو ج ثابت کرنے کے لئے کافی ہوتے۔

"ذیم اث"

پردےپ سنگھ نے جتنی جتنی پر پتختہ کے بعد اپنا سر قریب مز پر پختہ ہوئے کہا۔ اگلے روز انہوں نے بادل تو اسرا اپنے آپ کو تھے ہوئے اس سرچ آپریشن کو ختم کیا البتہ "معمول کی نگرانی" ابھی حزیہ ایک ماہ تک جاری رہی تھی کیونکہ وہ اپنے اصولوں کے مطابق احتیاطی تدابیر ضرور اختیار کرتے تھے۔

کاشی کی بیٹی کو نیلی گرام پر طاہر کے ساتھیوں نے بڑی کامیابی سے عمل کر کے "را" کو چاروں شانے چت کر دیا تھا۔

○○○

تین دن اور چار راتیں انہوں نے اسی گزاری تھیں لیکن کامیابی کے لئے یہ انکشاف
بڑا حیرت انگیز تھا کہ اس دوران ایک لمحے کے لئے بھی اس کا ذہن نہیں بٹکا!
اس نے زندگی میں مرد کا ایک ہی روپ دیکھا تھا جو بڑا بھیا تک اور تکلیف دہ تھا۔ اس
کا واسطہ زندگی میں صرف جنسیت زدہ مردوں سے رہا تھا۔ ان تین دنوں میں اس نے ساری زندگی
کا گیان حاصل کر لیا تھا۔ اسے اور اک ہو چکا تھا کہ آج سے پہلے کی زندگی اس نے کفرانِ نعمت
میں بسر کی ہے۔ قدرت کے وہ بیت کردہ اس عقیم علیہ کو اس نے کس طرح ضائع کر دیا.....
جب بھی یہ بچتا ہوا اسے ستانے لگتا فوراً ایک احساس تھا خراس پر غالب آ جاتا تھا کہ
بالا خراس نے راز حیات پائی لیا۔ اس کی تیار رنگ لے لی آئی۔ اس کی کھون مکمل ہو گئی اور اب
وہ احساس جرم کے بغیر باقی زندگی جئے گی۔

کبھی کبھی جب اس کا ماضی سوال بن کر اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا تو وہ گھبرا جاتی ان
لمحات میں ظاہر کی سچائی طرح اس کے اور ماضی کے درمیان دیوار بن جاتا۔

”کاشی ہمارے ہاں سوچنے کا یہ انداز نہیں ہے۔ اس دین مبین میں ہر بات حال اور
مستقبل کی ہوتی ہے۔ ہمارا ماضی کیا ہے..... اسے بھول جاؤ۔ کیونکہ تمہارا جہنم ہی اب ہوا ہے۔ جو
زندگی تم نے بنی..... وہ کوئی جہنم نہیں تھا کاشی..... وہ تو سزا تھی۔ زندگی کے نام پر تم نے جیل کاٹی
ہے جیل..... اب تم رہا ہو چکی ہو۔ اب تم آزاد ہو گئی ہو۔ تم جہاں جا رہی ہو وہاں کوئی تم سے تمہارا
ماضی دریافت نہیں کرے گا۔ سب تمہارے لیے دیدہ دل فرخ راہ کریں گے کیونکہ تمہاری خصوصی

اہمیت ہے..... میں نے تو جہنم ہی مسلمان گھرانے میں لیا..... لیکن تم نے ہدایت پائی
ہے۔ مگر اسی کے اندر میرے سے ہدایت کی روشنی میں آئی ہو..... اب تمہارے لئے سلاحتی ہی
سلاحتی ہے۔“

اور..... وہ مطمئن ہو جاتی۔

اب انہیں رخت ستر باندھنا تھا۔

آج وہ ڈھبوزی سے رخصت ہو رہے تھے۔ ظاہر نے اگلی منزل چٹھا کوٹ بتائی تھی.....
وہاں چل اور پنجاب کی سرحد پر واقع چٹھا کوٹ جوں کا روزانہ بھی تھا۔ ظاہر نے یہاں سے پنجاب کی
طرف قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا تھا اور اس فیصلے کو کامیابی کی مکمل ضمانتی حاصل تھی۔

چٹھا کوٹ سے ڈھبوزی کا سفر تین گھنٹے پر مشتمل تھا۔ ظاہر نے اگلی ہی رات کوٹ تک
کر دیا لے تھے اور صبح ناشتے کے بعد انہوں نے سفر کا آغاز کر دیا۔ اس کے ہاتھ کا زخم قریباً مندمل ہو
چکا تھا۔ پھیلی کے اندرونی طرف کا گھٹاؤ بھرنے کا تھا اور اب اس پر ایسی جینز تنج ہو رہی تھی جسے با
آسانی دوسروں سے ہاتھ کی ٹھٹھی بند کر کے چھپایا جاسکتا تھا۔ کاشی نے خود کو نو بیٹا بنا ظاہر کرنے میں
کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اس نے ڈھبوزی سے ایسے نقلی زیورات خریدے تھے جو بظاہر اصلی
دکھائی دیں۔ اور اپنے کتے میں ہار اور ہاتھوں میں نقلی سونے رولڈ گولڈ کی چوڑیاں پہننے کے بعد وہ
سر پر شاہدوش کی سرخ چادر اوڑھ کر مائڈن گھرانے کی نئی ٹوپی لٹکن دکھائی دے رہی تھی۔

ایک مرتبہ پھر سفر شروع ہوا۔ اس دفعہ وہ چڑھائی کے بجائے نشیب کی طرف سفر کر
رہے تھے۔ پہاڑوں کے گرد مل کھائی سڑک پر ڈرائیو کر رہیں کہیں بس کا انجن بند کر دیتا۔

سرسبز پہاڑوں کے بعد اب سنگار پہاڑی سلسلے شروع ہو گئے تھے۔ ایسے ہی چھ
سات پہاڑی سلسلے عبور کرتے ہوئے جن پہ کہیں کہیں سرسبز اور چٹیل میدان بھی دکھائی دے جاتے
تھے۔ بالآخر وہ چٹھا کوٹ بھی پہنچ گئے۔

○ ○ ○

چٹھا کوٹ وہ اس سے پہلے بھی تین چار مرتبہ آ چکا تھا اور یہ علاقہ اس کا اچھی طرح دیکھا
بھلا تھا۔ وہ رات انہوں نے ایک مقامی ہوٹل میں بسر کی۔ شام دیر گئے وہ ہوٹل پہنچے تھے جہاں
انہوں نے نئے نام سے بلک کر داخل تھی۔

سرحدی اور دفاعی لحاظ سے حساس نوعیت کے حامل اس علاقے میں ایڈوائس انٹیلی جنس یونٹوں نے خصوصی انتظامات کیے تھے۔

پنجاگوٹ پنجاب اور جموں کشمیر کا نقطہ اتصال تھا۔ دونوں طرف کے حریت پسندوں کی یہاں آمد کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں بھارت کی تمام مرکزی اور صوبائی انٹیلی جنس ایجنسیاں سرگرم عمل رہتی تھیں اور خصوصاً ایس سینڈز زونیل سے مشین وغیرہ پر تو انہوں نے کڑے اور فول پروف بندوبست کئے ہوئے تھے۔

گذشتہ دو ماہ میں یہاں تین بم دھماکے ہو چکے تھے جن میں بس سینڈز پر ہونے والا دھماکہ سب سے زیادہ خطرناک تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں کو یہاں ہر دوسرا چہرہ مشکوک دکھائی دے رہا تھا۔ دونوں اب آسانی سے نہیں پہچانے جاسکتے تھے۔ انہوں اپنی دانت میں اپنی شاشت ختم کرنے کا ہر ممکن طریقہ اختیار کر لیا تھا۔ یوں بھی عورت اور مرد جوڑی پر شاید وہ لوگ زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے۔

ظاہر ہے جان بوجھ کر رات بسر کرنے کے لیے یہاں سب سے مہنگے ہوٹل کا انتخاب کیا تھا۔ جو عموماً پنجاگوٹ سے گاڑی یا بس تبدیل کر کے اپنی اگلی منزل پر جاتے یا پھر سرکاری آفیسرز ہی قیام کیا کرتے تھے۔ دونوں یہاں ڈاکٹر نیاں بیوی کی حیثیت سے مقیم تھے۔ رات کا کھانا انہوں نے ہوٹل کے ڈاننگ ہال میں کھایا اور جلدی اندھ کر اپنے کمرے میں آگئے کیونکہ یہاں آنے والا ہر دوسرا تیسرا گاہک کوئی سرکاری آدمی ہی دکھائی دیتا تھا اور کاغذی نے خصوصاً اپنے منگے کے دو لوگوں کو قوت شاشت بھی کر لیا تھا۔

صبح جان بوجھ کر انہوں نے دیر گئے ناشتہ کیا۔ پھر وقت گزاری کے لیے مقامی سول ہسپتال چلے گئے کیونکہ دونوں نے اونچی معمول کی گھرائی کے اندیشے کو نظر انداز نہیں کیا تھا اور ڈاکٹر ہونے کے باطنے کا ہسپتال جانا ہی زیادہ مناسب تھا۔

سول ہسپتال کے مختلف خالی کمروں میں مریضوں کے لواحقین کے ساتھ انہوں نے چار بجے تک کا وقت گزاریا۔ یہی ہوٹل کا "چیک آؤٹ" ٹائم تھا۔

اب ان کی اگلی منزل گورداسپور تھی.....!

ذہن دھوکے میں ٹرین نے انہیں گورداسپور پہنچا دیا۔ رات انہوں نے یہاں ایک ہوٹل

میں گزاری اور اگلے روز دوپہر کے بعد امرتسر کی طرف عازم سفر ہوئے۔

امرتسر کے رانی بازار میں جب ظاہر اور کاغذی باجوہ راکس شاپ پر پہنچے تو ان کی نظر نوجوت سنگھ پر پڑی جو اپنے بھائی کے ساتھ دکان کے کاؤنٹر پر کھڑا تھا۔ شاید وہ یہاں کسی کام سے آیا تھا۔

جیسے ہی اس نے ظاہر اور کاغذی کو دیکھا "دیر جی..... بھائی جی" کا فخرہ لگا کر ان کی طرف پکا۔

ظاہر نے اس سے زیادہ گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے بات کا وعدہ معافہ کر لیا تھا۔

"ہم لوگ پنجاگوٹ اپنے کزن کے پاس آئے تھے۔ میں نے سوچا جب پنجاب میں آئے ہیں تو ماں جی کو لیے بغیر جانا بہت غلط بات تھی۔"

کاغذی نے نوجوت سے کہا۔

نوجوت سنگھ کا بھائی اوتار سنگھ باجوہ جیرا تھی اور استقبالیہ نظروں سے اپنے ان بے تکلف رشتہ داروں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا جن سے اس کا چھوٹا بھائی گرم جوشی سے ملا تھا۔ اوتار سنگھ سے جب اس نے ظاہر کا تعارف کروایا تو اس نے بھی غامض گرم جوشی کا مظاہرہ کیا تھا اور دونوں کو نوجوت کے ساتھ نزدیک ہی ایک مٹلے میں موجود اپنے گھر بھیج دیا تھا۔

○ ○ ○

سر داراں گھر پر نہیں تھی۔ ان کی زبانی علم کو رد و انٹاری میں ہے۔ نوجوت سنگھ اپنی ماں کے ساتھ "انٹاری" میں رہتا تھا۔ سرحدی علاقے میں موجود اس قبیلے میں ان کی زمین تھی جہاں سر داراں نے اپنے خاندانی موت کے بعد مستقل ڈیرے ڈال دیے تھے۔

اوتار سنگھ کی زبانی انہیں علم ہوا کہ گرد و انٹاری ماں کو بھی زبردستی امرتسر لے بھی آئیں تو وہ چار دن بعد ہی وہ واپس جانے کے لیے بلند ہو جاتی ہے۔ اس نے رات ان دونوں کو اپنے گھر مہمان رکھا اور ساری رات ظاہر سے ایک ہی بات کہتا رہا کہ کسی طرح وہ اس کی ماں کو امرتسر میں اس کے گھر رہائش دیکھ کر رضامند کرے۔

ظاہر نے اندازہ لگایا کہ سر داراں کے بیٹوں کو اپنی ماں سے عشق تھا۔ اس کے دو بیٹے

اوتارنگھ باجوہ اور کرتارنگھ باجوہ امرتسر میں رہتے اور اپنا بزنس کرتے تھے۔ دونوں اچھے کھاتے پیتے معلوم ہوتے تھے۔ دونوں میں سے ایک کی بیوی مستقل ان کی ماں کے ساتھ انٹاری میں رہتی تھی۔

اگلے روز نوجوت سنگھ اپنی رادتی کا پران دونوں کو اداری لیے جا رہا تھا۔ اس نے بطور خاص دونوں کو امرتسر میں "در بار صاحب" کے درشن کروائے تھے۔ دونوں نے اس کے ساتھ بڑی عقیدت سے یہاں خاصا وقت گزارا تھا اور دوپہر کا لشکر در بار صاحب میں کھانے کے بعد ہی انٹاری کے لیے روانہ ہوئے تھے۔

اوتارنگھ کی جتنی نے ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ واپسی پر ان کے ہاں دو تین دن قیام کریں گے۔ سارا خاندان خاصا سہمان اواز دکھائی دیتا تھا۔

اوتارنگھ کی بیوی پر جمیت کا بھائی نوجوت سنگھ تھا اور اس کی پوسٹنگ سہارنپور ہی میں تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ضرور ان سے ملے سہارنپور آئے گی کیونکہ کاشی نے اسے اپنا بھی ایڈریس دیا تھا۔

امرتسر میں داخلے سے پہلے ایک مرتبہ پھر طاہر کے سر پر پگڑی بچ گئی تھی۔ اب اس کی داڑھی اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ آسانی سے خود کو سکھ کہہ سکتا تھا۔

دونوں میاں بیوی نے بڑی گرم جوشی سے انہیں اپنی ماں کی طرف روانہ کیا تھا اور نوجوت سنگھ کو جدیت کی قہی کہ کارڈرا احتیاط سے چلائے۔ ان کا تیسرا بھائی کرتارنگھ چاندھر کی کام سے گیا ہوا تھا اور اس کی واپسی میں ابھی دو روز باقی تھے۔

نوجوت سنگھ نے انہیں قریباً ایک گھنٹے بعد انٹاری سے ملحقہ ایک گاؤں میں پہنچا دیا جہاں ایک کوٹے میں ان کی حویلی بنی ہوئی تھی جس کے باہر سنگ مرمر کی تختی پر اس کے باپ سورگاشی سردار کا بن سنگھ باجوہ کا نام کندہ تھا۔

حویلی کا دروازہ ہارن کی آواز پر ان کے ایک حذرار نے کھولا تھا۔ سامنے برآمدے میں ایک چار پائی پر اس کی ماں اور بھائی شاید بڑی کاٹ رہی تھیں۔ نوجوت سنگھ کے ساتھ کار میں گاڑی سے نکل کر باہر آئے اور سرداراں کی نظر ان دونوں پر پڑی تو وہ دونوں بازو پھیلائے ان کی طرف بیڑی اور باری باری دونوں کو گلے لگا کر آ شیر بادیا۔

کاشی نے اسے بھی وہی کہانی سنا دی جو اس کے بیٹے کو امرتسر میں سنا کر آئی تھی کہ کس طرح حادثاتی طور پر وہ گورداسپور میں آئے اور پھر اس کی خمد پر ہی طاہر نے یہاں تک کا پر وگرام بنایا۔

"ماتا جی میری زندگی کی تو بہت بڑی خواہش تھی کہ پنجاب کے کسی سرمدی دیہات میں زندگی کے کچھ مل گزاردوں..... شکر ہے بھگوان کا جس نے ہلا خریہ موقعہ دے دیا۔" کاشی نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنی سروس کا آغاز بھارت کے اس سرمدی قصبے سے کیا تھا اور یہاں تین چار سال میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ طاہر کے لیے بھی یہ علاقہ دیکھا بھلا تھا لیکن اتنا بڑا بھی نہیں۔ اس نے یہاں پہنچنے تک نوجوت سنگھ سے اس علاقے کے متعلق ناموس انداز میں اچھی خاصی معلومات حاصل کر لی تھیں۔

کاشی نے اسے بتایا تھا کہ سرمد پر پاڑ لگانے کا کام گزشتہ سال ہی شروع ہوا ہے کیونکہ پنجاب کی سرمد پر خالصتاً نئی حریت پسندوں کی نقل و حرکت اب بھارتی بارڈر کیپڑ رٹی کے قابو سے باہر ہو رہی تھی اور علیحدگی پسندوں کی جدوجہد میں خاصی تیزی بھی آ گئی تھی۔

یہ امر دونوں کے لیے باعث ضمانت تھا کہ ابھی سرمدی علاقے کی وہ پاڑ جو بھارتی حکومت نے کانٹے دار تاروں کی صورت میں جموں سے راجستھان تک لگانے کا فیصلہ کیا ہے یہاں تک نہیں پہنچی ہیں اگلے آٹھ دس روز کے بعد اس علاقے کی باری بھی آنے والی تھی۔ کیونکہ یہاں سے قریباً دس بارہ کلومیٹر دور تک سرمد پر خاردار تاروں کا جال بچھایا جا چکا تھا۔ طاہر نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ تو پنجاب کی سرمد بالکل ہی سبیل ہو چکی تھی۔ بارہ فٹ بلند خاردار تاروں کے دوہرے نظام میں بھارتی بارڈر کیپڑ رٹی فورس شام کے بعد بجلی دوڑا دیتی تھی اور ان خاردار تاروں میں مطلوبہ فرقے کے بعد نصب کئے گئے سرچ لائٹ ٹاورز پر جب روشنائی ہوتی تو دوسری طرف تین چار کلومیٹر تک کا علاقہ روشن دکھائی دیتا جس میں ہونے والی کوئی بھی نقل و حرکت لگہ بول سے محفوظ نہیں رہ سکتی تھی۔

○ ○ ○

نوجوت سنگھ کے ساتھ ان کے گھر کے اونچے چوہارے پر بیٹھے طاہر نے بڑے حساب

کتاب سے ساری معلومات حاصل کر لی تھیں۔

نوجوت سنگھ نے اسے بتا دیا تھا کہ یہاں سے کس طرف بی ایس ایف والوں کی پوسٹ بنی ہوئی ہے۔ سرحد کس طرف ہے اور یہ بھی کہ آئے روز یہاں بی ایس ایف کا چھاپہ پڑتا رہتا تھا۔ وہ لوگ ہر دوسرے تیسرے روز یہاں کے کسی نہ کسی گھر سے کسی نوجوان کو خالصستانی حریت پسند یا اس کا کوئی ساتھی ہونے کے الزام میں گرفتار کر کے لے جاتے تھے۔ کاشی بھٹاہران کی گفتگو سے بے نیاز اس کی بھابی سے محبت کی جھنجھٹیں بوجھ رہی تھیں لیکن اس کے کان ان کی طرف ہی لگے ہوئے تھے۔

وہ اپنی یادداشت تازہ کر رہی تھی اور جیسے جیسے نوجوت سنگھ ظاہر ہو رہا تھا اس کے ذہن میں ماضی کے حوالے سے اس علاقے کے گفتگوں واضح ہو رہے تھے۔

شام ڈھلنے کے بعد جب نوجوت سنگھ کسی کام سے بازار گیا ہوا تھا اور کاشی اس کی بھابی شندر کور کے ساتھ باقیں کر رہی تھی تو دوسرے کمرے میں موجود طاہر کی زبان پر نجانے وہ سوال کیوں آ گیا تھا جو اس نے کسی مصلحت کے تحت ابھی تک نہیں پوچھا تھا۔

”ماں جی آپ نے اس روز مسلمانوں جیسی کچھ آیتیں پڑھ کر کاشی پر دم کیا تھا۔ آپ کو وہ کس نے سکھائی تھیں؟“

سرواراں پہلے اس کی طرف بغور دیکھتی رہی پھر ایک زہر خندہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی اور اچانک طاہر کو اس کی آنکھوں میں نمی کا احساس ہوا۔

”ہاں بیٹا۔ مجھے علم تھا کہ یہ سوال ضرور کرو گے۔“

اس نے بطور خاص لفظ ”تم“ پر کچھ زور دیا تو طاہر چونکا۔

”میں..... ماں جی میں تو.....“

طاہر نے کچھ کہنا چاہا لیکن سرواراں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”میری بات دھیان سے سنتا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم وہی ہو جو میں سمجھ رہی ہوں اور آج تک میرے دل نے مجھے کبھی گمراہ نہیں کیا۔ بیٹا میرا جہم ایک مسلمان گھرانے میں ہوا تھا۔ کاہن سنگھ اور میرے والد بچپن کے دوست تھے۔ دونوں کا پارا نہ مثالی تھا۔ ہم لدھیانہ کے رہنے والے ہیں۔ جب ملک تقسیم ہوا تو میری عمر شاید پانچ بارہ سال تھی۔ کاہن سنگھ کا باپ فوج میں

صوبیدار تھا۔ ان دنوں وہ اپنی ڈیوٹی پر تھا جب ہمارے گاؤں پر حملہ ہوا۔ بلوائیوں نے درجنوں لوگوں کو مار ڈالا۔ عورتوں کو اغوا کر لیا گیا۔ ان اغوا ہونے والوں میں ابھی شامل تھی۔ کسی نہ کسی طرح میں ان خالوں کے پھگل سے نکل گئی اور کاہن سنگھ کے گھر چھپنے میں کامیاب ہو گئی۔ جو میرے دوسرے گاؤں میں رہتا تھا۔ کاہن سنگھ کی ماں نے مجھے اپنے پاس چھپا لیا اور میرے گھر والوں کی تلاش میں نکل گئی..... بلوائیوں نے میرا سارا خاندان جس میں میری ماں ایک بہن اور دو بھائی تھے مار ڈالا کاہن سنگھ کا باپ گھر واپس آیا تو بہت پریشان ہوا۔ اس نے میرے والد کو ڈھونڈنے کے لیے زمین آسمان ایک کر دیا۔ لیکن میرا باپ نہیں ملا۔ شاید وہ بھی راستے میں بلوائیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ میرے نضیال جاندھر کے رہنے والے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد کاہن سنگھ کے باپ نے ان کی تلاش میں دوسرے پاکستان کی خاک چھائی۔ جب تک وہ زندہ رہا انہیں ڈھونڈتا رہا۔ مجھے اس کی موت کے بعد علم ہوا کہ وہ پاکستان میرے ایک ماموں کے پاس پھنچ گیا تھا جس نے اسے پہچانے یا مجھے واپس لینے سے انکار کر دیا۔ اس عظیم شخص نے مجھے یہ بات کہی نہیں بتائی۔ دن مینوں اور مینے سالوں میں تبدیل ہوتے گئے لیکن مجھے کوئی لینے نہ آیا۔ پتا خر کاہن سنگھ کا باپ ایک روز مر گیا لیکن اس نے اپنے بیٹے سے کہا تھا کہ اس کی روح کو بہت شانتی ملے گی اگر وہ مرتے دم تک میری حفاظت کرے۔ کاہن سنگھ نے مجھ پر شادی کے لئے دباؤ نہیں ڈالا جب کہ سارا گاؤں ان کے خون کا بیاسا رہا۔ بادل خواست میری جان بچانے کے لیے اس نے مجھ سے شادی کر لی کیونکہ یہی ایک صورت میرے زندہ رہنے کی باقی رہ گئی تھی۔ تین سال ہوئے کہ کاہن سنگھ کوفت ہوئے اس نے پندرہ بیس سال پہلے اپنے باپ کو فوجی نوکری سے ملی اس زمین کے ساتھ کچھ اور زمین خرید کر یہاں بھیقی پاڑی شروع کر دی۔ اللہ نے کرم کیا اور حالات اچھے ہو گئے..... میری جان بچانے کے لیے اسے لدھیانہ سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہونا پڑا۔ تین بچے ہوئے۔ یہ بیٹوں میری اصلیت جانتے ہیں۔ ان کے دل میں اپنے نضیال کو دیکھنے کی ترپ زندہ ہے لیکن جب میں ہی بدقسمت رہی تو انہیں کون ملے گا۔ ہر سال جب یہاں سے جھٹہ جاتا ہے تو یہ لوگ انہیں میرے رشید داروں کے نام بتا کر بھیجتے ہیں لیکن کوئی نہیں ملتا۔“

یہ کہہ کر اس کا قاعدہ رونا شروع کر دیا۔

اس صورت حال نے طاہر کو بھی جذبہ بانی کر دیا تھا۔

سرداراں بہت حوصلہ والی عورت تھی۔ بلاخر اس نے خود کو مائل کر لیا۔

لیکن..... اچانک ہی وہ طاہر کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے مکان کی چھت پر لے گئی اور سامنے کی سمت اشارہ کر کے کہنے لگی۔

”بیٹا ساری زندگی میں اس امید کے ساتھ مریاؤں گی..... یہ حسرت میرے ساتھ قبر میں جائے گی کہ میں سرحد کے اس طرف نہ جا سکی۔ تقدیر کے آگے کس کا زور چلتا ہے۔ میں بے بس تھی بیٹا..... تقدیر کے آگے میں..... بے بس ہوں، لیکن تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہو گا۔“

اس نے اچانک ہی بڑے ڈرامائی انداز میں کہا اور طاہر کا دل دھک سے رہ گیا۔

”آپ کا کیا مطلب ہے ماں جی.....؟“

اس نے بظاہر انہماں بیٹے ہوئے کہا۔

”دیکھو بیٹا..... اتم جو کوئی بھی ہو وہ ہرگز نہیں جو بننے کی کوشش کر رہے ہو..... میں نے پوٹا صاحب جی میں تمہاری اصلیت جان لی تھی۔ میں تم سے کوئی سوال نہیں کرتی، لیکن تمہیں کچھ باتیں بتا رہی ہوں۔ لیکن ہو تو میرا یہ پیغام ادھر پہنچا دینا۔ بیٹا یہاں ہزاروں بد قسمت مسلمان عورتیں غیر مسلموں کو ختم دے رہی ہیں۔ ان بد بختوں کو گردش حالات نے یہ دن ضرور دکھائے تھے لیکن اس کی ذمہ داری سے اس طرف کے لوگ بری الذمہ نہیں ہو سکتے..... یہ عورتیں ان کے بچے جو بظاہر غیر مسلم ہیں آج بھی کسی مسیحا کے منتظر ہیں۔ جو آئے اور انہیں ان کی اصلیت کی طرف واپس لے جائے۔ لیکن دکھ کی بات تو یہ ہے کہ جنہیں یہ فرض ادا کرنا تھا وہ خود ایک دوسرے کا گھڑکٹ رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ جب ادھر سے مسلمانوں کے آگے آپس میں کٹنے مرنے کی خبریں آتی ہیں تو یہاں ہم بے نواؤں کے کیلیے کٹنے لگتے ہیں۔ یہ ایک سرداراں کا نہیں، مجھ جیسی ہزاروں مسلمان عورتوں کا دکھ ہے۔ جنہیں اینٹوں نے دندلوں کے آگے شکار کے لیے چھوڑ دیا۔ قدرت کا اپنا عمل تو جاری ہے..... جو آپ ایسی مسلمان ماؤں سے جنم لیتے ہیں جنہیں زبردستی غیر مسلم بنایا گیا۔ ان کے دلوں میں کبھی شمع ایمان فروزاں ہو جاتی ہے۔ ایک روز ایسا ضرور آئے گا جب یہ روشنی ظلمت کے اندھیروں میں اپنا راستہ بنا لے گی۔ کاش! کوئی میرے اس پیغام کو سمجھ لے۔ کاش کوئی جان لے۔“

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

طاہر کے رگ و پے میں جیسے آگ سی سرایت کر گئی تھی۔

وہ سرداراں کا دکھ کچھ رہا تھا.....!

لیکن..... بے بس تھا..... کچھ کر نہیں سکتا تھا۔

”ماں جی..... آپ نے مجھے شناخت کیا ہے۔ میں آپ سے کوئی وعدہ تو نہیں کرتا

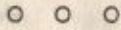
لیکن ایک بات ضرور کہوں گا کہ مسلمان کا خون ہمیشہ سفید نہیں رہتا۔ ہم نہیں تو ہمارے بعد کی نسل اپنی ان ہزاروں ماؤں کا قریس ضرور چکائے گی جو آپ جیسے حالات کا شکار ہو گئی ہیں..... ایک روز ایسا آئے گا جب ان کی غیرت ایمانی جاگے گی..... ضرور جاگے گی۔“

اس نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔

”ہاں بیٹا..... اسی ایک امید پر میں بھی زندہ ہوں۔ اور یہی امید اپنی اولاد کو دے کر

مروں گی۔“

سرداراں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔



ابھی تک اس نے طاہر سے اس کا تعارف نہیں پوچھا تھا لیکن اس کے خزانہ جان لیے تھے اور وہ اس کی مدد پر کمر بستہ بھی تھی۔

”بیٹا! یہ پوہ کی طوقانی راتیں ہیں..... میرا وجدان کہتا ہے کہ آج جس طرح باطل چھائے ہوئے ہیں کل زیادہ شدت سے بارش ہوگی۔ میں نو جوت اور شندر کو روک لیں تو پھر کسی کام سے امر تسر بھیج دوں گی۔ تم کل رات نکل جانا..... میں تمہارے ساتھ ہوں۔ آخری دم تک تمہارا ساتھ دوں گی۔ بیٹا! نو جوت اور شندر کو روکی اور بات ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ انہیں اصلیت کا علم ہو۔ میں انہیں کہہ دوں گی کہ تم شام کو اچانک چلے گئے تھے..... یہاں تمہارا زیادہ قیام شاید تمہارے لئے بہتر نہ ہو کیونکہ آئے روز یہاں پولیس اور پارڈر سیکورٹی والے چھاپے مارتے رہتے ہیں۔ کاہن نگہ سابق فوجی تھا۔ ہمارا اس علاقے میں خامسی سمان (عزت) کی جاتی ہے کسی کی جرات نہیں کہ اس طرف میلی آکھ سے بھی دیکھ لیجئے پھر بھی کسی کوئی خطرہ مول نہیں لوں گی..... تم سے زیادہ مجھے تمہاری بیوی کی فکر لگی ہے۔“

اس نے بڑے حوصلے اور تہرکا مظاہرہ کیا۔

”ماں جی..... آپ کا بے حد شکر یہ۔ معلوم نہیں کہ زندگی میں کبھی دوبارہ ہم مل پائیں لیکن آپ کا یہ احسان میری قوم کبھی نہیں بھلا پائے گی۔“
ظاہر نہ کیا۔

دونوں بچے آگے جہاں شہنشاہ کو ران کے لیے رات کا کھانا تیار کر رہی تھی۔ کاٹنی اس کی گھری سیکلی بن چکی تھی۔ اور دونوں ایک دوسرے کا رسوئی (بادریجی خاند) میں ہاتھ بٹا رہی تھیں۔

رات دونوں نے ایک ہی کمرے میں بسر کی۔ ظاہر نے اسے سرداراں سے ہونے والی گفتگو نہیں بتائی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ کاٹنی یہ بات سنتے ہی اپنی اٹلی جنس تربیت کے مطابق اسے فوراً یہاں سے کھسک جانے کا مشورہ دے گی۔ اس کی تربیت یہی تھی۔ لیکن..... حالات نے اسے سکھادیا تھا کہ زندگی میں بعض اصول اور ضابطے وقت آنے پر سختی سے نہیں ہوتے۔
”کل رات قسمت آزمائی کریں گے۔“

اس نے کاٹنی سے کہا۔

”ڈن.....!“

کاٹنی اس نے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

صبح سب نے اکٹھے ناشتہ کیا۔ نوجوت سنگھ کالج چلا گیا۔ جب واپس آیا تو سرداراں نے اسے دونوں کو اپنی زمین کی سرکروانے کے لیے کہا۔

”ماں جی! بارش سے رات خراب ہے..... اچھا میں سردن سنگھ سے کہتا ہوں وہ ٹریکٹر پر آپ کو لے جائے گا۔“
نوجوت سنگھ نے کہا۔

”ٹریک ہے تم شہنشاہ کو امرتسر لے جاؤ۔ آج چھٹی وار (ہفتہ) ہے اور کل اس نے دربار صاحب بھی جانا ہے۔ کتنا سنگھ آیا تو اسے بھیج دینا۔ ابھی یہ دونوں یہاں دو تین دن رہیں گے۔ انہیں کہاں بھرا دینا؟ حامل دیکھنے کو ملے گا۔“
سرداراں نے نوجوت سنگھ سے کہا۔

”چنگاں جی.....!“

نوجوت سنگھ جیسے افرامیہ دار پچا انہوں نے کب دیکھا تھا۔

آسمان بادلوں سے سیاہ ہو رہا تھا۔ جب وہ شہنشاہ کو رکے ساتھ ماروتی کار میں امرتسر جانے لگا۔ شہنشاہ نے کاٹنی سے گنگے لگ کر جلد واپس آنے کا وعدہ کیا تھا۔

○ ○ ○

دونوں کی رواجی کے بمشکل پندرہ بیس منٹ بعد سرداراں نے ظاہر کو تیاری کا سگٹل دے دیا تھا۔ جس نے بڑی پھرتی سے ایک بیک ٹریکٹر کی اس سیٹ کے نیچے چھپا دیا جو اضافی طور پر بنائی گئی تھی۔ جس کے بعد سرداراں نے سردن سنگھ ناٹی اپنے کسی ملازم کو آواز دی۔
”ان دونوں کو اپنی زمینوں پر لے چل۔ وہاں انہیں حویلی پر چھوڑ آنا۔ شام کو بکا سنگھ ان کے لیے لنگر لے جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی واپس آ جائیں گے۔ ان شہر کے لوگوں کے بھی کیا شوق ہوتے ہیں۔“

اس نے لا پراہی سے اپنے ملازم سے کہا۔

”اچھا ماں جی.....!“

سردن سنگھ نے ٹریکٹر شارٹ کروا دیا۔

سرداراں نے دونوں کو باری باری گنگے لگا کر ان کے منہ دیوانہ وار چوسے تو کاٹنی کا ہاتھ اٹھا نکلا۔ اسے دال میں کالا دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن وہ صلیخا خاموش رہی۔

شدید سردی نے سارے گاؤں پر سکوت طاری کر رکھا تھا۔ دونوں سڑسٹ کر ڈرائیور کے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گئے اور پندرہ بیس منٹ میں بخیر و عافیت سرحد سے بمشکل دوڑ حائی کو میٹر دور کا ہن سنگھ کی زمینوں پر پہنچ گئے۔

”ٹریک ہے۔ شام کو جلدی آ جانا۔ موسم اچھا نہیں لگتا۔“

ظاہر نے وہاں گنگے ٹیوب ویل پر اپنے ایک کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ جس میں دو چار پائیاں کرسیاں اور فرش پر پٹائی چھپی تھی۔ دو تین کسل ایک کونے میں دھرے تھے۔ اس نے اپنی سیٹ کے نیچے سے ایک اتنی ہوشیاری سے نکالا تھا کہ سردن سنگھ کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ یوں بھی وہ ہفتی ساد دکھائی دے رہا تھا اور شاید یہ اس کے اٹیون کھانے کا وقت تھا۔

دونوں کو "فتح" بلا کر وہ چلا گیا اور دونوں کمرے میں بھی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ اسے سرداراں نے یہاں سے سرحد کا سارا نقش اس پوسٹ سمیت سمجھا دیا تھا۔ جو راستے میں آتی تھی۔

"کیا پتھر ہے پارنٹر.....؟"

سردن سمجھ کے جاتے ہی کاٹھی نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے دریافت

کیا۔

"کاٹھی..... تمہارے دم قدم کی برکت ہے۔ اللہ نے ہمیں سرداراں کے روپ میں

رحمت کا فرشتہ ملا دیا ہے۔"

اور اس نے کاٹھی کو ساری کہانی سنائی۔

"واہ..... کتنا عظیم رشتہ ہے۔ کتنا مضبوط رابطہ ہے۔"

بے ساختہ کاٹھی کی زبان سے نکلا۔

دونوں اب سرحد پار کرنے کی حکمت عملی طے کر رہے تھے۔ حیرت انگیز طور پر طاہر پر

انکشاف ہوا کہ اس مسئلے پر کاٹھی اس پر برتری رکھتی ہے۔ دراصل وہ انسٹرکٹر تھی اور سرحد عبور

کروانے میں اس نے خصوصی کورس کیا ہوا تھا۔ وہ اپنے شاگردوں کو اس کورس کی خصوصی مشق

کروایا کرتی تھی۔

○ ○ ○

سردن کو گھرے ابھی بمشکل آدھا گھنٹہ گزارا تھا جب اچانک موسلا دھار بارش ہونے لگی۔

اچانک تیز ہواؤں کی جھکڑ چلنے لگی۔ آسمانی بجلی کے کوند نے ہادلوں کے ٹکرانے کی گڑگڑاہٹ، بجلی

کے خوفناک دھماکے اور جھکڑوں کی چیچ چٹکتاؤں نے دوپہر کو گہری رات کا لبادہ پہنا دیا۔

یوں لگتا تھا جیسے اچانک سورج نے اپنا رخ تبدیل کر لیا ہو۔

"پارنٹر..... کم آن..... مود۔ "Come on Move"

کاٹھی نے اچانک ہی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ابھی.....؟"

طاہر نے جراگتی سے پوچھا۔

"Yes Now..... کم آن"

کاٹھی اس وقت بالکل ایک سخت گیر انسٹرکٹر لگ رہی تھی۔

"او۔ کے.....؟"

طاہر نے بیک اپنی کمرے کے گرد کس کر باندھ لیا..... وہ تو خالی ہاتھ آنا چاہتا تھا لیکن

نجانے کیوں کاٹھی اس بیک کو پھینچ کر نہیں چاہتی تھی۔

کاٹھی نے ہتھول پوزیشن کر لیا تھا اور اس کے آگے آگے چل رہی تھی۔ کمرے سے

نکلنے ہی تیز بارش میں لپٹے ہوا کے برقیے طوفان نے ان کا استقبال کیا۔

دونوں کو اپنی رگوں میں خون ٹھمد ہونے کا احساس ہوا لیکن کیا حال جو دونوں ایک لمحے

کے لیے بھی کمر در پڑے ہوں۔

سرداراں کے بتائے ہوئے راستے پر وہ اسی طوفانی رفتار سے چل رہے تھے.....

بارش ان کے کپڑوں کے راستے جسم کے مساموں میں در آتی تھی، لیکن دونوں بڑی

مضبوطی اچھکی اور عزم سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔

ڈرامائی آہٹ پر کاٹھی پوزیشن میں آ جاتی اور طاہر اس کی تقلید کرتا۔ آدھے کھٹے کے

بعد انہیں وہ ٹپنی کا بند کھائی دیا جو دونوں ممالک کے درمیان سرحد کی آخری نشانی تھی.....

شاید سپر سہیر کے اسی عالم میں جب شدید بارش اور طوفانی جھکڑوں نے جانوروں کو بھی

اپنے ٹھکانوں میں سٹ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ لی ایس ایف کو ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ کوئی سر بھرا

اس عالم میں سرحد عبور کرنے کی دہانگی کرے گا۔

اور..... ان کی سبکی بے خبری دونوں کے لیے علیحدہ خداوندی طاہر ہوئی۔

اگلے چندرہ منٹ بعد وہ اپنی پوسٹ پر پہنچ چکے تھے جہاں رہنجنر کے تیار برتیا رجوان

ان کا استقبال کر رہے تھے۔

شام ڈھلنے سے پہلے دونوں اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے تھے۔ جہاں وہ اپنے افسران کو اپنی

اور ان کی زندگی کا بہترین سربراہ دے رہا تھا۔

کاٹھی نے یہاں موجود ہر نگاہ میں اپنے لیے بے پناہ عقیدت و احترام پایا تھا۔ یہ لوگ

اسے واقعی اپنے لوگ دکھائی دے رہے تھے.....

اصل میں یہی اس کے اپنے تھے.....

یہاں اس کے لیے اجنبیت نہیں اپنائیت تھی۔ عزت تھی اور وہ سب کچھ تھا جو کسی بھی مشرقی عورت کا اعزاز ہوتا ہے۔

جب وہ اپنے گھر داخل ہوا تو نفرد انیساطے کے جذبات سے مریم کو اپنا سراپا ہوا میں اڑنے کا احساس ہوا۔

اس کے گھر کا ہر فرد اسے گھٹے لگا کر چوم رہا تھا۔ یہاں اس کے لیے وہ سب کچھ تھا جس کے خواب وہ بچپن سے دیکھتی آئی تھی۔ یہیں طاہر پر انکشاف ہوا کہ کاٹنی (مریم) نے ایک بیک زبردستی اپنے پاس کیوں رکھا تھا۔

اس بیک میں لہجہ ڈی سے خرید کر وہ دو شالیں تھیں جو وہ اپنی ہونے والی ساس اور دوبرائی کے لیے اپنی جان پر پھیل کر لائی تھی۔

○ ○ ○

دس سال بعد.....

لندن کے "گٹ دک" ہوٹلی اڈے پر برٹش ایئرویز کی پرواز نے جیسے ہی زمین کو چھوا مریم نے فوراً اپنی سیٹ بیلٹ کھول دی۔

"Not Yet" ما۔

اس کے اور طاہر کے درمیان بیٹھے ان کے پانچ سالہ بیٹے ٹیپو نے کہا۔

"چپ..... ہر وقت ماں کو نہ سمجھا تا رہا کر....."

اس نے پیار سے اپنے بیٹے کا کال تھپتھاہے ہوئے کہا۔

طاہر جانتا تھا کہ گزشتہ دس سال سے وہ اس لمبے کاٹنی شدت سے انتظار کرتی آئی تھی۔ اس کا تو بس نہیں چلتا تھا کہ اڈا کر لندن پہنچ جائے جہاں گزشتہ ڈیڑھ سال سے ڈاکٹر شیلہ اور اس کا خاوند پریکٹس کر رہے تھے اور مستقل آباد ہو چکے تھے۔

جہاز کی سیریزوں سے ایئر پورٹ لاؤنج تک پہنچنے کے تمام مراحل مریم نے جس بیقراری سے طے کیے تھے اس نے طاہر خان کو قدرے بے چین کر رکھا۔

لاؤنج میں جیسے ہی اس کی نظر شیلہ پر پڑی اپنے ہاتھ میں پکڑی ٹرائی جھوڑ کر وہ دیوانہ وار اس کی طرف لپکی۔

شیلہ کی ہانسی پہلے سے پھیلی تھیں دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر آنسو بہاتی رہیں ہلا خریلا نے اسے آہستگی سے الگ کیا اور اپنی ہانگی ہوئی آنکھوں سے اس کے بیٹے ٹیپو کو گود میں اٹھا کر اس کا منہ چومنے لگی۔

مریم نے بھی اس کی بیٹی بار تھا کو اٹھا لیا تھا.....

ڈاکٹر جیکب اور طاہر ایک دوسرے سے گرم جوشی سے بغل گیر ہو گئے تھے اور تھوڑی دیر بعد وہ سب ڈاکٹر شیلہ کی گاڑی میں اس کے گھر کی طرف اڑے جا رہے تھے۔ ٹیپو کو شیلہ نے ڈیڑھ دو گھنٹے لیے سفر میں اپنی گود میں ہی اٹائے رکھا اور وہ اس کی گود میں ہی سو گیا تھا.....

دونوں سیٹیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیں۔ گزشتہ ڈیڑھ سال میں کوئی ایسا ایک اینڈ نہیں تھا جس پر شیلہ اور اس کے درمیان ٹیلی فون پر گھنٹوں باتیں نہ ہوئی ہوں۔ دونوں نے اپنے ایک ایک لمحے کا احوال ایک دوسرے کو فون پر ہی سنا دیا تھا لیکن دونوں محسوس کر رہی تھیں کہ ابھی ایک دوسرے کو کچھ سننے کے لیے ان کے پاس صدیوں جتنی باتیں موجود ہیں۔

گاڑی چلاتے ہوئے ڈاکٹر جیکب کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھے طاہر نے دونوں کے چہرے پر بادی بادی نظر ڈالی اور طمانیت کا لباساں بھر کر اپنی ہانگیں سامنے کی طرف پھیلا دیں۔ دس سال سے انہوں نے ڈاکٹر شیلہ سے رابطہ نہیں توڑا تھا۔ گزشتہ ڈیڑھ سال سے شیلہ اور جیکب مستقل لندن آن ہے تھے۔ جب سے اب تک طاہر کی ایک ہی کوشش تھی کہ جتنی جلدی ممکن ہو وہ مریم کو شیلہ تک پہنچا دے۔

اور..... آج بہت سے ناممکنات کی طرح اس نے مریم کو یہ کچھ بھی ممکن کر دکھایا تھا۔

☆☆☆.....

جناب لاہوری و جلد ساز
0333
2116358
ابرو پلازہ ڈھاب پکوال